بیرونی ممالک کے

شاہکار افسانے



مرتب

ڈاکٹر مجیب شہزر

مترجم

رفیق شاہین



رفیق شاہین دو بار سرینگر کشمیر تشریف لائے اور مجھے ان کی مہمان نوازی کا شرف حاصل رہا۔ میں انہیں بہت قریب سے جانتی ہوں وہ سرتاپا خلوص اور تہذیب و شرافت کا مجسمہ ہیں جس پر مہربان اسے بنانے میں اپنی ہستی تباہ کر لیتے ہیں۔ ادب میں آج جو بھی میری تھوڑی بہت شناخت اُنہی کے تعاون اور فیضان کا شاخسانہ ہے۔

جس طرح ان کی شاعری کی دلکشی اور رعنائی و رنگارنگی میرا دل موہ لیتی ہے اُسی طرح ان کی تنقیدی نثر کی شگفتگی تسلسل اور روانی کی بھی دل سے قائل ہوں۔ میں نے بیرونی ممالک کی شہرہ آفاق کہانیوں کے ان کے بہت سے ترجمے بھی پڑھے ہیں اول تو وہ کہانیاں ہی ایسی خاص الخاص منتخب فرماتے ہیں جو ہوش وحواس پر چھا کر رہ جاتی ہیں سونے پر سہاگہ یہ کہ ان کے ترجمے کی زبان کی چاشنی، روانی اور خوش بیانی ایسی سحر انگیز ہے کہ قاری ان میں کھو کر رہ جاتا ہے اور ان کا ہر ترجمہ طبعزاد کہانی کا لطف عطا کرتا ہے۔

بیرونی ممالک کے شاہکار افسانے وہ بیش بہا سوغات ہے جو قارئین کو گھر بیٹھے روس، یورپ اور امریکہ کی سیر و سیاحت کا لطف عطا کرے گی

سیدہ نسرین نقاش

سرینگر (کشمیر)

عزیز دوست جناب سلیم سالک صاحب
"مدیر شیرازہ"
کے لیے
ہدیۂ خلوص

[illegible]
16 دسمبر 2014ء

بیرونی ممالک

کے

شاھکار افسانے

مترجم

رفیق شاہین

کتاب کا نام	:	بیرونی ممالک کے شاہکار افسانے
ترجمہ نگار	:	رفیق شاہین
زیرِ اہتمام	:	حرف زار لٹریری سوسائٹی
ترتیب	:	ڈاکٹر مجیب شہزر
تزئین	:	سالم شجاع انصاری
سن اشاعت	:	دسمبر ۲۰۱۴ء
تعداد	:	۴۰۰
صفحات	:	۲۷۲ سے زائد
قیمت	:	۳۵۰ روپے
کمپوزنگ	:	مشکوٰۃ کمپیوٹرس، (رفیق کامپلیکس، نزد سلیمان ہال، انوپ شہر روڈ، علی گڑھ)

ISBN : 978-93-84354-12-1

ملنے کے پتے :

(۱) رفیق شاہین، تعلیم منزل، میرس روڈ، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲

(۲) ڈاکٹر فراز حامدی۔ ادبی دنیا پبلیکیشنز، ۱۲۳-۳ جے پی کالونی، سیکٹر نمبرا ، امانی شاہ روڈ، شاستری نگر جے پور، ۳۰۲۰۱۶۔ (راج)

(۲) ابن اسماعیل مدیر بزم ادب (سہہ ماہی) شان اللہ بلڈنگ، عمر آئس لینڈ چن خان برج، سوپور۔۱۹۳۲۰۱ (کشمیر)

انتساب

۱۔	نقشبند قمر نقوی بخاری	(مدیر ماہانہ روشنی (امریکہ)
۲۔	ساحر شیوی	(مدیر ماہانہ پرواز، لندن)
۳۔	ابن اسماعیل	(مدیر سہ ماہی بزم ادب، کشمیر)
۴۔	ڈاکٹر فراز حامدی	(مدیر سہ ماہی اُردو دوہا، جے پور)
۵۔	ڈاکٹر نذیر فتحپوری	(مدیر سہ ماہی اسباق، پونہ)
۶۔	احمد عثمانی	(مدیر ماہنامہ بیباک مالیگاؤں)
۷۔	محمد امین الدین	(مدیر دو ماہی قرطاس ناگپور)
۸۔	سعید رحمانی	(مدیر ادبی محاذ کٹک، اڑیسہ)

کے نام

جن کی سرپرستانہ ومخلصانہ اور والہانہ کرم فرمائیوں کا قرض اُتارنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی اور نہ کوئی راہ سُجھائی دیتی ہے۔

چلتے چلتے

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ابن اسماعیل مدیر سہ ماہی بزم ادب ۱۶ر جولائی ۲۰۱۴ء کو داغ معارقت دے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۶ر جولائی کو مرحوم بذریعے ٹیکسی سوپور سے سرینگر جا رہے تھے کہ ایک ملٹری کی گاڑی نے ان کی ٹیکسی کو روند ڈالا۔ جس سے ابن اسماعیل مع چھ سواریوں کے شہید کی طرح جاں بحق ہوگئے۔ مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست کی جاتی ہے۔ (ر ش)

معنون

۱۔ پیرومرشد حضرت مولوی غلام محمد خلیفہ اول بسلسلہ نقشبندیہ مجددیہ
۲۔ رئیس الدین رئیس (علی گڑھ)
۳۔ ڈاکٹر مجیب شہزر (علی گڑھ)
۴۔ اقبال سلیم (بنگلور)
۵۔ محمد حسنین (بہرائچ)
۶۔ صابرادیب (بھوپال)
۷۔ محبّ الرحمان وفا (مہاراشٹرہ)
۸۔ پروفیسر حمید اللہ خاں (پربھنی مہاراشٹر)
۹۔ وحشی سعید (سری نگر کشمیر)
۱۱۔ سیدہ نسرین نقاش (سرینگر کشمیر)
۱۲۔ ریحانہ شاہین (علی گڑھ)
۱۳۔ سالم شجاع انصاری (فیروز آباد)
۱۴۔ حنیف سید (آگرہ)
۱۵۔ محمد قیوم میو (آگرہ)

فہرستِ مضامین

افسانہ نگاروں کے نام اور افسانوں کے عنوانات کی فہرست

....



پیش لفظ

رفیق شاہین اور بیرونی ممالک کے شاہکار افسانے

ڈاکٹر بلراج بخشی
13/3-عیدگاہ روڈ، آدرش کالونی، اُدھم پور-182101 (جموں وکشمیر)
(Mob:09419339303,email:balrajbakshi1@gmail.com)

لفظ ٹرانسلیشن دراصل لاطینی لفظ translatio سے ماخوذ ہے جو دو لفظوں کا مرکب ہے (trans اور latum) جس کا مطلب ہے اُس پار لے جانا یا اس پار لے آنا۔ قدیم یونانی میں ٹرانسلیشن کے لیے لفظ metaphrasis استعمال کیا جاتا تھا یعنی رکاوٹ کو پار کر کے بولنا۔ اسی سے انگریزی کا لفظ metaphrase ماخوذ ہے (جس کا مطلب ہے لفظ بہ لفظ ترجمہ)۔ اور اسی کے مدمقابل paraphrasis سے لفظ paraphrase (یعنی دوسرے الفاظ میں بیان) بنا۔

بائبل کے مطابق طوفانِ نوح کے پسماندگان شینار کے میدان میں بس گئے۔ خدا دشمن نمرود کی رہنمائی میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ جنت تک اونچے ایک مینار کی تعمیر کریں گے۔ اس کے لیے انہوں نے قدرتی شکل میں ملنے والے پتھروں کی جگہ اینٹیں بنائیں اور چونے گارے کی جگہ کولتار استعمال کیا۔ مینار اتنا اونچا بنا کہ خدا پریشان ہوگیا۔ خدا نے سوچا کہ یہ ایسا اس لیے کر سکے ہیں کیونکہ یہ سب ایک ہی جگہ رہ رہے ہیں اور ایک ہی زبان بولتے ہیں اس لیے ان کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں رہے گا۔ مینار بہت اونچا ہو گیا تھا جسے مزید اونچا کرنے کے لیے اینٹیں اور کولتار تو زمین ہی سے اوپر پہنچایا جانا تھا۔ لہٰذا ایک حکمت عملی کے تحت خدا نے مختلف سطحوں پر لسانی افتراق پیدا کر دیا جس سے مینار کی مختلف سطحوں پر کھڑے لوگ ایک دوسرے کا مافی الضمیر نہ سمجھ کر الگ الگ زبانیں بولنے لگے اور مینار کی مزید تعمیر نہ ہو سکی۔ اس طرح یہ لوگ روئے زمین پر پھیل گئے اور زبانوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اس مینار کو babel Tower of یعنی مینارِ بابل کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے babel کا مطلب ہے کائیں کائیں، یعنی سمجھ میں نہ آنے والا شور و غوغا۔

کہانی کی تاریخیت سے قطع نظر اس کے علامتی پہلو پر توجہ دیں تو ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ خوشہ چینی کے لیے انسانی آبادیوں کی مسلسل ہجرت کاری اور بستیوں کے طویل تر فاصلاتی پھیلاؤ کے ساتھ زبانوں میں لسانی افتراق بڑھتا گیا اور اسی لیے مافی الضمیر کی باہمی تفہیم کے لیے ترجمے کی ضرورت

محسوس ہونے لگی۔

لیکن ترجمے کا عمل تحریری لٹریچر کے رائج ہونے کے بعد ہی وجود میں آیا۔2000 ق م سُمیریائی رزمیے کے کچھ حصے جنوب مغربی ایشیائی زبانوں میں ملتے ہیں۔ بہر حال پہلی صدی عیسوی میں Cicero اور Horace پہلے تھیورسٹ تھے جنھوں نے لفظ بہ لفظ اور بنی بر معنی ترجمے کی بات کی۔ دوسری صدی عیسوی کے نصف اول میں سیریائیوں نے یونانی اسلوب کے تتبع میں بہت سارے pagan لٹریچر کو عربی میں منتقل کیا۔ جرجاز بہترین سیریائی مترجم تھا جس نے ارسطو کی In The World کا اصل کے بالکل قریب کا ترجمہ کیا۔ اسلام کے دورِ اشاعت میں یہودیوں، رومنوں اور عربی نہ جاننے والے کئی معاشروں سے تعامل کے لیے مترجموں کی ضرورت پڑی جس سے عربوں پر غیر عربی زبانیں سیکھنا بھی لازم ہوگیا۔ زید ابن اُلنطیع اس دور کا مشہور مترجم تھا جس نے فارس، سیریا، روم اور یہودی راجاؤں کو بھیجے جانے والے حضرت محمد کے خطوط کے تراجم کیے۔ فارسی اور ترکی میں قران کریم کے تراجم کیے گئے۔ معمارِ بغداد خلیفہ المنصور اور بعد میں خلیفہ المامون کے دور میں بغداد میں 'بیت الحکما' قائم کیا گیا جس نے فلسفے، سائینس، سیاسیات اور کئی دوسرے موضوعات پر یونانی، ہندوستانی، ایرانی اور چینی تصورات کو عربی میں منتقل کروایا جن سے بعد کو یوروپی اسکالروں نے بیش بہا استفادہ کیا۔ باعث افسوس ہے کہ خلیفہ المامون سے لے کر آج تک دنیائے عرب میں کروائے گئے ترجموں کی تعداد دس ہزار کتب سے زائد نہیں ہے جبکہ سپین میں محض ایک سال کے عرصہ میں اس سے زیادہ ترجمے ہوجاتے ہیں۔

بہر حال پندرہویں صدی میں طباعت کی تکنالوجی میں تغیرات کے بعد Etienne Dolet اور پھر سترہویں صدی میں Sir John Denhom, Abraham Cowley, John Dryden, Alexander Pope وغیرہ۔ اٹھارہویں صدی میں مترجم کو اصل مصنف اور زبان مقصد کے قارئین کے تئیں ذمے دار ٹھہرایا گیا۔ 1791 میں الیگزینڈر فریزر ٹیلر کی تصنیف Principles of Translation منظر عام پر آئی۔ انیسویں صدی میں ترجمے سے متعلق متعدد نظریے سامنے آئے خصوصاً شعری تراجم میں۔ 1858 میں ایڈورڈ فٹز جیرالڈ نے عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ کیا۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں Alfred Malblanc, George Mounin, John C.Catford, Eugene Nida وغیرہ نے ترجمہ کے شعبے میں متاثر کن کام کیا۔

تکنیکی اور سائینسی شعبوں میں علم کے تراجم کی بڑھتی ہوئی ڈیمانڈ کے پیش نظر آج کے دور میں انٹرنیٹ اور مصنوعی عقل کی ایجاد سے ترجمے کا عمل کمپیوٹر کی مدد سے خودکار کیے جانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ سنیما، ٹیلیوژن میں dubbing اور subtitling سے ترجمے کا میدان وسیع ہوتا جارہا ہے۔

انسانی تجربے کی تین اہم جہتیں ہیں: جذبہ، تکنیک اور فکر۔ جذبہ، جیسے خوشی یا خوف، کی نوعیت نہیں بدلتی اور ہر معاشرے میں جذبے کی ہیئت ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔ لیکن تکنیک اور فکر کبھی جامد نہیں رہتی۔ یہ ہمیشہ مابہ تغیر ہوتی ہے۔ اس لیے تکنیک اور فکر کو ایک معاشرے سے دوسرے معاشرے میں

یعنی ایک لسانی گروپ سے دوسرے لسانی گروپ تک ترجمے کے بغیر نہیں لے جایا جا سکتا۔ ایک معاشرے کی دوسرے معاشرے کی نقل کرنے کی استعداد بھی نوع انسانی کی ترقی کی ایک بڑی وجہ تھی اور یہ تب تک ممکن نہیں ہے جب تک ایک لسانی گروپ کی فکر دوسرے لسانی گروپ کے لیے قابلِ تفہیم نہ بنائی جائے اور یہ کام ترجمے کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

بنیادی طور پر کسی ایک زبان میں لکھے گئے متن کو انہیں معانی میں کسی دوسری زبان میں منتقلی کو ترجمہ کہا جاتا ہے۔ یہ منتقلی متن اور معانیاتی دونوں سطحوں پر ہے۔

جس زبان سے ترجمہ کیا جاتا ہے اسے زبانِ مبدا یعنی (source language) کہتے ہیں اور جس زبان میں یہ منتقلی کی جائے اسے زبانِ مقصد یعنی (target language) کہتے ہیں۔ ترجمہ کے وقت زبانِ مبدا کی محاورائیت، متونیت، معانی، انداز بیاں کے فطری متبادلات اور مماثلات زبانِ مقصد میں تلاش کیے جانے چاہئیں تا کہ سطحی اور بین السطور معانی کی حتی الامکان منتقلی ہو سکے۔ oral سطح پر تو یہ زبانِ مبدا کی interpretation ہی معلوم ہوتی ہے لیکن تحریری سطح پر یہ اصل متن کی تقلیب ہوتی ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبانِ مبدا کا نہ صرف متن بلکہ اس کے معانی کی وفادارانہ منتقلی ہی کو ترجمہ کہا جانا چاہیے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ترجمہ آخر ہے کیا؟ اسے تحریری سرگرمیوں کے کس زمرے میں رکھا جانا چاہیے؟ ترجمے کو فن اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ فن تخلیقیاتی ہے، کرافٹ بمعنی ہنر اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ہنر پیشہ ورائیت سے عبارت ہے۔ Eugene Nida اسے سائینس کہتا ہے کیونکہ اصل قلمکار کے ساتھ مترجم کا بے تحریر معاہدہ ہوتا ہے کہ اس کا کیا گیا ترجمہ اصل قلمکار کی تخلیق سے برتر نہیں ہوگا اور نہ ہی متن اور معانی میں کوئی تبدیلی لائے گا چاہے ذاتی طور پر وہ اصل مصنف کے اظہار کردہ خیالات سے اختلاف ہی کیوں نہ رکھتا ہو۔ اس لیے ترجماتی عمل کو بہ یک وقت فن، ہنر اور سائینس کہا جانا چاہیے کیونکہ یہ تجزیاتی، interpretative اور تخلیقیاتی سطحوں پر کیا جانے والا ایسا عمل ہے جس سے لسانی اقدار کے ایک سلسلے کو لسانی اقدار کے دوسرے سلسلے کے ساتھ replace کیا جاتا ہے۔

فرانسیسی ہیومینسٹ Etienne Dolet (1540) کے مطابق مترجم کو چاہیے کہ وہ مکمل طور پر اصل مصنف کی منشا سمجھ لے اور لفظ بہ لفظ ترجمے سے احتراز کر کے صحیح لہجہ لانے کے لیے الفاظ کی نشست و برخاست پر مناسب توجہ دے۔ ہومر کے مترجم George Chapman (1559-1634) نے بھی Dolet کے خیالات کا اعادہ کیا۔ گوئٹے نے کہا کہ غیر زبان کے مصنف کو یا تو مقامی مصنف میں منقلب کر دیا جائے، یا قاری کو اصل مصنف کی معنویت تک لے جایا جائے۔ دونوں صورتوں میں زبانِ مقصد کے قاری کو معانی کے قریب تر لے جانا مقصود ہے۔ H.W.Longfellow کا کہنا ہے کہ مترجم کا کام یہ بتانا تو ہے کہ مصنف نے کیا کہا اور کیسے کہا لیکن مطلب کی وضاحت کرنا شارح کا کام ہے، مترجم کا نہیں۔

ہندوستان میں ترجمے کا آغاز بدھ صحیفوں ہی سے ہوتا ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا میں سنسکرت متون مقامی زبانوں میں ترجمہ کیے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ چینی بھکشو ہیون سانگ نے 645 عیسوی میں بدھ صحیفوں کی 74 جلدوں کا چینی میں ترجمہ کیا۔ قدیم ہندوستانی پنچ تنتر کی کہانیاں چھٹی صدی عیسوی میں فارسی میں ترجمہ ہو کر عربی میں چلی گئیں اور وہاں سے یونانی، پھر عبرانی، لاطینی، جرمن، اطالوی اور پھر جانے کہاں کہاں، یہاں تک کہ آج یہ کہانیاں دنیا بھر کے لٹریچر کا ناگزیر حصہ بن چکی ہیں۔ لیکن باقاعدہ ترجمے کے عمل کی ابتدا مغل بادشاہ اکبر ہی کے زمانے سے ہوتی ہے جس نے بین المذاہبی مکالمہ قائم کرنے کے لیے سنسکرت، ترکی اور عربی متون کو فارسی میں ترجمہ کروانے کے لیے ایک مکتبہ قائم کیا۔ چنانچہ اس نے رامائن، مہابھارت، بھاگوت گیتا، بھاگوت پُران، اتھرو وید، یوگ وشِشٹ جیسے صحیفوں کو فارسی میں ترجمہ کروایا۔ 1605 میں اکبر کی وفات کے وقت اس کے کتب خانے میں بیس ہزار سے زائد کتابیں تھیں۔ اکبر کے بعد داراشکوہ (1615-1659) کا ذکر آتا ہے جس نے بنارس کے پنڈتوں سے پچاس اُپنشدوں کے فارسی میں تراجم کروائے۔ 1657 تک مکمل ہو جانے والے ان تراجم کو 'سِرّ ِاسرار' کا عنوان دیا گیا۔ یہی تراجم بعد کو لاطینی اور جرمن میں منتقل ہو کر دنیا سے متعارف ہوئے۔

سال 1800 تک زمین کا 15 فیصد حصہ نوآبادیاتی نظام کے تحت آ چکا تھا اور 1867 تک 65 فیصد۔ پہلی جنگ عظیم میں فرانسیسی، ہسپانوی اور انگریز زمین کے 85 فیصد حصے پر قابض ہو چکے تھے۔ اس دور میں 15000 سے زائد زبانیں تھیں لہٰذا مقامی آبادیوں کے ساتھ تعامل کے لیے ترجمہ ایک ضروری عمل بن گیا تھا۔ (آج محض 3000 زبانیں ہی بچ رہی ہیں)۔ لیکن اسلام اور عیسائیت طویل مدت تک ترجمے کے خلاف رہے کیونکہ ترجمے سے خدا کے کہے گئے الفاظ میں ملاوٹ کا خدشہ رہتا تھا۔ لہٰذا ترجمہ کرنے والوں کو زندہ جلا دینے کی سزائیں بھی دی جاتی تھیں۔ لیکن کمال ہے کہ بائبل کے ترجمے ہی سے بعد کو ترجمے کی روایت بنی۔ اور آج تو قران بھی کئی زبانوں میں دستیاب ہے۔

ترجمے کی چند مبادیات کا تذکرہ اس لیے ضروری تھا تا کہ قارئین کو احساس ہو سکے کہ غیر ملکی زبانوں کے فن پاروں کے ترجمے کے سفر میں رفیق شاہین کن مرحلوں سے گزرے ہوں گے، کن مشکلات سے نبرد آزما رہے ہوں گے اور پھر کہاں تک سرخرو ہوئے۔ لیکن رفیق شاہین کے ترجموں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ترجمے کے خارزاروں سے وہ نہایت سہل انگاری سے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے ترجموں میں کسی شعوری کدوکاوش کے بجائے سلاست وفصاحت کا احساس ہوتا ہے جس میں کسی خودکار نظام کے تحت الفاظ موزوں نشست برخاست پر اِستادہ ہو کر یہ تاثر دیتے ہیں کہ اس کے علاوہ الفاظ کی کوئی دوسری ترتیب و تطبیق ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ جیک لندن کے افسانے 'شام زندگی' کے ابتدائی پیراگراف کو دیکھیے:

'... یاکون میں چڑھائی کے راستے کو طے کر کے جب اس نے
کنارے کی اونچائی پر قدم رکھا اس وقت دن سُرمگیں اور سرد تھا۔ حد سے زیادہ
سُرمگیں اور سرد۔ ہانپتے کانپتے ہوئے اس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ

صبح کے نو بجے تھے۔ یہاں سے سلیج (بلا پہیوں کی برف پر پھسل کر چلنے والی گاڑی) کے دھندلے سفری نشانات باریک سی لکیر کی شکلمیں عمارتی لکڑی 'اسپروس' کے جنگل میں ہوکر مشرق میں دور تک چلے گئے تھے۔ لمبی سانس لے کراس نے آسمان کا جائزہ لیا۔ وہاں سورج کا نام ونشان تک نہ تھا اور نہ ہی اُس کے طلوع ہونے کے آثار تھے۔ آسمان پر بادل بھی نہیں تھے پھر بھی دن روشن نہیں تھا کیونکہ ریشمیں وسُرمگیں اندھیرے نے ہر شے کے رخ پر نقاب ڈال رکھا تھا جس سے دن کا اجلا چہرہ سیاہ ہوگیا تھا۔ ظاہر ہے اس صورتحال کا اصل ذمے دار سورج ہی تھا جس نے طلوع ہونے میں بڑی غفلت اور لاپروائی سے کام لیا تھا۔ سورج کے عدم موجودگی اس البیلے سیاح کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ سورج کی روشنی سے محروم ایسے تاریک دن اس سے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ سورج نے شکل نہیں دکھائی تھی اور جنوبی اُفق پر سورج کو نمودار ہونے میں کئی دن لگ سکتے تھے مگر نہ تو وہ سورج سے ناراض تھا اور نہ سیہ پوش ماحول سے ہراساں '۔

آگے دیکھیے:

'... کہرے کی شکل میں برف کے ذرات کتے کے چہرے، اس کی تھوتھنی اور پلکوں پر جم گئے تھے اور اب یہی منجمد نمی سانسوں کے ذریعے اس کے اندر بھی سماتی جا رہی تھی۔ ٹھیک اسی طرح مسافر سیاح کی سرخ داڑھی اور مونچھوں پر بھی برف جم گئی تھی۔ وہ جو بھی سانس خارج کرتا اس کے سانس کی نمی فوراً ہی برف میں تبدیل ہوکر اس کی داڑھی مونچھ سے چپک کر چہرے پر وزن کی طرح لدکر رہ جاتی۔ یہاں تک کہ تمباکو چباتے ہوئے جو زرد لعاب بہہ کر ٹھوڑی پر آ گیا وہ بھی منجمد داڑھی کو رنگ دینے کے ساتھ اس کے وزن میں اضافے کا سبب بن گیا۔ اتنا ہی نہیں لعاب نے اس کے دونوں لبوں کو بھی باہم یکجا کر دیا تھا جنہیں وہ بڑی جدوجہد سے ہی ایک دوسرے سے الگ کر پاتا تھا۔ کہرے کی برفیلی پھوار کی زد میں آ کر اس کی ٹھوڑی پر برف کی شفاف اور ٹھوس داڑھی کا طول وعرض اور وزن بتدریج بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا...'

جیک لنڈن کے اس نہایت طویل افسانے میں مکالمے ہیں ہی نہیں۔ ایک مسافر اپنے کتے کے ساتھ برفستان میں راستہ بھٹک گیا ہے۔ صفر سے 32 نیچے کے درجہ حرارت میں لحظہ بہ لحظہ بڑھتی سردی مسافر کی قوتِ محسوسہ اور قوتِ مدافعت کو سلب کرتی جاتی ہے اور مسافر لحظہ بہ لحظہ اپنی موت کے قریب ہوتا جاتا ہے اور آخر میں مر جاتا ہے۔ افسانے کے زمستانی ماحول کی منظر کشی کی جزئیات پیش کرتے ہوئے رفیق شاہین

نے غیر زبان کے اس افسانے کو اس کمال ہنر مندی سے مُوثر بنایا ہے کہ افسانے کے غیر زبانی ہونے کا احساس تک نہیں ہو پاتا۔ زبانِ مبدا سے زبانِ مقصد میں نہ صرف متن بلکہ معانی کو بھی اس انداز میں منتقل کیا ہے کہ کہیں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ 'شامِ زندگی' رفیق شاہین کا ایک کامیاب ترجمہ ہے۔

دراصل ترجمے کی کوئی تھیوری نہیں ہے۔ یہ جسے ترجمے کی تھیوری کہا جاتا ہے یہ اصل میں ترجمے کی مشق ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ترجمے کی تواریخ اصل میں مختلف ادوار میں لوگوں کے ترجمے کی کوششوں کی تواریخ ہے اور ترجمے کی انھیں کوششوں سے ترجمے کی تھیوریاں منتج ہوئیں ٹھیک ویسے ہی جیسے علم کے دوسرے شعبوں میں پہلے تجربہ کیا جاتا ہے اور بعد میں تھیوری سازی۔ اسی طرح پہلے ترجمہ کیا گیا، پھر اس پر بحث کی گئی۔ John Wycliffe, John Dryden, Eugene Nida, Eitenne Dolet وغیرہ جو ترجمے کی دنیا میں بڑے نام ہیں، یہ سبھی پہلے مترجم بنے اور تھیوری ساز بعد میں اور مترجم بھی پیدائشی نہیں ہوتے بلکہ مسلسل مشق ہی ان کے ہنر میں نکھار لاتی ہے۔

انطونی چیخوف کے افسانے 'خارِ مغیلاں' میں رفیق شاہین کی یہ منظر کشی دیکھیے:

> '...آسمان پر چودہویں کا چاند اپنے شباب پر تھا۔ سیم تن چاندنی کی روپہلی کرنوں نے آسمان، زمین، حویلی، صحن اور باغ بغیچوں کو اپنی مرمریں باہوں کے حلقے میں سمیٹ رکھا تھا۔ موسمِ خزاں کے سائے تلے برگ وبار سے عاری وعریاں درخت اداسی بھری نیم غنودگی کے عالم میں مارچ کے اواخر میں آنے والے موسمِ بہار کے خواب زاروں میں کھوئے ہوئے تھے۔ یچیگلوف نے صحن میں کھڑے ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دور تک کوئی بھی نہیں تھا ماسوائے ایک الہڑ بچھڑے کے جو پاؤں میں رسی لپٹ جانے کے سبب مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے برابر اُچھل کود اور زور آزمائی کیے جا رہا تھا۔ یچیگلوف باغ میں پہنچا تو وہاں بھی کوئی بھی نہیں تھا اور ہر طرف خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔'

یہ ترجمے کی زبان محسوس ہی نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہی نہیں کہ کسی دوسرے خطے یا دوسرے ثقافتی منظر نامے کی بات ہو رہی ہے۔ افسانے میں چیخوف نے چاہے جن الفاظ کا بھی استعمال کیا ہو، رفیق شاہین کی مترجمہ منظر کشی پر طبع زاد ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

ترجمے کی متواتر مشقوں کے دوران یہ حقیقت وا ہوتی ہے کہ ترجمہ دراصل انفرادی کے بجائے ایک اجتماعی سرگرمی ہے جس کے لیے مترجم کو اپنے ارد گرد بہت سے منتخب دوستوں پر مشتمل ایک سازگار ماحول بنانا پڑتا ہے۔ ان منتخب دوستوں میں لغات، glossary, thesarus، انسائیکلوپیڈیا اور علما و فضلا شامل ہونے چاہئیں تا کہ بوقت ضرورت مناسب متبادلات اور مماثلات مجوز کر سکیں۔ رفیق شاہین کے ترجموں میں فنی لوازمات کی خوشگوار موجودگی سے پتہ چلتا ہے کہ غیر شعوری طور پر ہی سہی انہوں نے ان

التزامات سے ضرور استفادہ کیا ہوگا۔

مترجم کی ایک اہم صلاحیت یہ ہوتی ہے کہ اسے نہ صرف دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہونا چاہیے بلکہ دونوں زبانوں کے محاوراتی استعمال سے بھی آگاہ ہونا چاہیے۔ الفاظ کے سطحی معانی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ بین السطور معانی کی منتقلی ملحوظ رہنا چاہیے۔ ہوٹل کے ڈائننگ ہال کے کسی میز پر بیٹھے ہوئے دو اجنبیوں میں سے ایک اگر دوسرے سے پوچھتا ہے کہ کیا آپ نے ناشتہ کرلیا ہے؟ تو اصل میں وہ اسے ناشتے کے بارے میں نہیں پوچھ رہا ہے یا اسے ناشتے کی پیشکش کر رہا ہے بلکہ یہ اسے 'ہیلو' کہنے کا ایک شائستہ طریقہ ہے۔ مثلاً یہ جملہ دیکھیے: There are huts on the river، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دریا کے پانی پر جھونپڑیاں بنی ہوئی ہیں، جو ناممکن ہے۔ بلکہ اس کا مطلب ہے کہ دریا کے کنارے پر جھونپڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ مختلف ثقافتی پیش منظروں میں الفاظ معانی بدل لیتے ہیں۔ میں نے پانی پیا، یہ پانی کی ایک جہت ہے۔ لیکن گنگا کے پانی کو ہم محض پانی نہیں بلکہ 'گنگا جل' کہتے ہیں جس سے گنگا کے پانی کو ایک مخصوص ثقافتی تناظر میں دیکھا جانے لگتا ہے اور وہ تقدس کا حامل ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ الفاظ کا تعلق صرف زبان سے نہیں بلکہ ثقافت سے بھی ہے۔

چنانچہ پشکن کے افسانے 'انوکھی دعوت' میں میزبان اپنے گھر میں مہمانوں کو بیئر اور شراب کی دعوت دیتا ہے۔ حالانکہ اردو کے معاشرے ایسی دعوتوں کا اہتمام نہیں ہوتا اور اس وسیع پیمانے پر تو بالکل ہی نہیں۔ اب یہاں ثقافتی ترجمے کا مسئلہ سامنے آتا ہے کیونکہ بیئر اور شراب کی دعوت ہمارے ہاں ایک معیوب عمل ہے۔ لیکن یہاں چونکہ رفیق شاہین نے کرداروں کے نام بدل کر انہیں اردو کے کلچر میں منقلب نہیں کیا بلکہ اصل کرداروں کو انہیں کے معاشراتی تناظر میں پیش کیا ہے اس لیے ان کے اس معاشراتی عمل پر ہمیں اعتراض نہیں ہوتا اور ہم افسانے کے بہاؤ کے ساتھ چلتے چلے جاتے ہیں۔

ہر متن ترجمہ پذیر ہے۔ ایسا کوئی متن نہیں ہے جس کا ترجمہ نہ ہو سکتا ہو۔ اور اگر کوئی مترجم کسی متن کی غیر ترجمہ پذیری کی شکایت کرتا ہے تو یہ متن کی یا فنِ ترجمہ کا مسئلہ نہیں بلکہ مترجم کی کم مائیگی کا مسئلہ ہے۔ متن کی مکمل تفہیم کے بعد اسے زبانِ مقصد کے فِلٹر سے گزارا جاتا ہے۔ فلٹریٹ ترجمہ پزیر متن کو فلٹریٹ کہا جائے گا لیکن غیر ترجمہ پزیر باقیات (residue) بھی ہمیشہ کے لیے نا ترجمہ پذیر نہیں رہتے اور صحیح حکمت عملی کے ساتھ، یعنی محولہ بالا ترجماتی ماحول کی مدد سے انہیں بھی ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ پشکن کا 'گردشِ رنگِ چمن' اور لیو طالسطائی کا 'حریتِ ابلیس' بھی رفیق شاہین کی ترجماتی سلاست روی اور فصاحت کی نہ صرف بہترین مثالیں ہیں بلکہ انگریزی اور اردو پر ان کی مکمل گرفت کا بھی ثبوت ہیں اور دونوں زبانوں میں مہارت ہی ترجمہ کے کامیاب تقلیبی عمل کی ضامن ہوتی ہے۔

ایک حیرت زا حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر میں ہونے والے ترجموں میں ادبی ترجموں کی تعداد محض پانچ فیصد ہی ہے باقی ترجمے knowledge texts کے زمرے میں آتے ہیں۔ اور اردو میں تو ترجمہ نگاری کی کوئی مستحکم روایت بھی نہیں رہی۔ لے دے کر ایک منشی تیرتھ رام فیروز پوری ہیں جنہوں

نے بسرّی ادب کے لاتعداد شاہکاروں کا اُس دور میں اردو میں ترجمہ کیا جب بسرّی ادب کو تیسرے درجے کی صنف سمجھا جاتا تھا (آج بھی وہی حالت ہے)۔ مظہر الحق علوی نے بھی ہیبتناک اور محیر العقول غیر ملکی شاہکاروں کے اردو میں ترجمے کیے ہیں۔

چنانچہ ایک عرصۂ دراز کے بعد رفیق شاہین ترجمے کے فن کو نہ صرف بحال کرتے دکھائی دے رہے ہیں بلکہ ترجمے کی پیشہ ورانہ بلندیوں کی جانب سخت ریاضت، تسلسل اور استقلال کے ساتھ گامزن ہیں۔



سرمایۂ اردو میں باعث اضافہ
رفیق شاہین کے افسانوی ترجمے

نقشبند قمر نقوی بخاری
(ایم۔بی۔اے۔امریکہ)
(۶۴۴۶ ایس انڈیاناپولس پیلیس ٹلسا۔اوکلاہوما،امریکہ)

ادب، انسانی جذبات، واقعات زندگی اور حقائق رسوم ورواج کی ترجمانی کا نام ہے، خواہ وہ نثر کی شکل میں ہو یا نظم کی صورت میں، البتہ ان تمام عناصر زندگی کو بہتر انداز، دلچسپ قرینے اور ایسے مناسب الفاظ میں بیان کرنا جو عام انداز سے جداگانہ ہو۔

ادب، انسانی تجربات اور رجحانات کا لب لباب دلکش الفاظ اور دلچسپ انداز بیان کے ساتھ پیش کرتا ہے، ادیب اپنے مشاہدات، تجربات، تجزیات اور خیالات کے ردعمل کی تشریح ایسے پیرائے میں کرتا ہے، جو قارئین کے سامنے ایک حقیقت پر مبنی تصویر بن جاتی ہے۔ ان کو اس کے مطالعے سے بعض ایسے حقائق اور ان کے تجزیات سے حاصل شدہ نتائج کا علم ہوتا ہے جو عام طور سے محسوس نہیں ہوتے۔

ادب زبانی بیان کو نہیں کہا جاتا، اس لئے کہ زبانی بیانات کے پس منظر میں فکر وشعور کی کار فرمائی کا دخل نہیں ہوتا، جو بات زبان سے ادا ہوتی ہے وہ وقتی اور عارضی تاثر قائم کرتی ہے، لیکن ''تحریر'' مستقل ہوتی ہے، جس کے پس پشت غور وفکر کا ایک وسیع تحرک موجود ہوتا ہے، نتیجہ یہ کہ اس کا اثر بھی دیر پا ہی نہیں بلکہ مستقل ہوتا ہے، ممکن ہے جو تحریر حال میں معرض وجود میں آئی اور پڑھی گئی، وہ مستقبل میں سالہا سال تک وقتاً فوقتاً پڑھی جاتی رہے اور ہر بار اس سے کم از کم وہی تاثیر پیدا ہو جس کا وہ انعکاس کرتی ہے اس کا امکان بھی ہے، کہ اس سے تحقیق وتفتیش کے نئے دریچے وا ہوں اور انکشافات کا سلسلہ جاری ہوسکے۔

اسی ''تحریر'' کو ادب کا نام دیا جاتا ہے۔

اردو ادب کا دامن بہت وسیع ہے، اس کا یہ سبب نہیں کہ ابتدا سے ہی ایسا تھا بلکہ، بتدریج ایسا ہوا۔ زبان ادب کے ارتقا کا عمل مسلسل جاری رہا، زبان میں ہندی الفاظ تو آغاز سے ہی شامل تھے، لیکن بعد میں مختلف زبانوں کے الفاظ داخل ہوتے رہے، جیسے عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، پرتگالی، وغیرہ۔

اسی طرح ادب میں مختلف اصناف بیان واظہار کے شمول کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

برصغیر میں انگریزوں کے تسلط نے اردو ادب میں بھی امکانات کا ایک وسیع میدان مہیا کر

دیا۔ اردو ادب پر جو محدودیت عربی اور فارسی نے عائد کر رکھی تھی، اس میں بہت وسعت پیدا ہوئی اور یکبارگی ہی ایک ایسا وسیع میدان ابد پیش نظر آ گیا جس میں امکانات کا اندازہ کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی، اور روسی ادب کی تصویریں ہندوستان میں نظر آنے لگیں، خیالات اور رجحانات متاثر ہوئے اور ادب کا زاویۂ نگاہ بدل گیا۔

اسی زاویۂ نگاہ نے برصغیر کے بعض ادیبوں کو یورپ کے ادب کی طرف متوجہ کیا، جس سے ابھی تک اردو ادب محروم رہا تھا۔ وہ ارتقائی مدارج جو یورپی ادب طے کر چکا تھا، یکبارگی ہی اردو کے دانشوروں اور ادیبوں کے پیش نظر آ گئے، اور خیالات میں ایک جدید تنوع پیدا ہوتا گیا۔

ادب کسی محدود رجحان یا رواج کے اظہار کا نام نہیں۔ بلکہ سارے انسانی جذبات وخیالات کے اظہار کا نام ہے۔ یہ انسان کی زندگی کے ہر شعبے کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کا نہایت وقیع انداز سے جائزہ لیکر تجربات کا ایک نقش حسین مرتب کر دیتا ہے۔

اسی تناظر میں دوسری زبانوں کے تراجم کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اردو ادب میں کہانیوں کا رواج ابتدا سے تو نہیں تھا، اظہار کا بیشتر وسیلہ شعر تھا، جس کے نتیجے میں متعدد مثنویاں وجود میں آئیں جن میں کسی معاشقے یا کسی جنگ کے بیان کو بہت وسیع انداز سے بیان کیا گیا۔ لیکن اسی رجحان نے کچھ عرصہ بعد نثر میں افسانوں کو وجود بخشا، اور اردو میں اس کا سلسلہ چل نکلا۔

واقعتاً اردو ادب تراجم کے معاملے میں بھی اب بہت متمول ہے، زیادہ تر تراجم تو انگریزی ادب کی معروف کتابوں سے کئے گئے، جیسے، ہومر کی ''الیاڈ'' ملٹن کی ''پیراڈائز لاسٹ'' ٹیگور کی ''گیتانجلی'' وغیرہ، اسی طرح روسی افسانوں کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا گیا۔

غالباً...... منشی تیرتھ رام فیروزپوری اور منشی پریم چندر نے انگریزی ناولوں کے ترجموں کا آغاز کیا، ساتھ ہی کچھ لوگوں نے روسی افسانوں کی طرف توجہ دی اور ان کے ترجمے مختلف رسائل میں شائع ہونے لگے۔

مختلف زبانوں کے افسانوں، کو اردو میں ترجمہ کرنے کے لئے کوئی طریقۂ کار تو وضع نہیں کیا گیا۔ البتہ دوسری زبان کے مفاہیم کو اردو میں ظاہر کرنا دشوار ہونے کے باوجود نہایت کامیابی سے انجام دیا گیا اور بعض تراجم تو ایسے دلکش ہوئے جیسے اصل ہوں۔

رفیق شاہین نے تراجم کو اچھا روج دیا۔ روس کے متعدد افسانہ نویسوں کے دلچسپ اور کارآمد افسانوں کا انھوں نے ترجمہ کیا جو بعض رسائل میں شائع ہوئے۔

ترجمے کی ایک دشواری یہ ہوتی ہے کہ، اصل قصہ ایک قطعاً مختلف ماحول اور معاشرتی رجحان کے تحت لکھا ہوا ہوتا ہے، جس سے وہ جذبات واحساسات مترشح ہوتے ہیں جو اردو حلقوں میں عام نہیں، حتی کہ انگریزی، فرانسیسی اور روسی افسانوں میں مکالمات اور گفتگو بھی مختلف نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس کو اردو کے ماحول میں ڈھالنا آسان نہیں ہوتا۔ بعض تراجم جو دلچسپی سے خالی ہوتے ہیں ان کا یہی نقص ہوتا

ہے کہ وہ اجنبی ماحول کو اس برصغیر کی معاشرتی اور حسی کیفیات سے مطابقت نہیں دے پاتے۔

ترجمہ، اسی وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب وہ مقام وافراد کی اصل معاشرتی حیثیت کی روشنی میں ان کے جذبات اور خیالات کی آئینہ داری کر سکے۔ افسانہ کسی زبان میں بھی ہو، وہ کسی خاص نقطۂ نظر سے ایک حلقۂ افراد کے احساسات کی عکاسی کرتا ہے۔ جذبات کے ایک مجموعے کو بیان کرتا ہے، ایک تاثر پیدا کرتا ہے۔

اگر ترجمہ یہ کام انجام نہ دے سکا تو اس کا ادب میں شمول ہی غیر ضروری ہے۔

رفیق شاہین کا نام اردو ادب میں انفرادیت کا حامل ہے، انھوں نے مختلف زبانوں کے دلکش اور مہذب افسانوں کا اردو میں ترجمہ کر کے اردو ادب کی دولت میں خاصا اضافہ کیا ہے، ان کے یہ تراجم مختلف رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں، اور یقیناً پسند کئے جاتے ہیں۔

رفیق شاہین نے اپنے تراجم میں اس کا خاص اہتمام رکھا ہے کہ وہ افسانے کے ماحول کو بعینہ اسی طرح قائم رکھتے ہیں جو افسانہ نویس نے مرتب کیا تھا، اور اسی کے تناظر میں کہانی کو اردو کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ البتہ اس کو ایسی خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ وہ اس ماحول میں شامل معلوم ہوتا ہے۔

رفیق شاہین کو خصوصاً روسی افسانوں کے ترجمے کرنے میں کمال حاصل ہے، جیسے لیوٹالسٹائی، چیخوف، نکولائی گوگول وغیرہ۔ البتہ انھوں نے پشکن اور او ہنری کو بھی اپنے دائرۂ تراجم میں شامل کیا ہے۔

رفیق شاہین کے تراجم پڑھتے وقت یہ احساس بہت عارضی ہوتا ہے کہ ایک غیر ملک اور اجنبی ماحول کے عکاس قصے کا مطالعہ کیا جارہا ہے، افسانے کے کرداروں کے نام اجنبی ہونے کی وجہ سے ابتدا میں تو ضرور یہ خیال آتا ہے، لیکن جیسے جیسے افسانہ پیش رفت کرتا ہے ویسے ہی ویسے قاری اس ماحول میں شامل ہو کر جزو حکایت بن جاتا ہے اور پھر اجنبیت کا احساس نہیں رہ جاتا، یہ انکے ترجمے کی بہت نمایاں خوبی ہے۔

رفیق شاہین قاری کی نفسیات کو سمجھتے ہیں، لہٰذا وہ ترجمہ کرتے وقت یہ خیال رکھتے ہیں کہ واقعات کا تانا بانا ایسا ہو جو قاری کو اپنی گرفت میں لے سکے۔ وہ افسانہ ہی ایسا انتخاب کرتے ہیں جس کے مطالعے سے ذوق ادب کی تسکین ہو سکے۔

مثلاً ان کا ایک ترجمہ...... جیک لندن کا افسانہ ''شام زندگی'' ہے، جو رسالہ ''بزم ادب'' میں شایع ہوا، اس افسانے کا آغاز ہی ایسا ہے کہ ذہن اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، اور اس کو بیان کرنے میں رفیق نے الفاظ کی جس خوبی سے کام لیا ہے وہ جلب توجہ کا کام بہت خوبی سے انجام دیتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

> پاکون میں چڑھائی کے راستے کو طے کر کے، جب اس نے کنارے کی اونچائی پر قدم رکھا اس وقت دن سرمگیں اور سرد تھا۔''

اس بیان کی پہلی خوبی تو یہی کہ وہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتی، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ خود انھیں کا طبعزاد ہے۔اسی ضمن میں آگے وہ لکھتے ہیں:

ہانپتے کانپتے ہوئے اس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا صبح کے نو بجے تھے۔

اس جملے میں بھی ساختیت معلوم نہیں ہوتی۔ترجمہ ہے لیکن اصل معلوم ہوتا ہے۔

رفیق شاہین کے تراجم میں یہی بڑی خوبی ہے، وہ ترجمے معلوم نہیں ہوتے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ افسانہ خود انھیں کی اپنی تخلیق ہے۔اس خوبی سے ترجمہ کرنے کے لئے نہ صرف یہ کہ جس زبان میں اصل افسانہ ہے اس سے کاملاً واقفیت لازم ہے بلکہ روحِ مضمون کا ادراک کرنے کی اہلیت بھی لازمی ہے۔

ترجمہ تو آسان ہے، لفظ بہ لفظ بھی کیا جاسکتا ہے اور مفہوم کو اپنے الفاظ میں بھی بیان کیا جاسکتا ہے، لیکن اصل کام یہ ہے کہ مترجم بیہان و مفہوم کی روح تک پہونچ جائے اور جو بات غیر زبان بیان کی گئی ہے اس کی واقعیت کو اپنے طریقے سے بیان کردے۔صرف ترجمہ ہی نہ کردے بلکہ مضمون کے مفہوم کو منکشف کردے۔

رفیق شاہین کے تراجم میں یہ خوبی بہت نمایاں ہے، انھوں نے کسی کہانی کا لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں کیا، بلکہ نفس مفہوم کو نہایت مناسب عبارت کے وسیلے سے اس طرح ظاہر کردیا ہے کہ قاری کو یہ نہیں محسوس ہوتا کہ وہ ترجمہ پڑھ رہا ہے، بلکہ معلوم ہوتا ہے جیسے وہ خود رفیق شاہین کا تخلیق کردہ قصہ پڑھ رہا ہے۔

ترجمے میں زبان کا استعمال بھی بہت اہم ہے۔ ہر زبان کا اک اپنا طرز بیان اور انداز اظہار ہوتا ہے، جس طرح اردو کا اپنا ایک منفرد قرینہ ہے، بعض زبانوں میں بات کو فوراً واضح کردینے کا طریقہ نہیں، عبارت اور مضمون ایسا پیچیدہ ہوتا ہے کہ متعدد جملوں کے مطالعے کے بعد اصل مفہوم واضح ہوتا ہے۔اس الجھاؤ سے بچنے کی ترکیب بھی کوئی نہیں، اگر ترجمہ کیا جارہا ہے تو بیان کی حقیقت کو قائم رکھنا ضروری ہے، بات اسی طرح کہی جائے جیسے خالق حکایت نے کہی ہے، اگر اس پر عمل کیا جائے تو ترجمہ ایسا پیچیدہ ہوسکتا ہے کہ قاری فوراً ہی اس کے مطالعے سے اکتا کر مزید قرات ترک کردے۔

رفیق شاہین کے ترجموں میں یہ بڑی خوبی ہے کہ ان کی عبارت غیر ضروری پیچیدگی اور گنجلک عبارتوں سے عاری ہوتی ہے۔اس کا نمایاں سبب یہی کہ رفیق شاہین، جس زبان سے قصے کا ترجمہ کرتے ہیں اس پر ان کو اتنا عبور اور قابو حاصل ہے کہ وہ متعدد جملوں کے، مفاہیم کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اس کے بعد اس مفہوم کو بہت قرینے کے ساتھ مناسب اردو الفاظ میں حسن بیان کے ذریعے ارسال کرتے ہیں۔جیسے الگونڈر پشکن کے ایک افسانے کے ترجمے میں، رفیق نے لکھا ہے:

باہر برفانی ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے، آندھی کے تھپیڑوں نے بھیڑیوں کی آواز میں شور وغل مچانا شروع کردیا تھا، پاگل ہوا کے بے لگام جھونکے، فولادی پھاٹک، در اور دریچوں سے سر ٹکرا رہے تھے، ارد گرد کا اداس ماحول کسی آنے والی نئی نحوست کا اعلان کررہا تھا، ساری حویلی نیند کی آغوش میں کھو کر دنیا و مافیہا سے

بے خبر نظر آرہی تھی۔

اس ترجمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ، مترجم نے اپنی مہارت کے ذریعے، افسانہ نگار کے بیان کو ایسی خوبی کے ساتھ اپنی زبان مین منتقل کیا ہے کہ، سارا منظر تصویر کی طرح قاری کی نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ بیان کسی دوسری زبان سے اردو کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ اگر اسی بیان کو ترجمہ کرتے ہوئے، مترجم لغزش کرتا تو اس منظر کشی کا حسن ہی نہ زائل ہوتا بلکہ خوبی بیان اور ماحول کا تاثر بھی مجروح ہو جاتا۔

انتون چیخوف کے ایک افسانے کا ترجمہ کرتے ہوئے رفیق شاہین نے اپنی اہلیت کا ایک اور ثبوت دیا ہے:

> دیکھتے جاؤ، میں کس طرح تمھاری اصلیت کا بھانڈا پھوڑونگی، تمھیں اچھی طرح پتہ چل جائیگا، کہ کسی معصوم کی زندگی کے ساتھ کھلواڑ کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔
> میں تمھارے خلاف مقدمہ دائر کرونگی، تمھاری نشانی کو تمھارے گھر کی چوکھٹ پر چھوڑ آؤنگی اور بتاؤنگی تمھاری بیوی کو، کہ بظاہر معصوم نظر آنے والا یہ شخص اندر سے کس قدر گھناؤنا ہے۔

اس ترجمے کا مطالعہ بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ سارا بیان ترجمہ ہونے کے باوجود ان کا اپنا معلوم ہونے لگا۔ انھوں نے اصل متن کو اس خوبی کے ساتھ اپنے تخیل کو گرفت میں لیا ہے کہ غیریت کا خیال ہی نہیں آتا، اور خالق حکایت نے جو کچھ کہا ہے وہ اتنا واضح ہو گیا جیسے اصل ہو۔

رفیق شاہین کو زبان و بیان پر بھی قدرت حاصل ہے، کامیاب ترجمے کے لئے اردو لغت کی وسعت بہت ضروری ہے اگر خالقِ قصہ کے مافی الضمیر کو مناسب و موزوں الفاظ کے ذریعے بیان نہ کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ حسن بیان نہیں رہتا بلکہ متن کا مفہوم بھی الجھ جاتا ہے۔ رفیق کو اردو زبان پر کامل قدرت حاصل ہے، وہ جس خیال کو سپرد قلم کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے ان کے پاس نہایت موزوں الفاظ کا ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔

ان کے تراجم کی زبان بامحاورہ، سادہ اور سلیس ہوتی ہے، وہ خیال کو اس کے تاثر سے مربوط رکھنے کے لئے نامانوس، دشوار اور وزنی الفاظ کا سہارا نہیں لیتے، بلکہ عبارت میں سلاست اور روانی پیدا کرنے کے لئے ایسے الفاظ منتخب کرتے ہیں جو عام طور سے بولے اور سمجھے جاتے ہیں، ساتھ ہی اپنی عبارت کی فصاحت کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔

دلکش نثر کی خوبی ہی یہ ہے کہ اس میں فصاحت بھی ہو اور بلاغت بھی۔ لیکن فصاحت و بلاغت کا یہ مطلب نہیں کہ مفہوم کی ادائیگی کے لئے عبارت پیچیدہ کردی جائے یا وہ الفاظ استعمال کئے جائیں جو بنیادی طور سے فصیح ہوتے ہوئے بھی نفس مضمون سے مطابقت پیدا نہ کرسکیں۔ رفیق شاہین نے اس کا خاص لحاظ رکھا ہے، ان کا ایک اور ترجمہ درج ذیل ہے:

گھر آکر مجھولوں کی طرح بستر پر پڑا میں پشکن کی شاعری سے لطف اندوز ہوتا رہا، میں نے اپنی پسند کی بہت سی لائنیں نقل بھی کیں، اور پھر شام ہونے پر، ایچ ای روٹ پر تا دیر اس اس امید میں بھٹکتا رہا، کہ شاید ان محترمہ کی گاڑی ادھر سے گذرے اور ایک بار پھر ان کے دیدار کا شرف حاصل ہو جائے

(ایک دیوانے کی ڈائری۔ نکولائی گوگول)

یہ عبارت ترجمہ ہے، لیکن اس کے الفاظ میں رعنائی ہے، فصاحت ہے اور خوبیٔ بیان ہے، جو ان کی ترجمہ کاری کی مہارت کی غماز ہے۔

رفیق شاہین نہایت تجربہ کار، ماہر مترجم ہیں۔ ان کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے، ان کے قلم میں اظہار کی غیر معمولی قوت ہے، ان کے خیالات میں بالیدگی ہے، اور ان کے ذہن میں نفس مضمون کو گرفت میں لینے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔

....



رفیق شاہین بحیثیت مُترجم

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
(جموں کشمیر)

علمی و ادبی، مذہبی و سماجی اور سائنسی و تکنیکی علوم و فنون کے فروغ اور ترویج و اشاعت میں ترجمے نے اہم اور بنیادی رول ادا کیا ہے۔ دُنیا کی مختلف قوموں نے ایک دوسرے کی تہذیب و ثقافت علم و ادب اور افکار و نظریات کو سمجھنے اور مستفید ہونے کے لئے ترجمہ کو ایک اہم وسیلہ کے طور پر اپنایا ہے۔ اس اعتبار سے ترجمہ نگاری کی اہمیت و افادیت کو شدّت سے محسوس کیا گیا ہے۔ دنیا کے عظیم فنکاروں کی شاہکار تخلیقات و نگارشات جن میں فردوسی کا ''شاہ نامہ'' مارکس کی ''داس کیپٹل''، شکسپیر کے ڈرامے، ملٹن اور ورڈس ورتھ کی تخلیقات نیز اقبال اور عمر خیام کی رُباعیات کے علاوہ بہت سے مفکروں اور دانشوروں کی تصانیف کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ جن کی وجہ سے عالمی سطح پر عوام میں ذہنی بیداری اور انسانی قدروں کو فروغ ملا۔

ترجمہ نگاری کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ تو تصنیف و تالیف سے کئی گُنا دشوار ہے کیونکہ تصنیف و تالیف میں اظہار خیال کی گنجائش ہوتی ہے جبکہ ترجمے میں ہر قدم پر پابندی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف کے فکری اُسلوب، انداز بیان، خیالات کی پیشکش کے انداز اور مخصوص الفاظ کے معنی و مفہوم کی نزاکت کو ملحوظ نظر رکھنا پڑتا ہے تاکہ اصل مصنف کا مافی الضمیر اپنے الفاظ و محاورے میں اس طرح ادا ہو جائے کہ مصنف کے مدعا و مقصد کو سمجھنے میں کوئی دقت نہ آنے پائے۔ ایک اچھے مترجم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اُن تمام اُصول و ضابطوں اور لوازمات کا دورانِ ترجمہ خیال رکھے جن کے باعث اصل تصنیف کی ترجمانی کا حق ادا ہوتا ہے یعنی مترجم کو چاہیئے کہ وہ اصل مصنف کے مفہوم کو اپنی زبان اور محاورے میں اس طرح ادا کر دے کہ کہیں بھی گنجلکا نہ پن پیدا نہ ہو اور نہ ہی اصل خیال کے تاثر میں کوئی فرق آئے۔ عمدہ ترجمے ادب کا ایک خاص حصہ بن جاتے ہیں اور اُنہیں اصل تصنیف کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے جبکہ بُرے ترجمے زبان و ادب اور ان کے قارئین کے دل و دماغ پر غلط اثرات مرتسم کرتے ہیں۔

رفیق شاہین اگرچہ انگریزی ادبیات میں ماسٹر ہیں لیکن اس کے باوجود اُردو شعر و ادب کی مٹھاس اُن کی روح اور خون میں گھل مل گئی ہے۔ اس بات کا ٹھوس ثبوت ہمارے سامنے رفیق شاہین کی وہ تصانیف ہیں جو ان کی محنت شاقہ، ادب کے تئیں ان کی مجنونانہ وابستگی اور زبان و بیان کے عمدہ استعمال کی مظہر ہیں مثلاً ان کی مطبوعہ تصانیف کی ترتیب اس طرح سے ہے :

۱۔ ''چراغِ اُمید'' (ناول) ۱۹۶۰ء

۲۔ ''تعلیم خاندانِ نقشبندیہ مجدّدیہ'' (روحانیات) ۱۹۹۷ء
۳۔ ''بادباں سفینوں کے'' (شاعری) ۲۰۰۶ء
۴۔ ''ہمہ جہت قلمکار: ڈاکٹر فراز حامدی (تحقیق و تنقید) ۲۰۰۷ء
۵۔ ''دوہا دھنک'' (شاعری) ۲۰۱۴ء

ان تخلیقی، تحقیقی و تنقیدی تصانیف کے علاوہ رفیق شاہین کی ایک اور گراں قدر اور معلومات افزا تصنیف، بیرونی ممالک کے شاہکار افسانے'' کے عنوان سے بہت جلد منظر عام پر آ رہی ہے۔ اُردو کے معیاری رسائل و جرائد میں اُن کی ادبی و شعری نگارشات کی اشاعت سے ان کی ہمہ جہت اور پُر وقار ادبی شخصیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق شاعر ہیں بلکہ ناول نگار، افسانہ نگار، محقق و نقاد، مبصر و مفکر ہونے کے علاوہ ایک اچھے مترجم بھی ہیں۔ میں نے مختلف رسائل میں ان کے ترجمے پڑھے ہیں۔ انہوں نے ادبیاتِ عالم کے شاہکار افسانوں کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ کشمیر سے شائع ہونے والے ایک موقر و معیاری سہ ماہی ''بزم ادب'' جس کے مدیر غلام محمد ڈار المعروف ابن اسماعیل ہیں۔ مئی ۲۰۱۳ میں انہوں نے ''بزم ادب، کا عالمی ادب نمبر'' شائع کروایا ہے جو رفیق شاہین سے منسوب ہے۔ جس میں ابن اسماعیل اور دیگر قلمکاروں کی نگارشات کے علاوہ رفیق شاہین کے سترہ غیر ملکی افسانوں کے تراجم شامل ہیں جن کے عنوانات اس طرح سے ہیں:

شام زندگی، نوشتۂ تقدیر، حرافہ، ایک دیوانے کی ڈائری، گردش رنگ چمن، حُریت ابلیس، خار مغیلاں، جہان دیگر، ماورا، بعد از طوفاں، انوکھی دعوت، خوش نصیب قاتل، عرفان، باؤلی بلا، وحشت دل، ٹیس، اور چور چور ان تمام افسانوں کے مصنفین مغربی ممالک سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے انگریزی، روسی اور دیگر زبانوں میں اپنی شاہکار کہانیوں سے اپنے سماج و معاشرے میں رونما ہونے والے حالات و اقعات اور بالخصوص انسانی نفسیات کی موثر عکاسی کی ہے۔ ان مغربی مصنفین کے نام ہیں جیک لندن، الیکسانڈر پشکن، انتون چیخوف، نکولائی گوگول، لیو طالسطائی، او ہنیری، نگوئین کانگ ہوآن، مسیمو بونٹیم پیلی اور طامس ہارڈی۔ رفیق شاہین نے انگریزی زبان وادبیات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان تمام سترہ انگریزی افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جن سے اردو والے ابھی تک محروم تھے۔ ترجمہ نگاری کے اصول اور مترجم کے فرائض کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے رفیق شاہین نے متذکرہ افسانوں کو خوبصورت اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ تمام افسانوں کا متن نہایت توجہ طلب اور لسانی وادبی لطف اندوزی کا حامل ہے۔ کون سا لفظ کہاں استعمال ہو اور معنوی جہات سے مربوط و تسلسل اور اصل مصنف کے فکر و خیال کے مطابق موزوں و مناسب الفاظ و تراکیب کے بہتر استعمال سے قاری کہانی کار کی روح تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ نہ صرف مغربی تہذیب، وہاں کے حالات اور ماحول سے واقف ہو جاتا ہے بلکہ کہانی میں پیش کردہ کرداروں کی نفسیاتی اور ذہنی کیفیتوں سے بھی کماحقہ، واقف ہو جاتا ہے بلک رفیق شاہین کو جتنی اُردو زبان پر دسترس حاصل ہے اُس سے کئی گنا زیادہ وہ انگریزی پر عبور رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جتنے بھی افسانوں کا اُردو

میں ترجمہ کیا ہے وہ کامیاب اور مفید کہے جا سکتے ہیں۔ مثلاً جیک لنڈن کی ایک کہانی کو رفیق شاہین نے ''شام زندگی'' کا عنوان دیا ہے۔ انگریزی سے ترجمہ شدہ اس کہانی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''کہرے کی شکل میں برف کے ذرّات کتّے کے چہرے اُس کی تھوتنی اور پلکوں پر جم گئے تھے اور اب یہی منجمد نمی سانسوں کے ذریعے اُس کے اندر بھی سماتی جا رہی تھی۔ ٹھیک اسی طرح مسافر سیاح کی سرخ داڑھی اور مونچھوں پر بھی برف جم گئی تھی۔ وہ جو بھی سانس خارج کرتا، اس کے سانس کی نمی فوراً ہی برف میں تبدیل ہو کر اُس کی داڑھی مونچھ سے چپک کر چہرے پر وزن کی طرح لد کر رہ جاتی۔ یہاں تک کہ تمبا کو چباتے ہوئے جو زرد لعاب بہہ کر ٹھوڑی پر آ گیا وہ بھی منجمد داڑھی کو رنگ دینے کے ساتھ اُس کے وزن میں اضافے کا سبب بن گیا۔ اتنا ہی نہیں اس منجمد لعاب نے اُس کے دونوں لبوں کو بھی باہم یکجا کر دیا تھا جنھیں وہ بڑی جدوجہد سے ہی ایک دوسرے سے الگ کر پایا تھا۔ کہرے کی برفیلی پھوار کی زد میں آ کر اُس کی ٹھوڑی پر برف کی شفاف اور ٹھوس داڑھی کا طول عرض اور وزن بتدریج اور مسلسل بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔۔!

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ رفیق شاہین نے ترجمہ نگاری کے فن، اُس کے مقتضیات اور خاص کر انگریزی لفظیات و تراکیب کو نہایت احتیاط سے اُردو میں منتقل کر کے نہ صرف انگریزی زبان سے گہری واقفیت کا ثبوت فراہم کیا ہے بلکہ اُردو زبان پر اُن کی دسترس کا بھی بخوبی پتا چلتا ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ رفیق شاہین نے ترجمہ نگاری میں جو کام کیا ہے وہ قابلِ ستائش اور اُردو کی نئی نسل کے لئے مشعلِ ہدایت ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
(ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی، ڈی لٹ)
مکان نمبر ۷، گلی نمبر ۳
فردوس آباد، سنجوان، جموں توی۔۱۸۰۰۱۱

ہمہ جہت قلمکار اور منفرد ترجمہ نگار۔ رفیق شاہین

ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی
زبیدہ ڈگری کالج، جے نگر، پوسٹ بکس نمبر 6
شکاری پور، شیموگہ ۵۷۷۴۲۷ (کرناٹک)

9945462187

ہندوستان ایک قدیم ملک ہے اس لیے اس کی تاریخ وتہذیب بھی بہت ہی قدیم۔ مراقباتی اور داستانی نوعیت کی ہے۔ مراقباتی اس معنیٰ میں کہ یہ دھرتی ابتدا سے ہی روحانیت کا گہوارہ رہی ہے۔ اور داستانی و اساطیری اس معنیٰ میں کہ یہاں روحانی پیشواؤں، اور دیوی دیوتاؤں کے تعلق سے ہزاروں طرح کی کہانیاں اور داستانیں آج بھی رائج ہیں۔ جنہیں لوگ ایک خاص طرح کی عقیدت، حیرت، اور عبرت آموزی وتقدس مآبی کے احساس کے ساتھ سنتے اور سناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ آج بھی ہندوستان کو کہانیوں اور پر اسرار داستانوں کا دیس کہتے ہیں۔ اور یہ بات ہم سبھی جانتے ہیں کہ دراصل انسانوں کی اخلاقی تربیت اور تاریخ وتہذیب کی تنظیم کا فریضہ کہانیاں ہی انجام دیتی ہیں، اس تناظر میں کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کو ایشیا میں اور ایشیا کو دنیا میں ایک خاص طرح کا مقام ومرتبہ حاصل ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایک عرصہ دراز تک ایشیائی ادب اور ایشیائی تہذیب اور ایشیائی علم وعرفان کی خوشبو دنیا کی تہذیب وتاریخ اور ادب کو روشنی، خوشبو، اور حرارت فراہم کرتی رہی، اور ادب کو شعریت کی سحر خیزی سے آسودہ کرتی رہی۔

رابرٹ گریوز نے عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ کرنے کے بعد کہا کہ

''ہم انگریز لوگ تو جانتے بھی نہیں کہ اصل شاعری کیا ہوتی ہے''

سچی بات تو یہ ہے کہ مغرب والے صرف یہی نہیں کہ شاعری کی روح سے ناواقف تھے بلکہ ادب کی روح سے بھی ناواقف تھے۔ چوں کہ مشرق شروع سے روحانیت کا خوگر اور مغرب مادیت کا پرستار رہا اس لیے ان کی زندگی، عقیدے اور ان کے ادب وتاریخ اور تہذیب وثقافت میں بھی بڑا امتیاز نظر آتا ہے۔ مثلاً یوروپ والوں کو روحانی نغموں کی اثر انگیزی اور روحانیت کی تقدس مآبی کا احساس نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ ایشیا کے لوگ فطرت کی پناہ میں جینے کے عادی تھے اور آج بھی بہت حد تک اس روش پر قائم ہیں۔ مگر یوروپ کے لوگ فطرت سے جنگ کے جویا تھے اور آج بھی ہیں۔ اور ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ فطرت سے جنگ کی صفت نے یوروپ کو بہت حد تک فاتح کی شکل میں دنیا میں پیش کیا نتیجہ یہ

ہوا کہ روحانیت کا دم گھٹنے لگا اور مادیت نے ساری دنیا فتح کر لی۔ اور پھر زندگی کی پوری منطق ہی تبدیل ہو گئی۔ چنانچہ جدید دور میں زندگی کو جس کرب والام اور آزمائش سے جوجھنا پڑا اور عقلی فلسفے نے انسان کو جس طرح اندر سے خالی اور تنہا کر دیا اس کی دردناک کہانی بھی یوروپ والوں نے ہی سنائی اور پھر دیکھتے دیکھتے ادب میں آنیوالی ہر طرح کی تبدیلی یوروپ کی مرہون منت بن کر رہ گئی۔ اور ساری دنیا ہر معاملے میں مغرب کی تقلید پر مجبور نظر آنے لگی یہاں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ ایک عرصے تک مغرب اور مشرق کے درمیان واضح تفریق قائم رہا۔ اور دونوں کے ادب اور تہذیب میں بعد المشرقین بھی نظر آتا رہا۔ مگر جب ترجمے کی روایت نے زور پکڑا علم اور تہذیب کا دائرہ کار وسیع ہوا اور ایک زبان کا ادب دوسری زبان میں منتقل ہونے لگا تو ذہنوں پر جمی تعصب و تنگ نظری کی کائی پھٹنے لگی زبان و بیان کا تعلیقی ڈھانچہ ٹوٹنے لگا۔ حرف وصوت کا آہنگ بدلنے لگا۔ اور زمان و مکان کا دائرہ سمٹ کر ایک گاؤں کی تشکیل کا خواب دکھانے لگا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے توہم، عقیدے، اور اساطیر کی پاکیزگی کا تصوّر قریب قریب فنا ہو گیا۔ شک، جسے ام العلوم کہا جاتا ہے نے تقلید کی دیواروں کو ڈھا دیا اور علم وعمل کی روشنی دنیا کے اس کنارے سے اس کنارے تک پھیل گئی۔ اس طرح دنیا کی ہر زبان کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ اس کے ادب نے نئی روشنی اور تازہ ہوا کے جھونکے کا دل کھول کر استقبال کیا اور انسانی تجربے، تخیل، عمل، اور تخلیقی عبادت سے نئے ذائقے کی کشید کا فریضہ انجام دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک نئی تہذیب اور ایک نئی ثقافت نے ساری دنیا کے ادب کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ اور اس کی ثروت مندی میں خوب خوب اضافہ کیا۔

اردو زبان وادب نے بھی خوب صورت ترجمہ نگاری کے ذریعہ اپنے دامن دل کو وسیع کیا اور دوسروں کے بنجر ادبی میدان کو گل و گلزار بنایا اور اس اہم کام میں سیکڑوں اہل قلم حضرات نے اپنی جولانی طبع کا ثبوت پیش کیا۔ ایسے ہی باکمال قلمکاروں میں سے ایک اہم، منفرد، زرخیز، اور تازہ کار قلمکار کا نام رفیق شاہین ہے۔

رفیق شاہین ایک نہایت ہی فعال، متحرک اور ہر پل رواں قسم کے بزرگ نوجوان قلمکار ہیں، وہ عمر کی جس منزل میں ہیں اس منزل میں لوگ آرام میں بھی آرام محسوس نہیں کرتے ہیں مگر رفیق شاہین صاحب کام میں زندگی کا لطف اور انبساط محسوس کرتے ہیں۔ وہ تخلیق و تنقید اور تبصرہ و ترجمہ ہر میدان میں یکساں رفتار سے اپنی شہسواری کا کمال دکھاتے ہیں اور جس طرف بھی نکل جاتے ہیں اپنے قدموں کے انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں، رفیق شاہین صاحب صرف قلمی دنیا کے شہسوار نہیں ہیں وہ عملی دنیا کے بھی بڑے شہسوار اور مخلص انسان اور ایثار و محبت کے روشن مینار ہیں ان کی شخصیت میں دوست داری، شفقت اور محبت نوازی اس طرح رچ بس گئی ہے کہ کسی کو کسی سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان لوگوں پر بھی بڑی محبت سے مضامین لکھتے ہیں جن کی طبعی عمر ان کی تخلیقی عمر سے بھی کم ہے۔ ایسا بزرگ جوان جو اپنی ثمر باری سے ہمیشہ جھکا رہتا ہو اور اپنے پاس آنیوالوں کو سایہ اور پھل فراہم کرتا ہو کسی بھی زمانے میں خال خال ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی یہی معصومیت، بسا اوقات ان کی شخصیت کی تعمیر و

تشکیل کے ان گوشوں کو پس پشت ڈال دیتی ہے جو انہیں ایک بار عب مترجم، ایک علم دوست مبصر، اور ایک پراثر شاعر کے روپ میں انفرادی شناخت بخشتی ہے۔

رفیق شاہین صاحب میری جانکاری کی حد تک انگریزی اور اردو پر یکساں گرفت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی کہانی کو انگریزی سے اردو میں منتقل کرتے ہیں تو اس کہانی کی روح کو مجروح نہیں ہونے دیتے ہیں۔ اس طرح وہ کہانی نہ تو کسی بنجر زمین کا گلاب معلوم ہوتی ہے اور نہ تر و تازہ گلاب تھوہڑ کی شکل اختیار کرتا ہے۔ جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ رفیق شاہین صاحب کو نہ صرف یہ کہ دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہے بلکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ترجمہ کی روح کیا ہوتی ہے۔ اور اسے کس طرح زندہ و تابندہ رکھا جا سکتا ہے۔ چوں کہ میں رفیق شاہین صاحب کی دسیوں ترجمہ کی ہوئی کہانیاں پڑھ چکا ہوں اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی ترجمہ کردہ کہانیوں کا ذائقہ اور لطف ابتدا سے آخر تک قائم رہتا ہے۔

اور دوران مطالعہ نہ تو کہانی کا سرا گم ہوتا ہے اور نہ اس کی روانی پر حرف آتا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی کہانی کا ترجمہ میکانکی انداز میں نہیں کرتے ہیں بلکہ کہانی کی فضا میں ڈوب کر اس کی روح کے ساتھ سفر کرتے ہیں اور پھر ترجمہ میں بھی اس کے دکھ سکھ کو کشید کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے ہیں۔ یوں تو رفیق شاہین صاحب نے مغرب کی کئی زبانوں کی کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ وہ مغرب کی کئی زبانوں کے ماہر نہیں ہیں۔ انہوں نے تمام کہانیاں انگریزی سے ترجمہ کی ہیں۔ انہوں نے پشکن کی کہانیوں کا جو ترجمہ کیا ہے وہ مجھے زیادہ ہی پسند ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب میں چھوٹا تھا تبھی ظ انصاری صاحب کی کتاب الکزینڈر پشکن پڑھ لی تھی، تب سے پشکن سے ایک خاص طرح کی محبت ہوگئی اور اس کی چیزیں میں تلاش تلاش کر پڑھنے لگا۔ ابھی کچھ روز پہلے بزم ادب کشمیر کا خصوصی شمارہ دیکھا جس میں رفیق شاہین صاحب کی ترجمہ کردہ تقریباً سترہ کہانیاں شامل ہیں۔ میں نے اس میں سے بیشتر کہانیاں پڑھ لیں اور عام طور پر میں نے ترجمہ والی لکنت محسوس نہیں کی۔ اس لیے میں بہر حال رفیق شاہین صاحب کی ترجمہ نگاری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ اردو زبان کا بڑا المیہ ہے کہ یہاں ادبی سطح پر ہمیشہ دو تین گروپ سرگرداں رہتے ہیں، اور عام طور پر کوئی مخصوص گروپ ہی ادبی فضا پر چھایا رہتا ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ اس گروپ کا کوئی قلمکار کچھ لکھتا ہے یا ترجمہ کرتا ہے تو اس کی خوبی اس طرح بڑھا چڑھا کر بیان کی جاتی ہے گویا اس نے اگر ترجمہ نگاری کا فریضہ نہ ادا کیا ہوتا تو اردو زبان و ادب پر قیامت ٹوٹ پڑتی۔ مگر جب یہی کام دوسرے گروپ کا کوئی قلمکار کرتا ہے تو لوگ اس پر ناک بھوں چڑھانے اور اس کے کام میں ہزار طرح کے کیڑے نکالنے سے قطعی نہیں چوکتے ہیں۔ مگر جب یہی کام کوئی جینوین فنکار کرتا ہے، یا کوئی ایسا قلمکار کرتا ہے جس کے سر پر نہ حکومت کا ہاتھ ہوتا ہے اور نہ جس کی جیب میں کسی اکادمی کی کرنسی ہوتی ہے اور نہ وہ کسی گروپ کا پرستار اور فرستادہ ہوتا ہے، تو لوگ اس کے کام کو بالکل ہی لائق توجہ نہیں سمجھتے ہیں۔ یہ صورت حال بہت ہی

دل شکن ہے۔اور میں سمجھتا ہوں کہ اسی طرح کی صورت حال کا شکار ہیں رفیق شاہین صاحب اور ان جیسے کئی دوسرے جینوین مترجم لیکن وقت سب سے بڑا فیصل ہوتا ہے۔اور کہنا چاہئے کہ جب وقت کا فیصلہ آتا ہے تو سیکڑوں دانشوروں کے چہرے دھواں ہو جاتے ہیں اور دھول کا پھول آسمان کا تارہ بن جاتا ہے مجھے یقین ہے کہ بہت جلد رفیق شاہین صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔اور ایک زمانہ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرے گا۔فی الحال میں اپنی بات ان کی بے پناہ قوت تخلیق و تحریر اور ہر کس و ناکس سے بے لوث محبت کے سچے جذبے اور درویشانہ شان بے نیازی کے اعتراف پر ختم کرتا ہوں، اللہ ایسے بزرگوں کا سایہ نئی نسل پر تا دیر قائم رکھے۔



رفیق شاہینؔ کے غیر ملکی کہانیوں کے اُردو ترجمے

ڈاکٹر آفاق فاخری (پی۔ایچ۔ڈی)
اُردو لیکچرر، اشرفیہ کالج قصبہ ماھل، ضلع اعظم گڑھ

مشہور و معروف شاعر، ادیب، نثر نگار، نقاد اور ترجمہ نگار جناب رفیق شاہینؔ کے علمی، ادبی اور افسانوی کارناموں کے نقوش اردو زبان و ادب کے عصری منظر نامے میں گویا نصف صدی پر محیط ہیں۔ رفیق شاہینؔ کے یہ ادبی نقوش ان کے سوز جگر سے تابندہ اور درخشندہ ہیں۔ وہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کئے بغیر اپنے علمی و ادبی ارتقائی مراحل میں مسلسل اور تواتر کے ساتھ رواں دواں ہیں ان کی ادبی فتوحات کے تذکرہ کے لئے ایک دفتر درکا ہے۔ شعر، تخلیق، تصنیف، تہذیب اور تدوین کے تناظر میں وہ ایک استناد و اعتبار کا درجہ رکھتے ہیں ملک و بیرون ملک کے تمام موقر جرائد و رسائل میں رفیق شاہین کی شعری و نثری نگارشات اہتمام کے ساتھ نمایاں طور پر شائع کی جاتی ہیں۔

شاعری، نظم نگاری، تخلیقیت، نثر نگاری، مضمون نگاری انشائیہ نگاری کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاری جیسے مشکل فن پر بھی وہ قدرت رکھتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں وہ ایک کثیر المطالعہ شخص ہیں اردو دنیا میں انہیں ایک کثیر الجہت، ہمہ گیر اور مختلف النوع قسم کا فنکار تصور کیا جاتا ہے۔ اُس کا بین ثبوت ان کے انگریزی ادب سے ترجمہ کردہ مشہور معروف افسانہ نگاروں کے مشہور زمانہ افسانے ہیں جن کو افسانوی ادب کے عالمی منظر نامے میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

ترجمہ نگاری ایک مشکل فن ہے چونکہ افسانہ جس زبان سے ترجمہ ہو کر کسی دوسری زبان میں ہوتا ہے ضروری ہے کہ اس زبان کی لسانی اور اصطلاحی روح اس میں موجود ہو صرف لفظی تجسیم عطا کرنا یا لفظی تراکیب کے ترجمے کو لفظی پیکر دینے سے بات نہیں بنتی۔ رفیق شاہینؔ کے ترجمہ کردہ افسانے، تخلیقیت، معنویت اور مقصدیت کے اعتبار سے قاری کو مطمئن اور منبسط کرتے ہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح افسانہ نگاری میں اپنی ایک شناخت اور انفرادیت رکھتے ہیں اسی طرح انہوں نے ترجمہ نگاری میں بھی ایک کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ انہوں نے یوں تو بہت سے افسانوں کے ترجمے کئے ہیں مگر ان کے چند ترجمے کردہ افسانے میرے مطالعہ میں آئے ہیں۔ جس کے مطالعے سے دل والو پر ایک ایسا تاثر قائم ہوتا ہے جس سے مسرت و بصیرت کی کیفیت اور ایک رنگا رنگ فضا کے درمیان ایک دلکش جہان آباد نظر آتا ہے۔

رفیق شاہینؔ کے انگریزی ادب کے مختلف اسلوب و لہجے اور ماحول و مزاج کے افسانہ گاروں

کے کچھ افسانوں کے ترجمے کئے جو اپنی دلکشی، جاذبیت، معنویت اور انفرادیت کے تناظر میں اپنی مثال آپ ہیں۔

جیک لندن کا افسانہ ''شام زندگی''، الیکساندر پشکن کا افسانہ ''نوشتۂ تقدیر''، انتون چیخوف کا افسانہ ''حرافہ'' نکولائی گوگول کا افسانہ ''ایک دیوانے کی ڈائری'' لیو طالسطائی کا افسانہ ''حریت ابلیس''، او ہنری کا افسانہ ''جہان دگر'' نگوئین کانگ ہو آن کا افسانہ ''باؤلی بلا'' میسحو یوٹیم پسلی کا افسانہ ''وحشت دل'' تھامس ہارڈی کا افسانہ ''ٹپس'' وغیرہ دوسری زبان سے ترجمہ ہو کر اردو زبان میں لانے کے بعد بھرپور دلکش، جاذبیت اور تخلیقیت کے مظہر ہیں۔

رفیق شاہین جس طرح اپنی دیگر نگارشات اور تخلیق کے حوالہ سے ایک خاص پہچان رکھتے ہیں اسی طرح ان کے ترجمہ یہ افسانے بھی ایک خاص شناخت اور انفرادیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ ان افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں کیف و انبساط نرگسیت اور جامعیت کے ساتھ دلکشی، رعنائی، دلفریبی اور جوش موجود ہے۔ اسے رفیق شاہین صاحب کا ایک گراں قدر کارنامہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح انہوں نے دیگر اصناف ادب میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے اسی طرح ترجمہ نگاری میں بھی وہ اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں اردو افسانوی ادیب ہیں۔ اُن کے قلم سے بہرحال لائق تحسین و قابل ستائش اضافہ ہوا ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

....



رفیق شاہین بحیثیت ایک معتبر ترجمہ نگار

ڈاکٹر ساحر شیوی (برطانیہ)
47-Sutton Garden-Sundon Park
LUTONBEDS-LU3 3AF(U.K.)

آفاق ادب میں عالمگیر شخصیت اور شہرت مقبولیت کے حامل رفیق شاہین سے ایک دہے سے بھی زیادہ عرصے سے میرا خصوصی تعلق رہا ہے۔ اور نہ صرف فون پر بلکہ علی گڑھ میں ان کے دولت کدے پر بھی مجھے دوبار ڈاکٹر فراز حامدی کے ساتھ ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے۔ ماہنامہ پرواز لندن کے ہر شمارے میں تقریباً دس سال سے میں ان کی تخلیقات شائع کرتا چلا آرہا ہوں۔ وہ اتنے ہندوستان میں بھی مقبول نہ ہوں گے جتنے کہ یہاں یورپی ممالک اور کینیڈا اور امریکہ وغیرہ میں مقبول اور ہردلعزیز ہیں۔

رفیق شاہین نظم ونثر کے ایک ہمہ جہت قلم کار و فنکار ہیں ساتھ ہی وہ ایک ماہر و مشاق ترجمہ نگار بھی ہیں۔ ان کے روسی انگریزی کہانیوں کے ترجمہ اکثر رسائل مں پڑھتا رہتا ہوں۔ علاوہ ازیں میرے ماہنامے پرواز لندن میں بھی ان کے بیرونی ممالک کے شاہکار افسانوں کے ترجمے اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔

رفیق شاہین ترجمے کے عالمی اور معیاری اصول وضوابط کے تطابق وتوافق کو دھیان میں رکھ کر سہل وسلیس سادہ وشگفتہ بے ساختہ و برجستہ اور رواں دواں اسلوب میں بامعنی ترجمے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تراجم پر طبع زاد کا گمان ہوتا ہے۔ سب رس حیدرآباد فنون اور نگاباد اور بیباک مالیگاؤں مہاراشٹر میں ان کے فکشن پر مبنی ترجمے لگاتار شائع ہوتے رہے اور آج بھی ہورہے ہیں۔ یہ ان کی ترجمہ نگاری کا اعجاز ہی تو ہے کہ سہ ماہی بزم ادب کشمیر کے بذات خومترجم مدیر ابن اسماعیل نے بزم ادب کے ۵۰۰ صفحات کو محیط عالمی ادب نمبر میں ان کے شاہکار بیرونی افسانوں کے اٹھارہ ترجموں سے اس خاص نمبر کے وقار وافتخار کو دوبالا کیا ہے اور یہ خاص نمبر ان سے منسوب بھی کیا گیا ہے۔

روسی ادیب دوستوئیفسکی کی ایک کہانی کبھی انگریزی میں پڑھی تھی اس کہانی کے انجام پر میری آنکھیں اشکبار ہو اٹھی تھیں۔ اور اب طول وطویل عرصے کے بعد جب یہی کہانی بعد از طوفان کے زیر عنوان رفیق شاہین کے ترجمے کی صورت میں پڑھی تو کہانی کے اختتام پر مجھ پر رقت طاری ہوگئی درد سے کلیجہ پھٹنے لگا۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ یہ بات بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ رفیق شاہین نہ صرف متن بلکہ متن کی روح اور جذبات واحساسات کو بھی ترجمے کے شیشے میں اُتارنے کا ہنر جانتے ہیں۔ بیرونی ممالک کے شاہکار افسانے کی شاعت پر میں انہیں صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔



رفیق شاہین کا بہترین تحفہ
اُردو والوں کے لئے

ڈاکٹر فراز حامدی
123۔ جے۔ پی کالونی، سیکٹر نمبرا
امانی شاہ روڈ۔ شاستری نگر، جے پور۔ ۳۰۲۰۱۶ (راج)

رفیق شاہین سے میرے دیرینہ مراسم ہیں اور علی گڑھ میں کئی بار ان سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کر چکا ہوں۔ وہ ایک سیدھے سچے انسانیت دوست شخصیت واقع ہوئے ہیں۔ کوئی اگر ان کی جانب ایک قدم آگے بڑھاتا ہے تو وہ کئی قدم آگے بڑھ کر اسے اپنے گلے سے لگالیتے ہیں۔ ان کی بے لوث محبت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ انہوں نے میری ہمہ جہت تخلیقات کے تناظر میں تحقیقی و تنقیدی نوعیت کی کتاب ''ہمہ جہت قلمکار فنکار ڈاکٹر فراز حامدی'' تصنیف کی ہے آٹھ سال کے بعد آج بھی اس کی فرمائشوں کے تقاضوں کا سلسلہ جاری ہے اور میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے پر مجبور ہوں۔ میری ہر عالمی تحریک خواہ اس کا تعلق جاپانی اصناف سخن سے ہو، اُردو گیت سے ہو یا دوہا عالمی تحریک سے انہوں نے میری تقلید میں تخلیقی سطح پر کاندھے سے کاندھا ملا کر میرا بھرطور ساتھ دیا ہے۔ اور متعدد دویا آمیز قدیم و جدید اصناف پر مبنی کتاب ''دوہا دھنک'' پچھلے برس ہی میرے طباعتی ادارے ادبی دنیا پبلیکیشنز جے پور سے شائع ہو کر خراج تحسین وتہنیت قبول وصول کر رہی ہے۔

رفیق شاہین محقق و نقاد افسانہ نگار و ناول نویس اور نقشبند سلسلے کے خلیفہ باجازت ہونے کے علاوہ ایک باتمکنت و باوقار اور معتمد و معتبر ترجمہ نگار بھی ہیں۔ ہندوستانی امریکی اور برطانوی رسائل کی وساطت سے میں بیرونی ممالک کے شاہکار افسانوں پر مبنی ان کے ترجمے بڑے ذوق وشوق سے پڑھتا رہا ہوں۔ انہوں نے جہاں شہرہ آفاق روسی مصنفین لیوطالسطائی، الیکسانڈر پشکن، انتون چیخوف، نکولائی گوگول اور دوستوئیفسکی کے افسانوں کو ترجمے کا لباس فاخرہ زیب تن کرایا ہے وہیں امریکہ کے او۔ ہینری، ڈی۔ ایچ۔ لارینس اور جیک لندن کے شاہکاروں کو بھی اُردو کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ انہوں نے آئرلینڈ کے آسکر وائیلڈ کی کہانی کا بھی ترجمہ کیا ہے اور اٹلی کے بوینیٹم پیلی کے افسانے کا بھی اسی طرح لندن کے چارلس ڈکسن اور تھامس ہارڈی کے علاوہ ویتنامی کہانی کو بھی انہوں نے اردو زبان کا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔ انہوں نے اور بھی بہت سے غیر ملکی ادیبوں کے افسانے اُردو میں ترجمہ کئے ہیں جو تراجم کے اگلے مجموعے کے لئے محفوظ کر لئے گئے ہیں۔

شاہین کو اُردو ہندی کی طرح انگریزی پر بھی کماحقہ عبور حاصل ہے اور وہ تھوڑی بہت روسی زبان بھی جانتے ہیں۔ زبان کی سادگی و شگفتگی بے ساختگی و برجستگی اور سیل بلا کی سی روانی قاری کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ترجموں پر طبع زاد کا گمان ہوتا ہے۔ وہ اصل متن سے تطابق و توافق کا اپنے ترجمے میں پورا خیال رکھتے ہیں۔ ''بیرونی ممالک کے شاہکار افسانے'' کی اشاعت پر میری دلی مبارکباد قبول ہو۔

عرض مترجم

جب میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا تبھی سے مجھے غیر ملکی ناول افسانے پڑھنے کا چسکا پڑ چکا تھا۔ محظوظ کرنے والے افسانے مجھے ترغیب دیتے تھے کہ بذریعے ترجمہ اس جمالیاتی کیفیت و مسرت میں اُردو کے قارئین کو بھی شامل کروں۔ لیکن اعتماد اور حوصلے کی کمی آڑے آجاتی تھی۔ پھر بعد مدت غالباً ۲۰۰۴ میں چیخوف کی ایک مختصر کہانی کا بلاتحریک ہی ترجمہ کرڈالا جو ''شرافت کا المیہ'' عنوان سے ماہنامہ سب رس حیدرآباد میں اولین مقام پر شائع ہوا اور اسی طرح تقریباً ایک درجن افسانوں کے ترجمے سب رس میں لگاتار شائع ہوتے رہے۔ پھر میں ماہنامہ فنون اورنگ آباد سے جڑ گیا اور پھر برسوں اس رسالے میں ہر ماہ ترجیحی طور پر پہلے نمبر پر میرے افسانوی ترجمے شائع ہوتے رہے۔ سہ ماہی بزم ادب کشمیر کے مدیر ابن اسماعیل بھی ہر شمارے میں شکریے کے ساتھ میرے ترجمے شائع فرماتے رہے اور ۵۰۰ صفحات کو محیط بزم ادب کے عالمی ادب نمبر میں انہوں نے نہ صرف بیک وقت میرے ۱۸/عدد ترجمے شامل خاص نمبر کئے بلکہ یہ خاص نمبر میرے نام منسوب بھی فرمایا۔ احمد عثمانی مدیر ماہنامہ بیباک بھی برسوں سے میرے افسانوی ترجمے لگاتار شائع فرمارہے ہیں اور آنے والے بیباک کے افسانہ نمبر کے لئے انہوں نے مجھ سے سات ملکوں کی کہانیوں کے ترجمے فرمائش کرکے وصول کئے ہیں۔ نذیر فتحپوری بھی اپنے سہ ماہی اسباق میں میرے ترجمے شائع فرماتے رہتے ہیں اور انہوں نے مجھ پر جو اعزازی گوشہ شائع فرمایا تھا اس میں میرے ترجمے بھی شامل کئے تھے۔ ان کے علاوہ کائنات کولکاتا بزم سہارا نوئیڈا محفل صنم دہلی تمثیل توازن مالیگاؤں، وقار ادب، ٹانڈہ شیرازہ کشمیر افق ادب ہزاری باغ عکس ادب اورنگ آباد جیسے تیس چالیس رسائل کے علاوہ امریکہ، لندن، جرمنی، اسپین اور سوئیڈان سے شائع ہونے والے رسائل کے توسط سے بھی بیرونی ممالک میں میرے ترجموں کو بنظر استحسان دیکھا گیا ہے۔

آج ترجمہ زندگی وقت اور ادب کے اہم ضرورت ہے۔ اگر ترجمہ نہ ہوتا تو مغرب کے لوگ آج غالب، ٹیگور، مولانا روم اور خسرو کے نام سے بھی واقف نہ ہوتے۔ ترجمہ بین الاقوامی اتحاد میں معاونت کرتا ہے۔

ترجمہ کرتے وقت میں نے ژاک دریدے کے اصول وضوابط کی پیروی و پابندی کو بہر طور ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ دریدے کا فرمان عالیہ یہ ہے کہ ترجمہ الفاظ کا نہیں خیال کا ہونا چاہیئے۔ اور ترجمہ نہ صرف خارجی مظاہر کا بلکہ کرداروں کی حرکات وسکنات ان کی فطرت ونفسیات، جذبات واحساسات مسرت محبت نصرت کرب و کسک سبھی کا ہوبہو ترجمہ ہونا چاہیئے اگر طبع زاد متن کا المیہ منظر قاری کو رُلا دیتا ہے تو ضروری ہوجاتا ہے کہ ترجمے کا قاری بھی اس منظر سے متاثر ہوکر آنسو بہانے پر مجبور ہوجائے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو اسے ترجمہ نگار کی نااہلی سے تعبیر کیا جائے گا۔ جملے گن کر ترجمہ کرنا بھی غلط

ہے ترجمے میں الفاظ اور جملے کم وبیش ہوسکتے ہیں۔ البتہ معنیاتی مقصد مرکزی خیال یا کہانی کا انجام بدلنے کی ترجمہ نگار کو بالکل بھی اجازت نہیں ہے اگر ترجمے کے پیراگراف پڑھ کر ایسا محسوس ہو کہ ترجمہ نگار نے موقع محل کی مناسبت سے جہاں جو لفظ درج کردیے ہیں وہ اپنی جگہ اٹل اور مکمل ہیں اور ان کا بدل دوسرے الفاظ میں ممکن ہو ہی نہیں سکتا تو بلا مبالغہ یہ ترجمہ نگار کی خاص خوبی ہے جو لائق ستائش ہے۔

میں نے اپنے ترجموں میں ان سبھی باتوں کا خیال رکھا ہے۔ اور زبان کی سادگی وصفائی بے ساختگی وبرجستگی اور روانی کو تراجم میں اوّل تا آخر برقرار رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے ہر ترجمے پر طبع زاد کا گمان ہوتا ہے اور ہر کہانی اپنے تاثر سے قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔

میں شکر گزار ہوں امریکہ کے نقشبند قمر نقوی بخاری برطانیہ کے ساحر شیوی، جرمنی کے اسحاق ساجد کا اور ہندوستانی افسانہ نگار دیپک بدکی، اقبال انصاری اور اقبال سلیم کا نیز ڈاکٹر فراز حامدی، رئیس الدین رئیس، محمد حسنین، صابر ادیب، نذیر فتحپوری، ہارون بی۔ اے احمد عثمانی ابن اسماعیل اور محبت الرحمٰن وفا کا کہ آپ سبھی میرے رفقاء مجھے ان ترجموں کو کتابی شکل دینے کی ترغیب دیتے رہے۔ اور بالآخر اس کام کو انجام دینے کے لئے میں نے کمر کس ہی لی۔

لیکن کتاب شائع کرنا وقت ومحنت طلب ہے جس کے لئے بھاگ دوڑ بھی کرنی پڑتی ہے۔ جو میرے لئے ممکن نہ تھی کہ غیب سے رحمان ُالرحیم نے ڈاکٹر مجیب شہزر کو رحمت کا فرشتہ بنا کر میرے پاس بھیج دیا۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے انہیں بیسیوں بار میرے گھر کمپوزر اور پریس کے چکر لگانے پڑے۔ خدا اُن کا اقبال بلند فرمائے کہ موصوف نے میری خاطر شدید زحمت گوارا کی اور میرے عطا کردہ مسودے کے جواب میں میرے ترجموں پر مبنی دیدہ زیب کتاب ''بیرونی ممالک کے شاہکار افسانے'' ادب سے مجھے پیش کی۔ ان کی مدد سے آگے بھی ترجموں کی مزید دو کتابیں (۱) ''روس برطانیہ اور امریکہ کے شہرہ آفاق افسانے'' (۲) ''مغرب کے ممتاز افسانے اور ناولوں کی تلخیص'' بھی مختصر وقفوں میں منظر عام پر لانا باقی ہے۔

میں صمیم قلب سے سپاس گزار ہوں جناب ڈاکٹر بلراج بخشی، جموں، نقشبند قمر نقوی (امریکہ) ساحر شیوی برطانیہ، مشتاق احمد وانی جموں کشمیر آفاق عالم صدیقی شیموگہ کرناٹک ڈاکٹر آفاق فاخری امبیڈکر نگر اور ڈاکٹر فراز حامدی جے پور کا کہ میری سبھی رفقاء نے میرے افسانوی تراجم کے تناظر میں گرانقدر مضامین ترقیم فرمائے ہیں۔ اللہ ان کو جزائے خیر سے نوازے۔ (آمین)

''رفیق شاہین''

☆......میلون براؤن
☆......رفیق شاہین

ایک جیئس جیک لنڈن کا المناک انجام (امریکی کہانی)

چارمئین کرچ میں ذہانت وفطانت تو نہ تھی جو سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد عام طور پر لڑکیوں میں نظر آتی ہے لیکن اس میں دورائے نہیں کہ اس کا دل محبت کے مقدس جذبات کا گہوارہ تھا اور وہ اپنے چہیتے محبوب جیک لنڈن پر دل وجان سے قربان تھی۔ لکھنا پڑھنا ہر وہ کام جو جیک کو پسند تھا وہ اسے بھی پسند تھا اور یہ بات بھی ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اب تک وہ جتنی بھی خواتین سے ملا تھا چارمئین ان سب میں پرکشش ممتاز اور منفرد خاتون تھی اور بڑی ہی لفریب شخصیت کی مالک تھی۔ وہ بڑی حساس اور دردمند واقع ہوئی تھی۔ وہ جیک سے اکثر ہی کہتی رہتی تھی۔ بیسی تمہاری قانونی بیوی ہے تمہیں اس کے جذبات واحساسات کی قدر کرنی چاہیے۔ اب یہ اور بات ہے کہ جیک نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور اس کے کہے کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

۱۹۰۳ء میں جب کہ جیک لنڈن بحیثیت افسانہ نگار ناول نگار اور مضمون نگار دنیائے ادب میں اپنا لوہا منوا چکا تھا اور اس کا شمار شہرہ آفاق ادیبوں میں ہوتا تھا لیکن اپنی ذاتی زندگی میں اس سے سب سے بڑی حماقت سرزد ہوئی کہ وہ بیسی سے شادی کر بیٹھا جو اس کی دو بیٹیوں کو اپنے ساتھ لے گئی۔ جن کی جدائی کے غم میں اسے خون کے آنسو رونے پر مجبور ہونا پڑا۔ اگر چہ شہرت ہی نہیں اس پر دولت کی دیوی بھی ہر طرح سے مہربان تھی مگر بیٹیوں کو واپس لانے میں اس کی یہ دولت بھی اس کے کسی کام میں نہ آئی۔ وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا جس سے امریکہ کے سبھی اخباروں کو موٹی جلی سُرخیاں جمانے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ سُرخیاں کچھ اس طرح جمائی گئی تھیں۔ ''جیک لنڈن ٹوٹ چکا ہے''...... جیک کی کمر جھک گئی ہے''

''وہ بیٹیوں کی اندھی محبت نے جیک لنڈن کو دیوانہ بنا دیا ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔

ذرائع ابلاغ کے صحافیوں اور افواہ کاروں کو بڑا نادر اور سنہرا موقع ہاتھ لگ گیا تھا اور وہ جیک لنڈن کی شہرت کی آڑ میں خود بھی چمکنے کے لئے قلم کا بے دریغ استعمال کر رہے تھے۔

جہاں تک بیسی سے طلاق کا تعلق ہے تو یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ معاملے کا ہر پہلو نہایت سادہ اور صاف تھا کہ بیسی ایک انتہائی ضدی اور سرکش عورت ہے، دقیانوسی اور پھوہڑ ہے، شوخ اور بھڑکیلا لباس زیب تن کرتی ہے، گھر گرہستی کے نظم ونسق سے بے بہرہ ہے، جیک کے دوستوں کیساتھ حقارت سے پیش آتی ہے، سارے دن بستر سے چپکی رہتی ہے، گھر میں مکھیاں بھنکتی رہتی ہیں جس سے ازدواجی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اور اس گھٹن بھرے ماحول سے بچنے کے لئے اس نے گھر سے دوری اختیار کر لی۔ وہ گھر سے نکل کر سمندری ساحل سے لگے اپنے چھوٹے سے جہاز میں آ کر بیٹھ جاتا وہاں کچھ دیر تو وہ سمندری لہروں کا

نظارہ کرتے ہوئے کہانیوں کے کرداروں اور منظر ناموں پر غور وفکر کرتا رہتا اور پھر ہاتھ میں قلم تھام کر ناول اور افسانے لکھنا شروع کر دیتا۔ اس کی معرکتہ الآرا ناول ''سمندری بھیڑیا'' (THE SEA WOLF) اسی دور کی اس یادگار تصنیف ہے۔

چارمئین سخت تذبذب اور تشویش میں مبتلا تھی کیونکہ ایک طرف وہ جیک کی محبت کے نشے میں سر تک ڈوبی ہوئی تھی دوسری طرف وہ اپنے محبوب کی بیوی بیسی کی دلآزاری کا بھی سبب بننا نہیں چاہتی تھی۔ اب صحیح یا غلط سے قطع نظر چارمئین نے اپنے محبوب جیک کا قرب حاصل کرنے کی غرض سے بیسی سے دوستی گانٹھ لی تھی۔ دوسری طرف جیک لنڈن دل ہی دل میں یہ فیصلہ لے چکا تھا کہ وہ ہر حال میں چارمئین سے شادی کر کے ہی رہے گا کیونکہ جیک کی زندگی میں چارمئین کا وجود ایک بہار آفریں اور عظیم الشان خوشی کا اعلامیہ تھا جو ایک خوشگوار انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا تھا۔

اخباروں کو ہنگامہ بپا کرنے کے لئے ہمیشہ کسی نہ کسی قربانی کے بکرے کی ضرورت درپیش رہتی ہے۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد انہیں یہ قربانی کا بکرا آنا استرانسکی کی شکل میں بالآخر مل ہی گیا۔ کبھی جیک اور آنا استرانسکی کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ قائم رہ چکا تھا۔ بس اسی کو بنیاد بنا کر انکلوں کے سہارے صحافیوں نے اپنا سارا زور قلم استرانسکی کے خلاف صرف کر کے ایک طوفان کھڑا کر دیا بے چاری استرانسکی پر طرح طرح کے الزامات عائد کر کے خوب کیچڑ اُچھالی گئی۔ اخباروں کی سبھی سُرخیاں اس بات پر زور دے رہی تھیں کہ وہ استرانسکی ہی ہے جس نے جیک سے تعلقات مستحکم کر کے جیک اور بیسی کے مابین ان کی ازدواجی زندگی میں زہر بھر دیا ہے۔ جیک نے ان بے بنیاد الزمات کی تردید تو کی لیکن وہ یہ بات گول ہی کر گیا کہ اس کی منظور نظر استرانسکی نہیں بلکہ چارمئین ہے اور ہر حال میں وہ چارمئین سے شادی کر کے ہی مانے گا۔

جیک لنڈن کا ناول ''سمندری بھیڑیا'' لکھ کر مکمل ہو چکا تھا۔ اس سے فارغ ہوتے ہی اس کے سر میں نہ جانے کیا سمائی کہ وہ اپنے جہاز میں سوار ہو کر بحری راستے سے ''کوریا'' کے سفر پر نکل گیا۔ اب اسے اس کی بدبختی ہی کہنا چاہیے کہ روس اور جاپان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ دوران سفر جب کہ وہ ہمہ وقت چارمئین کی سنہری یادوں کے ہجوم میں گھرا رہتا اسے نہ صرف نزلہ زکام نے اپنے پنجے میں جکڑ لیا بلکہ گھٹنے جام ہو جانے سے اس کی ٹانگوں نے بھی صحیح طور پر سکڑنے اور سمٹنے سے انکار کر دیا اور کوڑھ میں کھاج کے مصداق نئی مصیبت اس پر یہ نازل ہوئی کہ جاپان کے بحری بیڑے کے فوجیوں نے چاروں طرف سے اس کا محاصرہ کر کے اسے گرفتار کر لیا۔ بعد میں اس کا کورٹ مارشل کر دیا گیا جس کی رو سے مارشل نے اسے حکم دیا کہ وہ فی الفور اس علاقے کو چھوڑ کر ''سان فرانسکو'' کی طرف نکل جائے۔

سفر سے اس کے واپس آتے ہی عدالت کے ضابطہ کاروں نے بیسی کے پیٹشن کے کچھ عدالتی کاغذات اس کے سپرد کر دیے۔ ان کاغذات میں اس کے آنا استرانسکی سے تعلقات کی توضیح طلب کی گئی تھی۔ جیک فوراً ہی دوڑا دوڑا بیسی کے پاس پہنچ گیا اور اسے ہر طرح یقین دلانے کی کوشش کی کہ استرانسکی سے اس کے کیسے بھی تعلقات نہیں ہیں۔ ادھر بیسیوں امریکی اخبار جن میں اسے استرانسکی کے ساتھ ملوث کیا گیا تھا بیسی کے میز پر پڑے تھے۔ لہذا موجودہ صورتحال میں بیسی کے لئے جیک کے بیان

پر یقین کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ اب مجبور ہو کر جیک کو بتانا ہی پڑا کہ اس کی دوست استرانسکی نہیں بلکہ چارمئین ہے۔ چارمئین کا نام جیک کی زبانی سن کر بیسی پر بجلی سی گر پڑی۔ شدید صدمے سے بے حال ہو کر اس نے اپنا کلیجہ اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ چارمئین جو اُس کی دوست تھی اس سے ایسی دغا کریگی اس نے ایسا کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ فرطِ غم سے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور منہ سے صرف یہی نکلا کہ ''اب تو غدار کی کبھی صورت بھی نہ دیکھونگی۔''

بیسی میں لاکھ برائیاں سہی مگر ایک خوبی بھی تھی کہ وہ اپنی ہم جنسوں کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتی تھی اُس نے وعدہ کیا کہ اس مقدمے میں وہ کسی بھی خاتون کو ملوث کر کے اسے بدنام نہیں کریگی۔ وہ اس بات پر بھی راضی ہوگئی کہ وہ طلاق کے اس مقدمے میں اب کوئی اڑچن کھڑی نہیں کریگی۔ اس نے ایسا ہی کیا جس کے صلے میں جیک نے ''بیڈ ماؤنٹ'' میں ایک مکان تعمیر کرا کے اُس کی چابی بیسی کو سونپ دی اور اس کی کفالت سے متعلق سارے اخراجات اپنے ذمے لے لئے۔ چارمئین کے نام اپنے ایک خط میں جیک نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

''بہت غور و فکر کے بعد یہی راستہ سجھائی دیا لیکن اپنی دونوں بیٹیوں سے جدائی میرے لئے سوہان روح بنی ہوئی ہے۔ اُف! میں اُنہیں کتنا چاہتا ہوں اس کا اندازہ تو مجھے اب ہوا ہے۔ ان سے اڑتالیس گھنٹے دور رہ کر میری جان پر آبنی ہے۔ میرا جینا حرام ہو گیا ہے۔ میں ان کی جدائی کے صدمے سے ٹوٹا جارہا ہوں، ریزہ ریزہ ہوا جارہا ہوں۔''

جیک کا خط پڑھ کر چارمئین بُری طرح مضطرب اور بے قرار ہو اٹھی۔ وہ چہل قدمی کر کے خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی مگر ذرا بھی قرار نصیب نہ ہوا۔ اسے یہ کمرہ قید خانہ محسوس ہو رہا تھا۔ جس میں اس کا دم گھٹا جارہا تھا۔ اُس نے ایسی ہی دگرگوں حالت میں فوراً ہی جیک کے مراسلے کا جواب مراسلے سے دیا اور پھر بدنامی و رسوائی کے تصور سے لرزہ براندام ہو اٹھی کیونکہ باہر ہر طرف افواہوں کا بازار گرم تھا۔ ادھر جیک نے بھی انگارے اگلنے شروع کر دیئے تھے۔ بڑی نازک صورتحال تھی۔ ایک طرف جیک کا بسا بسایا گھر اجڑ چکا تھا اور دوسری طرف اس کی محبت کی کامیابی بھی بڑے غیر یقینی حالات سے دوچار تھی۔

اسی دوران اس کی تازہ ترین ناول ''سمندری بھیڑیا'' نے کامیابی اور مقبولیت کے سارے گذشتہ کارڈ توڑ دیے تھے۔ مگر وہ نقاد ہی کیا جو بال میں کھال نہ نکالے۔ انہیں ناول میں عورت کا مرکزی اور کلیدی کردار پسند نہیں آیا۔ انہوں نے جیک پر الزام لگایا کہ ناول میں ہیروئن کا مرکزی کردار غیر حقیقی، بناوٹی اور مصنوعی ہے اور ایسی عورت کا دنیا میں پایا جانا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ اس پر جیک بری طرح بھڑک اُٹھا۔ اس نے کہا یہ افواہ فروش جہلاً تو تنقید کی پیشانی کا کلنک ہیں کہ حقیقت کے خلاف ان کی بکواس کبھی تنقید کے معیار کو نہیں پہنچ سکتی۔ میں چارمئین کے عشق میں سرتاپر غرقاب رہا ہوں۔ میں نے ناول کی ہیروئن کے روپ میں چارمئین کے ظاہر و باطن کو ہو بہو پیش کیا ہے اور یہ جہلاً مسخرے فرماتے ہیں کہ ایسی عورت دنیا میں ناپید ہے۔ ناول کی ہیروئن غیر حقیقی اور فرضی ہے۔

جیک کو نئی تعمیرات کرانے میں خاصی دلچسپی تھی۔ اُس نے اپنے نجی مسائل حل کرنے کی غرض سے ایک نئے مکان کی تعمیر کا منصوبہ تشکیل کیا اور اسے عملی جامہ پہنانے کی غرض سے ''گلین ایلن''

میں ایک بکاؤ زمین ساٹھ ہزار ڈالر میں خرید لی۔ اب نئے مکان میں منتقل ہو کر جیک اور چارمئین سر سے سر جوڑ کر بیٹھے ساری ساری رات اپنے شاندار مستقبل کے خاکے بنانے میں مصروف رہنے لگے۔ اب محبت کے بندھن میں بندھے ان دو متوالوں کو طلاق کی عدالتی منظوری کا شدت سے انتظار تھا۔ اسی دوران جیک لنڈن اپنے ادبی اور ثقافتی دوروں پر نکل پڑا اور امریکہ کے بڑے بڑے بڑے شہروں میں انعقاد پذیر سیمناروں اور ادبی انجمنوں میں مقالے پڑھتا اور تقریریں کرتا رہا۔ اسے قومی امید تھی کہ یہاں سے واپسی پر جاتے ہی وہ چارمئین سے شادی رچالے گا۔ جس وقت جیک ''یہوٹن ایون'' کی ادبی محفلوں میں شریک تھا چارمئین بھی وہاں اپنی خالہ کے یہاں پہنچ گئی اور اس طرح پردیس میں بھی دو بچھڑے ہوئے دلوں کو ایک دوسرے کا قرب نصیب ہو ہی گیا۔

اور پھر ۱۸ رنومبر بروز سنیچر وہ مبارک دن آ ہی گیا جب عدالت نے جیک کا یہ طلاق نامہ منظور کر لیا۔ جیک نے بلا تاخیر فوراً ہی یہ خوشخبری بذریعے تار چارمئین کو پہنچادی۔ تار میں اس نے اسے یہ ہدایت کی تھی کہ وہ بینوٹن سے روانہ ہو کر فوراً ہی شکا گو پہنچ جائے تا کہ شادی کی رسم کی ادائیگی فی الفور انجام پذیر ہو سکے۔

آج اتوار تھا اور شادی کے دفتر کی تعطیل تھی مگر جیک کو شادی کے کام میں ایک لمحے کی بھی تاخیر گوارا نہ تھی۔ اس نے اپنی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگداشت نہیں کیا اور صبح کا انتظار کئے بغیر رات ہی میں میرج لائسنس کلرک کو بستر سے اٹھا کر اسے دفتر کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے جسٹس آف دی پیس مسٹر گرانٹ کو پہلے ہی اپنے حق میں کر لیا تھا جنہوں نے لائبریری میں ہی عیسائی مذہب کے مروجہ قوانین کے تحت ان دونوں کو رشتہ ازدواج کے بندھن میں باندھ کر ایک کر دیا۔

اور پھر جیسے ہی صبح وہ لوگ خواب غفلت سے بیدار ہوئے اخباروں نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ سبھی اخباروں میں اس شادی کی خبر موجود تھی۔ سبھی اخبار والوں نے تقریباً ایک مزاج کی سُرخیاں جمائی تھیں کہ ''آخر شادی میں اتنی عجلت کیوں؟'' انہوں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی کیونکہ دوسروں کا تو کام ہی پھٹے میں ٹانگ اڑانا ہے۔ مگر منگل کے دن اخبار کے مارننگ ایڈیشن نے یک بیک ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ یہ خبر جب آسمان پر لہرائی ہوئی برق کی طرح جیک اور چارمئین کے اوپر آ کر گری تو دونوں ہی کے چہرے فق پڑ گئے۔ اخبار میں سرخی جلی حروف میں جمائی گئی تھی۔ ''جیک لنڈن'' کی یہ شادی غیر قانونی ہے۔'' مضمون کی باڈی میں وضاحت بھی پیش کی گئی تھی کہ مطلقہ شخص بعد طلاق ایک سال کی مدت گزارنے کے بعد ہی دوسری شادی کا حقدار قرار دیا جا سکتا ہے۔ خبر پڑھ کر جیک اخبار کے نامہ نگاروں پر بری طرح جھلا اٹھا۔ اس نے سینہ ٹھونک کر کہا۔ میں بھی جیک لنڈن ہوں دیکھ لونگا یہ منافقین میرا کیا بگاڑیں گے۔ میں ان فتنہ پروروں سے ذرا بھی خائف نہیں ہوں۔ ہر ریاست میں شادی کے قوانین یکساں نہیں ہیں۔ میں ملک کی ہر ریاست میں جا کر شادی رچاؤں گا اور دیکھوں گا یہ صحافی میرا کیا بگاڑیں گے۔''

چارمئین جس کا چہرا ہلدی ساز رد پڑ چکا تھا اس نے سرد آہ بھر کر اپنا چہرا جیک کے شانے پر ٹکا دیا۔ اس کی تشویش اور اضطراب کی وجہ یہ بھی تھی کہ صحافی ابلاغ نے اس کی کردار کشی کرنے اور اس پر کیچڑ اچھالنے میں کوئی کسر بقایا نہ چھوڑی تھی۔ سبھی اخباروں نے ایک زبان ہو کر جیک کی ازدواجی زندگی کو

تہس نہس کرنے اور میاں بیوی کے درمیان رخنہ انداز ہونے کا حقیقی ذمے دار اسی کو قرار دیا تھا۔ مگر ہر آڑے وقت میں اس کا محبوب جیک اس کے ساتھ تھا اس لئے اس نے اپنے اوپر عائد کئے گئے سبھی سنگین الزامات کو خاموشی کے ساتھ سہہ لیا تھا۔ جہاں تک جیک لندن کا تعلق ہے وہ ایک زبردست عازم اور بلند حوصلہ انسان تھا۔ اس کا ایک منفرد اختصاص تو یہ بھی تھا کہ وہ جو بھی منصوبے تعمیر کرتا انہیں ہر صورت اور ہر حالت میں عملی جامہ ضرور پہناتا تھا۔ اب ذلت ورسوائی کی زندگی سے بچنے کے لئے جو منصوبہ اس نے تعمیر کیا وہ انتہائی عجیب وغریب اور مصائب ومشکلات کو مدعو کرنے والا تھا اور یہ کوئی اور نہیں صرف وہی بنا سکتا تھا اس کا منصوبہ تھا کہ وہ چارمئین کو ساتھ لے کر انسانوں بھری خشکی پر آباد اس دنیا کو الوداع کہہ کر سات سال کے لئے وسیع وعریض سمندروں کی دنیا میں گم ہو جائے گا اور پھر سات سال کی طویل مدت کے بعد جب وہ دوبارہ خشکی پر قدم رکھے گا تو دنیا کے لوگ انہیں فراموش کر چکے ہونگے۔ اس طرح ایک نئے سرے سے انہیں ازسرنو خوشگوار اور پرسکون زندگی بسر کرنے کا سنہرا موقع ہاتھ لگ جائے گا۔ لہٰذا اپنے اس غیر معمولی اور عجیب وغریب منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس ''سوشلسٹ سرمایہ دار'' نے اُس سستے کے دور میں بیس ہزار ڈالر جیسی خطیر رقم خرچ کر کے ایک پینتالیس فٹ لمبا آہنی جہاز حاصل کیا اور اپنی محبوبہ دلنواز چارمئین کو ساتھ لیکر طویل مدتی بحری سفر پر نکل پڑا۔ مگر یہ خواہناک سا الف لیلوی اور طلسمی سفر اتنا آسان نہ تھا۔ اس میں طرح طرح کے مصائب وآلام مشکلیں اور دقتیں پیش آ رہی تھیں مگر آہنی اعصاب کا مالک جیک مصائب کی یلغار سے اتنی آسانی سے پست ہونے والا نہ تھا۔ ادھر چارمئین بھی اس کی ہمت بندھانے اور تقویت بہم پہنچانے میں اپنا کردار برابر نبھاتی رہتی تھی۔ نہ جانے کتنے مقامات پر مچھروں کے غول کے غول کالی گھٹا بن کر ان کے سروں پر چھائے رہے۔ ادھر ملیریائی بخار کالا آبی بُخار اور طرح طرح کی جلدی بیماریوں نے متحدہ طور پر حملہ آور ہو کر انہیں واپس خشکی کی طرف کھدیڑتے میں کوئی بھی کسر بقایا نہیں چھوڑی مگر وہ ان سب کو حقارت سے نظر انداز کرتے ہوئے اپنی ہمت اور دواؤں کے آسرے پر ایک کے بعد ایک سمندر میں اپنی راہ ہموار کرتے ہیں چلے گئے۔

جیک بڑا ذہین وفطین اور خداداد صلاحیتوں کا مالک تھا۔ وہ نہ جانے کب بڑی سُرعت سے ناول اور کہانیوں کے پلاٹ مع جزویات اپنے ذہن میں مرتب کر لیتا تھا اور ہر صبح وہ بڑی مستعدی اور باقاعدگی کے ساتھ ایک ہزار الفاظ کو تحریری شکل دے کر ہی دم لیتا تھا۔ وہ ناولوں اور افسانوں کا ذہن میں محفوظ مسودہ چارمئین کو بولتا جاتا تھا جسے وہ ٹائپ مشین کے ذریعے کاغذ پر منتقل کرتی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے خطوط ٹائپ کرنے کی ذمے داری بھی اس نے قبول کر رکھی تھی۔ جیک کی ہاتھوں ہاتھ لئے جانے والی سفری داستانوں کی تصنیف ''مہماتی کہانیاں'' (THE ADVENTURE) اسی سفر کے دوران لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب کئی ماہ کی مدت میں بڑی عرق ریزی اور جانکاہی کے بعد تصنیف کی گئی تھی۔ اسی دوران اس نے اور بھی کئی مہماتی کہانیوں کو جنم دے ڈالا۔ کربلائے معلّٰی کا سا نقشہ پیش کرنے والی اُس کی معرکتہ الآرا اور شاہکار کہانی ''سفر موت کا قدم قدم'' بھی اسی بحری سفر کی ایک یادگار کہانی ہے۔ اس کی یہ کہانیاں بڑی منفعت بخش ثابت ہوئیں۔ دولت کی دیوی نے اس کے کام سے خوش ہو کر اس پر دولت کی بارش کر دی تھی۔ پیسے کے لحاظ سے جیک کا یہ بحری سفر انتہائی کامیاب ثابت ہوا تھا۔

یہ ۱۹۱۰ء کا سال تھا۔ چارمئین حاملہ ہو چکی تھی۔ جیک کو نہ صرف بیٹے کی بلکہ ایک وارث کی بھی ضرورت تھی۔ اب وہ روز و شبانہ جاگتی آنکھوں سے بیٹے کی آمد کے سنہرے اور مسرت بخش خواب دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ پدرانہ جذبے نے اچانک ہی بیدار ہو کر اس کی ساکت وصامت سی زندگی میں ایک زبردست طوفان برپا کر دیا تھا اور وہ ہمہ وقت ہی ولولوں اور اُمنگوں کے جھولے میں جھولتا رہتا تھا۔ اسکی دلی تمنا تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو تعلیم و تربیت سے آراستہ کر کے اسے ایک اچھا شہری اور بہترین انسان بنائے گا۔ وہ دنیا کی ہر خوشی اس کے قدموں میں ڈال دیگا۔ وہ اکثر ہی کہا کرتا تھا۔ ''میں ایک ایسا بچہ بن کر جیا ہوں بچپن جس کے کبھی قریب ہی نہ آیا۔''

اب بچے کے دنیا میں وارد ہونے کی خوشی میں اس کے ذوق تعمیر کی نس پھر سے پھڑک اُٹھی اور اس نے اپنے دل میں یہ بات اچھی طرح ٹھان لی کہ وہ اب ایک ایسا عظیم الشان محل تعمیر کرے گا جس کی نظیر امریکہ بھر میں ڈھونڈنے سے بھی نہ مل سکے گی۔ یہ محل امریکہ کی تاریخ میں ایک یادگار مانا جائے گا۔ وہ اس عمارت کا نام ''بھیڑیا گھر'' (WOLF HOUSE) رکھے گا۔

۹ر جولائی کو چارمئین نے ایک نحیف و نزار سی بچی کو جنم دیا جو تین دن تک طبی نگہداشت میں رہ کر اپنے مالک حقیقی کو پیاری ہو گئی۔ جیک جو اب تک عرش پر تھا اس حادثے کی دھمک سے فرش پر آ گرا۔ اس کے سارے سنہرے خواب کسی خستہ حال مینار کی طرح لمحہ بھر میں زمین بوس ہو کر چکنا چور ہو گئے وہ دیوانوں کی طرح منہ اُٹھائے ہوئے بحری ساحل پر واقع ایک میخانے میں گھس گیا۔ جہاں بے حساب پی کر خود پر قابو کھو بیٹھا۔ نشے کی حالت میں اس سے عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہونے لگیں اور وہ اول جلول بکنے لگا جو وہاں موجود دوسرے لوگوں کو سخت گراں گزرا۔ انہوں نے جیک کی ٹھکائی کر دی اور میخانے کے اسٹاف نے اسے اٹھا کر میخانے کے باہر پھینک دیا۔

نومولود بچی کی موت سے اس کے دل کو گہرا دھکا لگا تھا جسے وہ مدتوں فراموش نہ کر سکا۔ چارمئین اس کی ڈھال بنی ہوئی تھی جو ہر طرح سے اس کی دلجوئی کرتی رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ زخم کسی حد تک مندمل ہونے کے بعد اس نے ایک اطالوی ماہر تعمیرات انجینئر مسٹر وفورنی کی دیکھ بھال میں ''بھیڑیا گھر'' کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔

چارمئین جیک کو ہر طرح کی فکر و تردد سے دور رکھنے کے لئے اسے گھوڑا سواری، تیراکی، اور سیاحی کے مشاغل میں مصروف رکھتی اور خود بھی سائے کی طرح ہر دم اس کیساتھ رہتی۔ وہ اس کی کہانیاں اور خطوط بھی مستقل مزاجی اور پابندی کیساتھ برابر ٹائپ کرتی رہتی تھی اُس نے اس کی دلجوئی کا پاس ولحاظ کرتے ہوئے اسے اپنی مطلقہ بیوی اور بیٹیوں سے ملنے ملانے کی اجازت بھی دیدی تھی۔ اس نے اب اپنے بچھڑے ہوؤں سے ملنے جانا شروع کر دیا تھا۔ چارمئین کے بہت سے اخباروں کو دیئے ہوئے بیان کے مطابق ''جیک لنڈن ایک ایسا محبت کرنے والا باپ ہے جو تن من دھن سے اپنی بیٹیوں پر قربان ہے۔ اس سے جو بھی بن پڑتا ہے وہ دامے درمے سخنے قدمے ان کے لئے کرتا ہے اور بڑی دریا دلی فیاضی اور سخاوت کیساتھ کرتا ہے۔''

۱۹۱۳ء کو ایکدن یہ جوڑا ''کارمیل'' پہنچا جہاں انہوں نے ''اسٹرلنگ'' کی سیاحت کا بھرپور

لطف لیا۔ یہ زمانہ ان کی خوشیوں کے عروج کا زمانہ ہے کیونکہ اسی سال ''بھیڑیا گھر'' بھی بن کر تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ یہ عظیم الشان محل تقریباً اسی ہزار ڈالر کی لاگت سے تعمیر ہوا تھا۔ جس نے بھی اس محل کو دیکھا بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ واہ رئیس اعظم واہ! سب لوگوں نے اُسے رئیس اعظم ہی کا خطاب دے رکھا تھا۔ لیکن وقت نے ہمیشہ کس کا ساتھ دیا ہے یہ خوشی بھی ایکا ایکی ماتم بن گئی۔

۱۸راگست کو اچانک ہی ایک دیہاتی نے مسٹر فورنی کے کاٹیج پر زور زور سے دستکیں دینا شروع کر دیا۔ یہ وہی فورنی ہے جس کی نگہداشت میں یہ عظیم الشان محل بن کر معرض وجود میں آیا تھا۔ دیہاتی بڑی وحشتناک آواز میں چیخ چلا رہا تھا۔ ''کوئی ہے؟......کوئی؟......آگ لگی ہے......بھیڑیا گھر دھوں دھوں جل رہا ہے۔''

موقع پر تماشائیوں کا اژدہام امنڈ پڑا تھا۔ وہ سب بڑی مایوسی کے عالم میں ''بھیڑیا گھر'' کو فلک بوس شعلوں کی لپٹوں میں گھرا دیکھ رہے تھے۔ محل میں آگ منصوبہ بند طریقے پر لگائی گئی تھی اور ایک ہی وقت میں محل کے ہر گوشے میں آگ کے غضبناک شعلے بھڑک اُٹھے تھے اور اب آگ بجھانے کی کوشش کا نہ کوئی مطلب تھا اور نہ فائدہ۔ جیک لنڈن اور چارمئین دونوں ہی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے محل کے خاکستر میں تبدیل ہونے کا بے زبانی کے ساتھ نظارہ کرتے رہے۔ جیک نے کہا بھی تو بس اتنا ہی کہا۔ ''آگ میرے محل میں لگی ہوئی ہے اور یہ آگ لگانے والا کہیں میں ہی تو نہیں ہوں۔''

جیک لنڈن کی مطلقہ بیوی بیسی اپنی بیٹیوں پر سختی سے نظر رکھے ہوئے تھی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ اپنے شوہر کو تو کھو ہی چکی ہے۔ کہیں اب اس کی بیٹیاں بھی اس کے ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔ اس کی بڑی بیٹی جوان اور چھوٹی بیٹی بیسی بالترتیب تیرہ اور گیارہ سال کی تھیں۔ اپنی ان دونوں بیٹیوں کی رفاقت و محبت حاصل کرنے کی جیک ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ چکا تھا۔ وہ ان کے آگے رویا بھی اور گڑگڑایا بھی کہ وہ اپنے باپ سے نرمی کا سلوک کریں، محبت اور اپنائیت سے پیش آئیں۔ اگرچہ اُن کے باپ کو محل کے جلنے کا حادثہ پیش آ چکا تھا اور ان کی حالت اس وقت کسی پر کٹے زخمی طائر کی سی تھی اس پر بھی ان بیٹیوں کو دل شکستہ باپ کی حالت زار پر ذرا بھی ترس نہ آیا اور وہ اس کی فریاد پر ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوئیں اور وہ محض پتھر کی بے حس و حرکت مورتی ہی بنی رہیں۔ وہ ماں کی سکھائی پڑھائی بڑے مستحکم ارادے والی بیٹیاں تھیں۔ ماں نے باپ کے خلاف زہر فشانی کر کے انہیں مکمل طور پر باپ کے خلاف کر دیا تھا اور اب وہ محض پتھر تھیں جن کے پسیجنے کا اب سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اس کے دل سے نکلی آہ کو الفاظ نے گلے نہیں لگایا۔

''کیا میرا تم سے صرف یہی رشتہ ہے کہ میں تمہاری پرورش کرتا رہوں؟ کیا رفاقت و محبت اور اپنائیت کا کوئی اور رشتہ نہیں ہے؟ یہ کیا ظلم ہے کہ میں تمہیں تار بھیجتا ہوں خط لکھتا ہوں اور تم ان کا جواب تک نہیں دیتیں۔ تم مجھے ایسی عجیب نظروں سے کیوں دیکھ رہی ہو کیا میں تمہیں کوئی عجیب الخلقت مخلوق نظر آتا ہوں؟ خدارا اپنے باپ کی حالت پر ترس کھاؤ اور ایک بار کہہ دو کہ تم اپنے باپ کو چاہتی ہو' باپ سے بے اعتنائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جوان اور بیس دونوں نے ہی اپنے رخ دوسری سمت میں پھیر لئے۔

جیک لنڈن اب پتھر پر گر کر پاش پاش ہوئے آئینے کی طرح ٹوٹ کر ریزہ ریزہ بکھر چکا تھا۔

اب بس ایک چارمئین ہی تھی جو بیساکھی کی طرح ایسے آڑے وقت میں اس کا سہارا بنی ہوئی تھی۔ وہ اس کی دیکھ بھال اس طرح کر رہی تھی جیسے ایک ماں اپنے چھوٹے بچوں کی کیا کرتی ہے۔ جہاں وہ جاتا سائے کی طرح وہ اس کے پیچھے لگ جاتی۔ وہ بطور لیڈی سیکریٹری اس کے ساتھ کام بدستور انجام دیے جا رہی تھی۔

وقت کسی مسافر کی طرح دبے پاؤں اپنا سفر طے کرتا رہا اور جیک لندن چالیس سال کا ہو گیا۔ اب وہ آگ کا بھڑکتا ہوا الاؤ نہیں بلکہ ایک ایسا راکھ کا ڈھیر تھا جس میں اب کوئی چنگاری نہیں تھی۔ غم کی کالی گھٹا جو چھاتے کی طرح اس کے سر پر تنی ہوئی تھی اسے مسرت کے اُجالے سے محروم کئے ہوئے تھی۔ اسے لگتا تھا اس کے قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں اور وہ اب ایک ضعیف نحیف اور نکمے و ناکارہ انسان میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کی بیٹیوں کی بیگانہ وشی، بے مہری اور بے رحمی نے اس کے دل کے لہولہو زخموں کو اب درد آشنا ناسوروں میں متبدل کر دیا تھا۔ اولاد سے محرومی اب اس کا سب سے بڑا دکھ بن چکا تھا۔ دنیا کی ہر شئے اب اس کے لئے بے معنی ہو چکی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اپنی بے درد بیٹیوں اور نومولد بچی کی موت کے تصور سے خود کو آزاد نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ خلوت نشینی کے عالم میں بیٹھے ہی بیٹھے اچانک بڑبڑانے لگتا تھا۔

''میں نے اپنی بیوی بیسی کا دل دکھایا ہے یہ اسی کی سزا ہے کہ آج میری بیٹیاں میرا ہی اپنا خون مجھ سے جدا ہو گیا ہے۔''

اپنی زندگی کی آخری ملاقات میں اُس نے بیسی سے بڑی رقت بھری آواز میں کہا تھا۔

''زندگی کے کسی بھی موڑ پر تمہیں جب بھی میری ضرورت محسوس ہو تم مجھے پکار لینا میں اس وقت اگر دنیا کے آخری سرے پر بھی ہونگا تو دیوانہ وار تمہارے پاس کھینچا ہوا چلا آؤنگا۔'' اس پر بیسی نے الفاظ کا دو دھاری خنجر یہ کہہ کر اس کے کلیجے میں اُتار دیا'' اپنی خوش فہمیاں اپنے ہی پاس رکھئے۔ بیسی کی زندگی میں وہ دن کبھی نہیں آئے گا کہ وہ آپ کے آسرے کی طلبگاری سے اپنی عزت نفس کی پیشانی پر کلنک لگائے گی۔ میں آپ سے ملنے والی زندگی پر موت کو ترجیح دینا زیادہ پسند کرونگی۔''

اور اس طرح اس کے تابوت میں آخری کیل بھی اچھی طرح ٹھونک دی گئی۔ بیسی کی باتوں سے جو اس کے دل پر گزر گئی اس کا ذکر اس نے چارمئین سے کرنا بھی اب ضروری نہ سمجھا اس نے کہا بھی تو بس اتنا ہی کہا۔

''چارمئین! میرا اس ظالم شہر میں رہنا اب ناممکن ہے تم جلدی سے نیویارک کے لئے اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دو۔

۲۲ر نومبر ۱۹۱۶ء کو چارمئین کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھی۔ شب میں واپسی پر جب اُس نے جیک کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو وہ سویا پڑا تھا وہ مطمئن ہو کر اپنی خوابگاہ میں چلی گئی جہاں نیند اس کے انتظار میں تھی۔ بستر پر دراز ہوتے ہی نیند نے اس پر اپنا قبضہ جما لیا۔

اگلی صبح جیک لندن کے جاپانی خادم نے چائے پیش کرنے کے لئے اُسے جب جگایا اور بار بار آواز دینے پر بھی وہ نہ جاگا تو اس کا ماتھا ٹھنک گیا۔ وہ بھاگم بھاگ چامئین کی خوابگاہ میں جا پہنچا اور یہ بات اسے بتا دی۔ ایک انجانی سی دہشت سے چارمئین کا چہرہ فق پڑ گیا اور آنکھوں میں خوف کے سائے

لہرانے لگے۔ وہ ہانپتی کانپتی دوڑ لگاتی جیک کے کمرے میں جا کر اسے جگانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے اس کا نام لے کر بار بار صدا لگائی اور اسے جگانے کے لئے جھنجھوڑا بھی مگر ہر کوشش سعی نا کام بن کر رہ گئی۔ کیونکہ وہ یہاں تھا ہی نہیں۔ وہ تو نہ جانے کب کا اپنا جسم اپنے بستر پر چھوڑ کر سفر آخرت پر جا چکا تھا۔ رات چارمیین نے جسے بستر پر سوتا ہوا دیکھا تھا وہ جیک نہیں تھا اس کی سرد لاش تھی۔

اس نے مارفین سلفیٹ اور ایڑوپین سلفیٹ حلق کے نیچے اتار لیں تھیں اور یہ قدم اُس نے یقیناً بیسی کی زہر افشانی اور بیٹیوں کے ہتک آمیز سلوک سے دل برداشتہ اور مایوس ہو کر اٹھایا تھا۔

وہ اپنی ساری پونجی اور جائداد چارمیین کے نام کر کے مرا تھا۔

چارمیین نے زار و قطار روتے ہوئے اس کی لاش آتشکدے کے سپرد کر دی اور اس کی راکھ اُس پہاڑی پر لے جا کر دفن کر دی جہاں رومان کے قوس و قزحی رنگوں میں رنگی خوشگوار مہکتی مسکراتی ہوئی فرحت انگیز اور مسرت بخش یادگار شامیں اس نے جیک سے ہم آغوش ہو کر گزاری تھیں۔

......☆☆☆......

☆......جیک لنڈن
☆......رفیق شاہین

شام زندگی

''یاکون'' میں چڑھائی کے راستے کو طے کر کے جب اُس نے کنارے کی اونچائی پر قدم رکھا اُس وقت دن سُرمگیں اور سرد تھا۔ حد سے زیادہ سُرمگیں اور سرد ناپتے ہوئے اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ صبح کے نو بجے تھے۔ یہاں سے سلیج (بلا پہیوں کی برف پر پھسل کر چلنے والی گاڑی) کے دھندلے سفری نشانات باریک سی لکیر کی شکل میں عمارتی لکڑی ''اسپروس'' کے جنگل میں ہو کر مشرق میں دور تک چلے گئے تھے۔ لمبی سانس لے کر اُس نے آسمان کا جائزہ لیا۔ وہاں سورج کا نام ونشان تک نہ تھا اور نہ ہی اُس کے طلوع ہونے کے آثار تھے۔ آسمان پر بادل بھی نہیں تھے پھر بھی دن روشن نہیں تھا کیونکہ ریشمیں وسُرمگیں اندھیرے نے ہر شئے کے رُخ پر نقاب ڈال رکھا تھا۔ جس سے دن کا اجلا چہرا سیاہ ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے صورتحال کا اصل ذمے دار سورج ہی تھا جس نے طلوع ہونے میں بڑی غفلت اور لاپروائی سے کام لیا تھا۔ سورج کی عدم موجودگی اس البیلے سیاح کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ سورج کی روشنی سے محروم ایسے تاریک دن اس سے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ سُورج نے شکل نہیں دکھائی تھی اور جنوبی اُفق پر سورج کو نمودار ہونے میں کئی دن لگ سکتے تھے مگر نہ تو وہ سورج سے ناراض تھا اور نہ سیہ پوش ماحول سے ہراساں۔

راہی نے گھوم کر ادھر نظر ڈالی جدھر سے ہو کر وہ یہاں آیا تھا۔ ایک میل چوڑا ''ہاکون'' تین فٹ اونچی برف کے نیچے دبا پڑا تھا۔ تاحد نگاہ بھک سفید برف ہی برف نظر آرہا تھا۔ اٹوٹ اور شفاف ناہموار وسیع میدان جنوب تا شمال اُفق تا اُفق پھیلا ہوا تھا۔ اس ''اسپروس'' کے جنگلی جزیرے میں لمبی برف پر سلیج چلے گئے تھے۔ اور جو نشانات جنوب کی جانب مڑ گئے تھے وہ ایک اہم راستے کے طور پر یہاں سے پانچ سو میل کے فاصلے پر واقع چلکوٹ پاسٹ'' اور ''دایپا'' کے کھاری پانی کے ذخائر تک چلے گئے تھے۔ اسی طرح برفپوش میدان پر منقش یہ نشانات یہاں سے شمال میں ستر میل کے فاصلے پر واقع ''ڈاسن'' تک ہی نہیں بلکہ یہاں سے بھی ایک ہزار میل کے فاصلے پر واقع نلٹیو (NULATO) تک اور مزید آگے ''مائیکل'' تک اور اُس سے بھی آگے مزید ڈیڑھ ہزار میل تک چلے گئے تھے۔

سورج کی عدم موجودگی اور بال سے باریک علامتی راستے کی تنہائی ویرانی اور غیر معمولی خنکی کسی بھی مسافر کو ہراساں اور دل برداشتہ کر سکتی تھی۔ مگر یہ راہی اس سے ذرا بھی متاثر نہیں تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ ایسے موسم اور ماحول کا عادی تھا بلکہ اس لئے کہ وہ پہلی بار اس نئی جگہ آکر موسم سرما سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔

مگر اُس کے ساتھ المیہ یہ تھا کہ دور اندیشی اُسے چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ اُس کی زندہ دلی اور طبیعت کا جوش وخروش اُسے کسی بھی شئے کی طرف ڈھکیل دیتا اور وہ اسے حاصل کرنے کے لئے بے

چین ہو جاتا تھا۔ اشیاء کی ماہیت اور اُن کے اچھے بُرے پہلوؤں کے بارے میں سوچنا اور غور کرنا تو جیسے اُس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اور اب بھی جب کہ وہ سیاحت کے لئے کمپ سے تن تنہا باہر نکل پڑا تھا اُس نے ذرا بھی تو نہیں سوچا کہ صفر سے پچاس ڈگری نیچے کے درجہ حرارت والی غیر معمولی اور کڑاکے کی سردی میں اُس کے لانگ بوٹ موزے، کان پوش اور دستانے کیا اُسے جان لیوا سردی کے حملے سے محفوظ رکھ سکیں گے۔؟

آگے بڑھنے کے ارادے سے مڑتے وقت بے خیالی میں جیسے ہی اُس نے تھوکا ''تڑاخ'' جیسی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ اُس نے قصداً بار بار تھوکا اور ہر بار اُس کے تھوکنے پر اُسے وہی پہلا سا دھماکہ سنائی پڑا۔ اُس نے سوچا برف کا درجہ حرارت کم ہونے کی وجہ سے تھوک آواز کے ساتھ پھٹا ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ تھوک تو ہوا میں ہی پھٹ گیا تھا، آواز کے ساتھ۔ درجہ حرارت کم تھا یا زیادہ اسے اُس کی مطلق بھی پرواہ نہیں تھی۔ اُسے اگر فکر تھی تو بس یہی تھی کہ وہ ''ہینڈرس کھاڑی'' کے بائیں کنارے پر ایستادہ اپنے گرم خیمے میں جہاں اُس کے ساتھ اس کے منتظر ہونگے۔ جلد از جلد پہنچ جائے۔ اُس نے سوچا شام کے چھ بجے تک وہ اپنے کیمپ میں پہنچ جائے گا۔ وہاں یار لوگ آگ کے الاؤ کے سامنے بیٹھے ہونگے اور تازہ گرم کھانا اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ کھانے کے تصور سے ہی اُسے جیکٹ میں ابھرے ہوئے ان بسکٹوں کا خیال آ گیا جو مکھن لگے تھے اور جنہیں اُس نے رومال لپیٹ کر قمیض کے اندر رکھ لیا تھا تا کہ وہ منجمد نہ ہو جائیں۔ وہ کبھی کبھی اس کے شکم کی جلد سے مس ہو کر گدگدی سی پیدا کر دیتے تھے۔

وہ ''یاکون'' میں ''اسپروس'' کے تناور درختوں کے درمیان سے گزر ہی رہا تھا کہ تبھی پاؤں پھسل جانے پر اس کے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ کر ایک گڑھے میں گر گئی۔ اُس نے سوچا سفری ٹارچ گئی تو گئی کم از کم یہی غنیمت ہے کہ اس کا لایا ہوا مختصر کھانا تو محفوظ ہے۔

اُسے قدم بہ قدم آگے بڑھتے ہوئے ایکا ایکی چبھتی ہوئی سردی کا شدت سے احساس ہوا۔ اس نے گرمی پہنچانے کے خیال سے دستانہ بند ہاتھ سے اپنی ناک اور رُخساروں کی ہڈیوں کو گرمی پہنچانے کے خیال سے اچھی طرح رگڑ دیا۔ اگر چہ اس کے چہرے کا بیشتر حصہ اُس کے گھنے گل مچھوں میں چھپا ہوا تھا مگر ناک اور رخساروں کے بالائی اُبھار تو عریاں ہی تھے اور ٹھنڈ سے اُن کا متاثر ہونا عین فطری عمل ہی تھا۔ اپنے پالتو اور چہیتے کتے کو وہ اپنے وطن سے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا اور وہ اس وقت بھی اس کی ایڑیاں سونگھتا ہوا اُس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ یہ ایک بھیڑیا نما ہٹا کٹا سا کتا تھا جو اپنے بھیڑیا بھائیوں سے عادت و خصلت میں ذرا بھی مختلف نہ تھا۔ سردی کتے پر بھی اثر انداز ہو رہی تھی اور وہ بتدریج سکڑتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اُسے احساس ہو گیا تھا کہ باہر نکلنے کے لئے یہ وقت موزوں نہیں تھا۔ موسم کے بارے میں ایک بار کتے کا مالک دھوکہ کھا سکتا تھا مگر حساس دم ہوتے ہوئے کتے سے غلطی سرزد ہو جانا تو ممکن ہی نہ تھا۔

زیرو سے ۳۲ ڈگری نیچے کا درجہ حرارت نقطہ انجماد کو پہنچا ہوا مانا جاتا ہے۔ جب کہ پچاس ساٹھ پنسیٹھ اور ستر ڈگری نیچے کا یہ درجہ حرارت سردی کو شدید سے شدید تر کر دینے والا تھا۔ اس سردی کو جتنا ایک انسان محسوس کر سکتا ہے کتا نہیں کر سکتا کیونکہ کتا تھرمامیٹر کے استعمال سے واقف نہیں ہے۔ ویسے بھی انسان کے مقابلے میں کتا کم تر درجے کا شعور رکھتا ہے۔

کہرے کی شکل میں برف کے ذرات کتے کے چہرے اُس کی تھوتنی اور پلکوں پر جم گئے تھے۔ اور اب یہی منجمد نمی سانسوں کے ذریعے اس کے اندر بھی سمائی جا رہی تھی۔ ٹھیک اسی طرح مسافر سیاح کی سرخ داڑھی اور مونچھوں پر بھی برف جم گئی تھی۔ وہ جو بھی سانس خارج کرتا اس کے سانس کی نمی فوراً ہی برف میں تبدیل ہو کر اس کی داڑھی مونچھ سے چپک کر چہرے پر وزن کی طرح لد کر رہ جاتی۔ یہاں تک کہ تمباکو چباتے ہوئے جو زرد لعاب بہہ کر ٹھوڑی پر آ گیا وہ بھی منجمد داڑھی کو رنگ دینے کے ساتھ اس کے وزن میں اضافے کا سبب بن گیا۔ اتنا ہی نہیں اس منجمد لعاب نے اس کے دونوں لبوں کو بھی باہم یکجا کر دیا تھا جنہیں وہ بڑی جدوجہد سے ہی ایک دوسرے سے الگ کر پایا تھا۔ کہرے کی برفیلی پھوار کی زد میں آ کر اس کی ٹھوڑی پر برف کی شفاف اور ٹھوس داڑھی کا طول وعرض اور وزن بتدریج اور مسلسل بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

وہ جنگلی درختوں کے درمیان مسطح برف پر مستقل مزاجی سے مسلسل آگے بڑھتے ہوئے کئی میل کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ راستے میں اُس نے آنے والی حبشی سردار کی حویلی کو بغور دیکھا تھا اور اُسے ایک منجمد ندی سے بھی ہو کر گزرنا پڑا۔ وہ جان گیا تھا کہ یہ ہینڈرسن (HANDERSON) کی کھاڑی تھی اور یہاں سے اس کا ٹھکانہ یا منزل مقصود تقریباً دس میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ صبح کے دس بجے تھے۔ وہ چار میل فی گھنٹے کے حساب چل رہا تھا۔ اس حساب سے اُسے ساڑھے بارہ بجے فورک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اُس نے سوچا اب وہ شام کے چھ بجے آگ کے روشن الاؤ کے پاس بیٹھ کر طبیعت سے لنچ لے گا۔

کتا بڑا بے چین نظر آ رہا تھا۔ وہ اُس کے آگے بار بار آ کر کچھ زیادہ ہی دُم ہلا رہا تھا۔ برف پر سلیج گاڑیوں کے گزرنے کے نشانات کچھ زیادہ ہی واضح نظر آ رہے تھے۔ جب کہ ان نشانوں پر دس بارہ انچ دبیز برف کی موٹی پرت بھی پڑی ہوئی تھی اور یہ نشان خاصے پُرانے تھے۔ لگتا تھا قریب ایک ماہ سے نہ تو ادھر ہو کر کوئی گاڑی گزری ہے اور نہ ہی کوئی انسان۔ مسافر نے بلا سوچے سمجھے اپنی چلنے کی رفتار برقرار رکھی ویسے بھی سوچنے کے لئے اُس کے پاس کوئی موضوع ہی نہ تھا سوائے کیمپ پہنچنے اور ساتھیوں کے ساتھ مل بیٹھ کر لنچ لینے کے۔ بولنے بات کرنے کی اُسے اوّل تو کوئی خواہش ہی نہ تھی اور اگر ہوتی بھی تو اس ویران وسنسان برف زار میں تھا ہی کون جس سے وہ بات کرتا۔ لہٰذا ہر شئے سے بے نیاز وہ اپنی ہی دھن میں مگن بڑی لگن سے لگاتار قدم آگے بڑھاتا رہا۔ ساتھ ہی اس کی داڑھی کے وزن اور لمبائی میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ وہ مطمئن تھا کہ دوپہر کے ساڑھے بارہ بجے وہ فورک پر ہوگا اور پھر اس سے آگے کی مسافت طے کر کے شام کے چھ بجے وہ اپنے کیمپ میں بیٹھا ہوگا۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا کہ درجہ حرارت کے حد سے زیادہ گر جانے پر خنکی اپنے نقطہ عروج پر تھی اور مشکل یہ تھی کہ اس حد تک بڑھی سردی کو جھلنے کا اُسے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ لاشعوری طور اپنے دستانہ پوش ہاتھ سے اپنی ناک اور رخساروں کے ابھار کو رگڑنے لگتا تھا تا کہ سردی سے سُن ہو جانے والے اپنے چہرے کے ان حصوں کو گرمی بہم پہنچا سکے۔ پھر جیسے ہی وہ یہ عمل ترک کرتا اس کے چہرے کے یہ حصے فوراً ہی پھر سے سُن ہو جاتے۔ اُسے افسوس ہو رہا تھا کہ سردی سے حفاظت کے بدوبست کئے بغیر اگر اُس نے کیمپ

سے باہر قدم نہ نکالے ہوتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ اس کے رخساروں اور ناک کے اگلے حصے میں رہ رہ کر ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں جو اس بات کی علامت تھی کہ یہ اعضاء ابھی منجمد نہیں ہوئے ہیں۔ یہ بات اسے غنیمت ہی لگی۔ اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔

راہگیر سیاح کا دماغ خیالات سے خالی تو واقعی رہتا تھا لیکن اُس کے محسوسات و مشاہدات اور تحقیق شعور کا جواب نہیں تھا۔ سلیج میں ظہور پذیر ہونے والے تغیر و تبدل اور خدشات و خطرات کی بو اُس نے اچھی طرح سونگھ لی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خاص رفتار سے چلتے ہوئے ایک مقام پر اُس نے چونک کر اپنے قدموں کو کسی اڑیل گھوڑے کی طرح آگے بڑھنے سے روک لیا اور پھر الٹی چال چل کر دس بارہ قدم پیچھے آ گیا۔ اب تک اُس کا یہی خیال تھا کہ بحر منجمد شمالی کے موسم سرما میں جھیل کی تہہ تک برف ہی برف جمی ہوگی اور اس برف میں سیال پانی بالکل بھی نہیں ہوگا۔ مگر ایکا ایکی وہ یہ جان کر چونک اُٹھا کہ اس کا ایسا سوچنا غلط تھا۔ اُس نے دیکھا کہ پہاڑی کے قریب جھیل کی سطح پہ پانی کے بلبلے اُٹھ رہے تھے۔ جو اس بات کی پختہ دلیل تھے کہ جھیل ٹھوس برف کے بالائی پرت کے نیچے پانی کے چشمے رواں دواں تھے۔ یہ پانی کہیں کہیں برف کی بالائی سطح پر بھی بہہ رہا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ پانی کے یہ رواں چشمے محض پالے یا برفیلے کہرے سے منجمد نہیں ہو پاتے ہیں اور یہ بھی کہ کھاڑی کی مجمد بالائی سطح پر چلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہاں قدم قدم پر موت برف کی پرتوں کے نیچے چھپی بیٹھی ہوئی تھی۔ ان زیریں خفتہ پانی کے چھوٹے بڑے تالابوں پر ٹھوس برف کی چھت کہیں تین فٹ کہیں تین انچ اور کہیں کہیں تو محض نصف ہی انچ موٹی واقع ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں کہیں پر تو بالائی سطح ہی پھسپھسی تھی اور کہیں پر پانی کے یہ تالاب تہہ بہ تہہ بھی تھے جو جھیل کی منجمد بالائی سطح سے نظر آتے تھے۔ کھاڑی کے برف کے چٹخنے کی آواز کے ساتھ قدم نیچے کی طرف دھنستے سے محسوس بھی ہوئے تھے اور خوف سے اُس کا چہرا زرد بھی ہو گیا تھا۔ اُس کو ڈر تھا کہ کچی برف میں دھنس اور نیچے بیٹھے پانی میں اگر اس کے پاؤں بھیگ گئے تو فوراً ہی اُس کے پاؤں پر برف کی پرتیں جم کر اُسے مصیبت میں مبتلا کر سکتی تھیں۔ ایسی صورتحال میں ایک ہی تدبیر اس ناگہانی مصیبت سے نجات کا ذریعہ بن سکتی تھی اور وہ تھی آگ کا الاؤ روشن کرنا۔

اُس نے رک کر کھاڑی کی سطح اور اُس کے کناروں کا بغور جائزہ لیا تو پایا کہ کھاڑی کے بائیں جانب پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا۔ اُس نے دستانہ پوش ہاتھ سے ایک بار اپنی ناک اور رخساروں کی ہڈیوں کو رگڑا اور بائیں جانب قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ بڑی احتیاط سے پھونک پھونک کر کچھ یوں قدم آگے بڑھا رہا تھا جیسے کہ تار پر چل رہا ہو۔ برف کی سطح کی مضبوطی کو اچھی طرح جانچ لینے کے بعد ہی وہ اپنا اگلا قدم آگے بڑھاتا تھا۔

اگلے دو گھنٹے میں اسی محتاط انداز میں سنبھل سنبھل کر چلنے کے دوران نہ جانے کتنے برف پر بچھے پھانسنے والے جالوں اور زیر سطح پانی کے مقبرون سے آباد آبی قبرستانوں سے بچ بچ کر اُسے گزرنا پڑا تھا۔ دراصل جہاں برف کی بالائی پرت کمزور ہوتی وہاں زیریں منظر خود بخود نمایاں ہو کر خطرے کا احساس دلا دیتا تھا۔ آگے کا راستہ اور بھی خطرناک تھا اور کہیں نہ کہیں غچہ کھانے کا خطرہ پوری طرح لاحق تھا۔ اس سے بچنے کے لئے اور آگے کے راستے کو جانچنے اور آزمانے کے لئے اُس نے اپنے کتے کو آگے جانے کا

اشارہ کردیا۔ کتا اس کے لئے راضی نہیں تھا۔ وہ دو قدم تو آگے بڑھا اور خطرے کی بو سونگھ کر فوراً ہی واپس بھی آ گیا۔ راہی کا موڈ بگڑ گیا۔ اُس نے اُسے جبراً آگے کی طرف ڈھکیل دیا۔ وہ تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ زوردار برف چٹخنے کی آواز سنائی دی اور کتا برف کی دلدل میں دھنسنے لگا مگر فوراً ہی زبردست پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بلند چھلانگ کے ذریعے وہ محفوظ مقام پر پہنچ گیا اور پھر بوجھل قدموں سے چلتا اور دم ہلاتا ہوا اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ کتے کی اگلی پچھلی ٹانگیں پانی میں بھیگ گئی تھیں اور جو پانی اس کی ٹانگوں پر لگا تھا وہ ٹھنڈ سے اسی وقت منجمد ہو کر برف بن گیا تھا۔ کتے نے اپنی ٹانگوں پر چڑھی برف کی پرتوں کو زبان سے چاٹ چاٹ کر پگھلانا شروع کردیا اور پنجوں کی گائیوں میں پھنسے برف کو باہر نکالنے کی کوشش میں اس نے اپنے دانت اپنے پنجوں میں ہی گاڑ دیے وہ تو اپنی سوچ کے مطابق یہی سمجھا ہوگا کہ اس کے پنجوں میں گھسا کوئی دشمن اسے ایذا پہنچا رہا ہے لہٰذا غصے سے پاگل ہو کر اس نے اپنے پنجوں کو ہی کاٹ کھایا تھا۔ حقیقت کی تہہ تک کتا بھلے ہی نہ پہنچا ہو مگر اس کا مالک اچھی طرح جان چکا تھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ اور کیسے ہوا۔؟ لہٰذا اس نے ایک ہاتھ کا دستانہ اُتار کر اپنے ہاتھ سے کتے کی ٹانگوں پر چڑھی برف کی پتلی سی پرت دور کر کے اُسے اس مصیبت سے نجات دلا دی۔ اس کام کو انجام دینے میں بمشکل ایک ہی منٹ ہوا ہوگا کہ اس کا ہاتھ سن ہو گیا اور اس میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ اس نے بڑی سُرعت سے دستانہ پہنا اور ہاتھ کو گرمی پہنچانے کے لئے جلدی سے ہاتھ اپنے جیکٹ کے اندر گھسیڑ لیا۔

بارہ بجے کا وقت تھا۔ دن نسبتاً روشن ہو گیا تھا۔ اگرچہ سورج یہاں سے ہزار ہا میل دور جنوبی اُفق کو روشن کئے موسم سرما کا جشن منا رہا تھا۔ غالباً سورج اور خلیج ہینڈرسن کے درمیان دھرتی پہاڑ بن کر حائل ہو گئی تھی۔ مسافر کھلے آسمان کے نیچے کھڑا تھا اور ہینڈرسن اس کی پرچھائیں سے بھی محروم تھی۔ ٹھیک ساڑھے بارہ بجے تھے اور وہ کھاڑی کے اہم مقام ''فورک'' تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اُسے خوشی بھی کہ اس کے متعینہ رفتار نے اس کا ساتھ دیا تھا اور اب اُسے یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ چھ بجے شام کو وہ کیمپ میں بیٹھا اپنے دوستوں کو اپنی سیاحت کی روداد سنا رہا ہوگا۔

بھوک کے مارے اُس کی آنتوں میں چوہے دوڑ لگا رہے تھے۔ ناقابل برداشت بھوک سے مجبور ہو کر اُس نے دائیں ہاتھ کو دستانے کی قید سے آزاد کر کے جیکٹ اور قمیض کے بٹن کھول کر لنچ لینے کے لئے رومال باہر نکالا اور پھر بٹن لگا لئے۔ اس کام کو انجام دینے میں بمشکل ایک چوتھائی ہی منٹ ہی صرف ہوا ہوگا کہ اس مختصر ترین وقفے میں ہی اس کے ہاتھ کی انگلیاں بُری طرح سُن رہ گئیں۔ سُن ہاتھ کو گرمی پہنچانے کے لئے اس نے تقریباً پندرہ بار اپنے ہاتھ کو اپنی جانگھ پر مارا اور پھر لنچ لینے کے ارادے سے قریب ہی گرے پڑے ایک درخت کے تنے پر بیٹھ گیا۔ اُسے حیرت اس بات پر تھی کہ جانگھ پر ہاتھ ٹپکنے کے فوراً بعد اُس کے ہاتھ میں اُٹھنے والی شدید ٹیسوں کا سلسلہ یکلخت ہی موقوف ہو گیا تھا اور اب اُس کا یہ ہاتھ نسکٹ کھانے کے عمل میں مددگار ہونے سے عاری تھا۔ اس لئے اس ہاتھ کو اس نے ایک بار اور جانگھ سے ٹکرانے کے بعد پھر سے دستانے میں قید کردیا۔ پھر دوسرے ہاتھ کا دستانہ اتارنے کے بعد جب اُس نے نسکٹ کھانے کی کوشش کی تو ہونٹوں پر جمی برف کی پرت نے اس کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اصل میں غلطی اُس سے یہ ہوئی کہ برف پگھلانے کے لئے وہ آگ روشن کرنا بھول گیا تھا۔ اپنی حماقت پردہ

مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور جب وہ خود پر ہنس رہا تھا اسے ایکا ایکی محسوس ہوا کہ دستانے سے آزاد ہاتھ کی انگلیوں میں سنسناہٹ دم بہ دم بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اسے اب یہ بھی یاد آ گیا کہ ببول کے کانٹوں جیسی یہ چھبن سب سے پہلے اس کے پاؤں کے انگوٹھوں میں شروع ہوئی جس کا احساس اُسے چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے لگاتار ہوتا رہا تھا جسے ٹھنڈ کی وجہ سے سُن ہو جانا مان کر اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔

اُس نے جلدی سے ہاتھ پر دستانہ چڑھایا اور فوراً ہی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر وہ اس وقت تک چہل قدمی کرتا رہا۔ جب تک کہ پاؤں کے انگوٹھوں میں پھر سے دردیلی چھبن نہ لوٹ آئی۔ اس کا خوف کہ پاؤں جم تو نہیں گئے اب دور ہو چکا تھا۔ اسے وہ محض ٹھنڈا کا اثر مان کر کسی حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔ ''سلفر کریک'' (SULPHUR CREEK) کی نواحی بستی میں جو کہ مسافر کا وطن مالوف بھی ہے وہاں جب کسی بزرگ ہستی نے اُس سے اس خطے کی شدید سردی کی بابت ذکر چھیڑا تو اُس نے اس کی بات کو قہقہے میں اُڑا دیا تھا مگر اب یہاں کی بے پناہ سردی کو ذاتی طور پر بھگتنے کے بعد اسے یقین کامل ہو گیا تھا کہ اس کا کہا ایک دم صحیح تھا۔

اب وہ نہ صرف پاؤں ٹپک ٹپک کر چل رہا تھا بلکہ زور زور سے ہاتھ بھی جھٹکتا جا رہا تھا اور وہ ایسا اُس وقت تک کرتا رہا۔ جب تک کہ اُس کے ہاتھ پاؤں میں گرمی نہ آ گئی۔ پھر اُس نے ماچس کی تیلی سے آگ روشن کرنے کا کاروائی شروع کر دی۔ دراصل پچھلے موسم کے پانی کے تیز بہاؤ نے درختوں کی شاخوں چھوٹی چھوٹی ٹہنیوں اور پتوں کا ایک بڑا ذخیرہ یہاں ایک جانب اکٹھا کر دیا تھا۔ پہلے اُس نے سوکھے پتوں اور چھوٹی چھوٹی ٹہنیوں کو دیا سلائی دکھائی اور جب وہ روشن ہو گئیں تو ان پر بڑی بڑی لکڑیاں بھی قرینے سے چُن دیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آگ کا ایک الاؤ روشن ہو گیا جس کی حرارت سے اس کے چہرے پر جمی برف پگھل کر آپ ہ آپ دور ہو گئی۔ اب اُس نے بسکٹوں سے اپنے شکم کی آگ کو بھی ٹھنڈا کر دیا۔ موسم کی دیوانی سردی کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ آگ کے بھڑکتے شعلوں کے حصار وامصار میں قدم رکھ سکے۔ اس مقام پر آگ کی اہمیت اور اُس کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ کتے نے بھی آگ کے پہلو میں خوشی خوشی خوب لوٹ لگائی۔ ایسے میں اُس کے منہ سے جو عجیب وغریب آوازیں نکل رہی تھیں وہ خوشی کا نغمہ معلوم ہو رہی تھیں۔ مسافر نے کھانے سے فارغ ہو کر پائپ مین تمبا کو بھرا اور اسموکنگ کا بھی خوب لطف لیا۔ اس کے بعد۔ ہاتھوں پر دستانے چڑھائے۔ کانوں پر کان پوش فٹ کئے اور پھر فوراً ہی کھاڑی کے بائیں جانب چلے گئے گاڑی کے منجمد نشانات کی رہنمائی میں قدم آگے بڑھا دیے اس کے پیچھے کتا بھی چل پڑا مگر وہ کچھ بددل سا نظر آ رہا تھا۔ اس کے بار بار پیچھے مڑ کر دیکھنے کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اس کا جی ابھی تک آگ کے الاؤ میں ہی پڑا تھا۔ راہگیر تو صفر سے ستر ڈگری نیچے کے درجہ حرارت والی حقیقی اور کڑاکے کی سردی کو خاطر میں لانے کے لئے تیاری نہیں تھا۔ مگر کتا ٹھنڈ کے تکلیف دہ وجود کو اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ ایسے خطرناک اور جان لیوا موسم میں بجائے کھلے میں گھومنے کے اسے گھر کی چاردیواری میں ہی رہنا پسند تھا۔ اس معاملے میں کتے اور کتے کے مالک کے نظریات میں بعد مشرقین تھا۔ کتا اس بات سے بھی بخوبی واقف تھا کہ اظہار مخالفت پر مالک کے چابک کھانے پڑتے ہیں۔ اسلئے وہ اپنی پسند وناپسند کے اظہار پر مصلحتاً قدغن لگائے ہوئے تھا اور اب اپنے مالک کی ایڑیوں کو سونگھتے ہوئے

وہ بھی مالک کے پیچھے اپنی چال برقرار رکھے ہوئے تھا۔

مسافر کی زرد داڑھی برف کے اضافے سے لحظہ بہ لحظہ طول پکڑتی جارہی تھی اور وہ تمبا کو چباتے ہوئے بڑی مستقل مزاجی سے آگے ہی آگے بڑھتا چلا جارہا تھا۔ اس دوران وہ جو بھی سانس خارج کرتا، اس کے منہ سے برآمد ہونے والی ہوا میں مضمر نمی فوراً ہی سفید پاؤڈر میں تبدیل ہو کر اس کی داڑھی مونچھوں، بھودوں، آنکھوں اور پلکوں پر جم کر رہ جاتی۔ ہینڈرسن خلیج کے اس بائیں کنارے پر منجمد برف کے نیچے آبی قبروں کا گورستان آباد نہیں تھا اور نہ ہی کہیں برفانی سطح پولی یا کمزور تھی اسلئے بلا کسی خدشے کے اور بلا رفتار مدھم کئے وہ بآسانی سفر طے کر رہا تھا۔ مگر ابھی بمشکل نصف ہی گھنٹہ گزرا ہو گا کہ ناگہاں وہ ایک مقام پر بُری طرح غچہ کھا گیا اور ایکا ایکی اس جگہ لڑکھڑا گیا جہاں برف کی سطح پولی یا کمزور ہونے کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ خیر یہ ہوئی کہ پانی کی یہ زیریں قبر زیادہ گہری نہیں تھی۔ پاؤں کے نیچے ٹھوس برف آجانے پر وہ محض گھٹنوں تک ہی پانی میں سما پایا تھا کہ ایک زقند بھر کر پھر سے اُوپر آ گیا اور صحیح جگہ دیکھ کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیا۔

اس حادثے سے اُس کا مزاج برہم ہو گیا۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اپنی قسمت کو دوش دینے لگا۔ وہ جان چکا تھا کہ اب خیمے میں چھ بجے واپسی ممکن نہ ہو سکے گی اب وہ مزید ایک گھنٹہ دیر سے پہنچ پائے گا۔ اُسے آگ کا الاؤ روشن کرنے اور بھیگے ہوئے جسم کے حصوں کو سکھانے کے لئے لازماً وقت درکار تھا۔ ویسے بھی یہ اپنے تحفظ اور سلامتی کے لئے ناگزیر تھا کیونکہ درجہ حرارت حد سے زیادہ گرا ہوا تھا جس سے بھیگی ٹانگوں اور پاؤں پر برف جم جانا یقینی تھا۔

وہ کھاڑی کے اس کنارے کی طرف بڑھ گیا جس کی چڑھائی کو اُس نے سفر کے آغاز میں عبور کیا تھا۔ وہاں بلندی پر پہنچ کر اُسے خشک لکڑیوں کا وہ ذخیرہ نظر آ گیا جو پچھلے سال کے سیلابی بہاؤ کی دین تھا اُس نے اس بات کو دھیان میں رکھ کر کہ آگ کی گرمی سے برف پگھلنے پر آگ بجھ نہ جائے۔ احتیاط سے یہ کام لیا کہ درختوں کے موٹے تنوں سے پہلے برف کے فرش کو پاٹا اور پھر اوران پر کام کی لکڑیوں سے ایک سوکھی چھال کو جیسے ہی جلتی ہوئی تیلی دکھائی وہ کاغذ کی طرح فوراً ہی شعلہ بار ہو گئی۔ اس پر اُس نے گھاس لکڑیوں کے چٹے پر ڈالا فوراً ہی اس آگ کو موٹی موٹی لکڑیوں نے بھی پکڑ لیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آگ کا ایک بڑا الاؤ روشن ہوا اُٹھا۔ اُسے تادیر قائم رکھنے کے لئے اُس نے اُس میں اور بھی لکڑیاں جھونک دیں۔ الاؤ روشن ہو جانے پر وہ مطمئن ہو گیا اور خوف وخطر کے جو تاثرات اُس کے چہرے پر اُبھر آئے تھے وہ اب پوری طرح معدوم ہو گئے تھے۔

وہ الاؤ کے پہلو میں برف کے فرش پر اُکڑوں بیٹھ گیا اور شعلہ بار لکڑی ہاتھ میں لے کر اور بھی نزدیک سے اپنے بھیگے پاؤں اور پچھتر درجے نیچے کے درجہ حرارت کے سرد موسم میں زندہ اور سلامت رہنے کے لئے جسم کا منجمد ہو کر پتھر کی طرح سخت ہو جانا یقینی اور لازمی تھا۔ اس کے اپنے وطن "سلفر کریک" کی نواحی بستی میں کسی تجربے کار بزرگ نے اس علاقے کی شدید سردی کے بارے میں یہ تمام باتیں بتائی تھیں جن پر اُس نے دھیان ہی نہیں تھا مگر اب وہی تمام باتیں عملی طور پر اس کے سامنے آرہی تھیں اور اُنھیں ذاتی طور پر بھگتنا بھی پڑ رہا تھا ساتھ ہی وہ اس کی رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دے رہی

تھیں۔اس کے پاؤں سُن ہو کر حس سے عاری ہو چکے تھے۔اُس نے دستانے پہن لئے۔اس کی انگلیاں بھی سن تھیں۔اس غضب کی بے پناہ سردی میں اس کی سلامتی کا راز اس امر میں مضمر تھا کہ وہ چار میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلتا رہا تھا۔اس سے اس کا دل پمپ کر کے اس کے اندرونی اعضاء سے لے کر اس کے جسم کی بلائی سطح تک خون کو گردش میں رکھ کر اور گرمی پہنچا کر اس کے تن بدن کو سلامت رکھے ہوئے تھا اور اب جیسے ہی وہ رکا اُس کے دل نے خون پھینکنا کم کر دیا جس سے اس کی انگلیاں پاؤں اور جسم کی بالائی سطح خون کی کمی اور سردی کی شدت کے سبب برف کی طرح ٹھنڈی ہو گئی تھی اور پانی میں بھیگ جانے کے سبب ناک اور رخسار کی طرح اُس کے پاؤں بھی بھیگتے ہی سُن ہو گئے تھے۔

اُس نے اپنے لانگ بوٹ سکھائے اور پھر پاؤں کو آگ کی گرمی پہنچاتے ہوئے ہاتھوں سے دبا دبا کر انہیں گرمی پہنانے کی کوشش جاری رکھی۔ٹانگوں پر جمے برف کو تو وہ پہلے ہی اُن سے چھڑا چکا تھا۔آگ کی حیات آفریں حدت و تمازت نے اپنا کام کر دکھایا تھا اور اب وہ خطرے سے باہر تھا اور زندہ و سلامت بھی۔وہ زیرلب مسکرا کر دل ہی دل میں ''سلفر کریک'' کے اس تجربے کار بزرگ کا شکرگزار ہو رہا تھا کہ انہوں نے بڑے کام کی باتیں بتائی تھیں جو اب کام میں آ رہی تھیں۔ان کے سونے کے حروف لکھی جانے کے لائق خاص الخاص نصیحت تو یہ تھی جو قانون کا درجہ رکھتی ہے کہ جب ''کلونڈیکے'' کے منطقے میں پچاس سے نیچے درجہ حرارت ہو تو ایسے خراب موسم میں کسی کو ہرگز ہرگز بھی اکیلے سفر نہیں کرنا چاہیے۔اُس نے اس قانون کی خلافت ورزی کر کے تکلیف دہ حادثوں کی شکل میں نتیجہ بھی بھگت لیا تھا اور تاہنوز ی سفری خطرات سے مکمل چھٹکارا نصیب نہیں ہوا تھا۔مگر اُسے اس بات کا احساس ہی نہیں تھا۔اسے اپنی اولوالعزمی، زندہ دلی، جانبازی اور انفرادیت پر اب بھی فخر تھا اور وہ دوراندیش دانشمندوں اور خیر خواہوں کو عورتوں کا دماغ رکھنے والے کم ہمت بزدلوں میں شمار کر رہا تھا کہ ناگاہ وہ چونک پڑا۔اُسے شدت سے احساس ہوا کہ اُس کے رخسار، کان اور ہاتھوں کی انگلیاں کچھ زیادہ ہی سُن ہو گئی تھیں۔اُس نے انگلیوں کو جنبش دینے کی کوشش کو تو اُسے لگا کہ وہ کوئی بے جان شئے ہیں اور اب تو وہ اُن سے چھوٹی چھوٹی لکڑیاں بھی نہیں پکڑ پا رہا ہے۔

آگ کا الاؤ اب بھی روشن تھا۔لکڑیاں تڑخ تڑخ کر دھوں دھوں جل رہی تھیں اور فضا میں بھڑکتی آگ کے شعلے رقصاں تھے۔اُس کے جوتوں پر بھی برف کی موٹی سی پرت چڑھی ہوئی تھی اور اس کے گھٹنوں تک کے موٹے جرمن موزے تلوار کی فولادی میان جیسے سخت ہو گئے تھے۔اس کے بوٹوں کے لٹکے ہوئے فیتے برف آلود ہو جانے پر آہنی سریوں کی طرح سخت ہو کر ادھر ادھر جھول رہے تھے۔اُس نے سوچا وہ انہیں چاقو سے کاٹ پھینکے۔مگر یہ کام چاقو کے بس کا تو تھا ہی نہیں۔

ناگاہ وہی وہاں ایک اور حادثہ رونما ہو گیا اور یہ اُس کی بھول نہیں بلکہ شدید ترین غلطی کی وجہ سے ظہور پذیر ہوا تھا اور وہ زبردست غلطی یہ تھی کہ اُس نے کھلے میں الاؤ روشن کرنے کے بجائے اسپروس کے تناور اور گھنے درخت کے نیچے روشن کی تھا جس کی شاخوں پر تہہ بہ تہہ برف کے تودے لدے ہوئے تھے۔سب سے بلند شاخ جو برف کے وزن سے لچکی لچکی جا رہی تھی بالآخر وزن نہ سہہ سکی اور جب وہ برف کا بھاری تودہ ساتھ لے کر نیچے کی طرف گری تو ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری شاخ متاثر ہوئی جس

کے نتیجے میں درخت میں زلزلہ سا آ گیا اور برف پر لدی ساری برف زوردار دھماکے کے ساتھ روشن الاؤ کے اوپر آ پڑی جس میں دب کر آگ فوراً ہی سرد ہو گئی اور برف اس آگ کے الاؤ کا مقبرہ بن کر رہ گئی۔

مسافر خوف و دہشت آمیز صدمے سے دم بخود سا ہو گیا۔ اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اُسے لگا جیسے کسی نے اسے سزائے موت کا حکم سنا دیا تھا۔ اس کی نگاہ برف میں مدفون آگ کے بجھے الاؤ سے ہٹ ہی نہیں رہی تھی اُسے پھر سے اپنی بستی کے اُس دانا بزرگ کی یاد آ گئی اور ان کا یہ فرمان عالیہ بھی کہ اوّل تو ایسے خراب موسم میں سفر ہی نہیں کرنا چاہیے اور اگر یہ ناگزیر ہو تو سفر میں کسی ایک کو ہمسفر ضرور بنا لینا چاہیے۔ دوبارہ آگ روشن کرنا مسئلہ تو نہ بنتا۔ اسے لگ رہا تھا کہ بالفرض محال وہ دوبارہ آگ روشن کرنے میں اگر کامیاب ہو بھی گیا تو پاؤں کے انگوٹھوں کا مارا جانا تو تقریباً طے ہی تھا۔ اُس کے حد سے زیادہ سُن ہو جانے والے پاؤں بھی، جب تک کہ دوبارہ آگ روشن نہ ہو خطرے کی ہی حالت میں تھے۔ یہ سب محسوس کر کے اس کے دل پر دہشت سی طاری ہو گئی تھی۔ اسی اضطراب وانتشار کے عالم میں وہ ایک جھٹکے سے فوراً ہی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر دوبارہ کھلے میں الاؤ روشن کرنے کے ارادے سے درختوں کے بکھرے تنوں کو ڈھو کر ان سے برف کو پاٹ دیا اور اُن پر لکڑیاں چُن دیں۔ اس کے بعد ان پر انگلی کے برابر کی لکڑیاں، ٹہنیاں، گھاس پھوس اور خشک پتے بکھیر دیے۔ اس کی انگلیاں کام نہیں کر رہی تھیں۔ اس نے یہ کام دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے ہی انجام دیا تھا۔ زمین سے گھاس پھوس اور سوکھے پتے اُٹھانے میں جو سڑی ہوئی کائی اُس کے ہاتھوں لگ گئی تھی اس کی بدبو سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا مگر یہ وقت اس پر غور کرنے کا نہیں تھا۔ وہ بڑی تندہی اور پھرتی سے اپنا کام کر رہا تھا۔ اُس کا پالتو کتا اسے یہ سب کرتے دیکھ رہا تھا اور مالک کے لئے اس کی آنکھوں سے ترحم کے جذبات چھلک رہے تھے۔

آگ روشن کرنے کے لئے اُس نے "ہرچ" کی سوکھی چھال کا باقی بچا دوسرا ٹکڑا نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اُسے یقین تھا کہ باقی بچی یہ چھال ضرور ہی اس کے پاس محفوظ ہو گی۔ مگر اور اُس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اُس نے مکرر کوشش کی تو ابھری ہوئی جیب سے اُسے اُس کی موجودگی کا یقین ہو گیا۔ اس دوران وہ یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ اس کے دونوں پاؤں لحظہ بہ لحظہ منجمد ہوتے ہی چلے جا رہے تھے۔ یہ احساس بڑا جانگسل اور روح فرسا تھا مگر اپنی غیر معمولی قوت ارادی کو بروئے کار لا کر وہ اس پر غلبہ حاصل کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو گیا تھا۔

اب اُس نے دانتوں کی مدد سے دستانے اپنے دونوں ہاتھوں سے الگ کئے اور قوالوں کی طرح زور زور سے تالیاں بجانے لگا۔ اگر اس وقت اُسے کوئی دیکھ لیتا تو اسے دیوانہ وسودائی ہی سمجھتا۔ وہ عمل جو بیٹھ کر کر رہا تھا اب کھڑے ہو کر انجام دینے لگا۔ پھر تالی بجانا موقوف کر کے تا دیر بازوں کو ہوا میں جھٹکتا رہا۔ اس دوران برف کے فرش پر بیٹھا اس کا کتا اپنی بالوں بھری بھیڑیا نما دم کو ہوا میں لہرا لہرا کر اور اپنے بدن سے ٹکرا ٹکرا کر اپنی ٹانگوں کو گرمی پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا اور اُس کے کان کھڑے تھے۔ مالک کو دیوانوں جیسی عجیب و غریب حرکتیں کرتے دیکھ کر اُس کی آنکھوں تجسس و تحیر کے چراغ جل اُٹھے تھے۔ کتے کو گرم، محفوظ اور مطمئن پا کر اور یہ دیکھ کر کہ فطرت اس کی حفاظت میں سرگرم عمل تھی، اُسے اپنے کتے سے حسد ہونے لگا تھا۔

پھر خدا جانے کب اور اچانک ہی اُسے ایسا لگا کہ اس کے ہاتھوں کی مردہ انگلیوں میں چیونٹیاں سی رینگنا شروع ہوگئی تھیں اور پھر انگلیوں کی یہ جھنجھناہٹ اچانک ہی ببول کے کانٹوں کی سی دردیلی چبھن کا روپ اختیار کر گئی۔ مگر انگلیوں کا یہ درد اور دکھن بڑی مبارک تھی اور اس بات کی علامت بھی کہ اُس کی بے جان انگلیاں پھر سے زندہ ہوگئی تھیں اور اس کی وجہ اُس کا بازو جھٹکنا اور تالیاں بجانا تھی۔ اُس نے سیدھے ہاتھ کا دستانہ اُتار کر جیب سے چھال اور گندھک کی تیلیوں سے بھری ماچس بھی برآمد کر لی۔ مگر انگلیاں داستانے کے باہر پھر سے سن ہو جانے کی وجہ سے ماچس کی ڈبیہ سے ایک تیلی کو گرفت میں لینا مشکل ہو رہا تھا۔ اُس نے مزید کوشش کی تو بیک وقت ساری ہی تیلیاں ماچس کی ڈبیہ سے نکل کر برف پر بکھر گئیں۔ اس نے برف سے ایک تیلی اٹھانے کی ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ اُس کی پھر سے سن اور بے حس ہو جانے والی نیم مردہ انگلیاں انتہائی کوشش کے باوجود نہ تو تیلی کے وجود کو محسوس کر سکیں اور نہ اسے اپنی گرفت مین لے پائیں۔ وہ انتہائی پریشان اور خوفزدہ ہو اُٹھا۔ پاؤں منجمد ہو جانے کی علامتوں نے بھی اسے متوحش کئے ہوئے تھا۔ سُن ہو جانے والے رخسار اور ناک کا تصور بھی، کچھ کم اذیتناک نہیں تھا۔ لیکن ان تمام پریشانیوں کو بالائے طاق رکھ کر اُس نے اپنی ساری توجہ فرش پر بکھری ماچس کی تیلیوں کے گچھے پر مرکوز کر دی۔ نظر کے وسیلے سے بے حس انگلیوں سے کام لینے کی اس نے یہ تدبیر اختیار کی کہ انگلیوں کو تیلی کے دونوں اطراف میں لے جا کر ان کا فاصلہ ختم کر دیا تاکہ ان میں تیلی پھنس جائے۔ مگر یہ اُس کا خیال خام ہی تھا۔ نہ تو انگلیاں ہی قریب ہوئیں اور نہ ہی تیلی گرفت مین آئی۔ اُس نے پھر سے ہاتھ پر دستانہ چڑھا لیا اور پھر دونوں دستانہ بند ہاتھ زور زور سے جانگھ پر مارنے کے بعد اُس نے دونوں ہاتھوں سے فرش پر جھاڑو سی دے کر ہتھیلیوں کی مدد سے تیلیوں کے گچھے کو اُٹھانے کی کوشش کی تو بھیگی ہوئی تیلیوں کے ساتھ کوڑا کرکٹ اور برف بھی اُس کے دستونوں میں چلا آیا اور بات بنی نہیں۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور مزید جدوجہد سے وہ تیلیوں کو برف سے آزادی دلا کر ہتھیلیوں کے درمیان لے آنے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر وہ ہتھیلیوں کو اپنے منہ تک لے گیا اور ماچس کی تیلیوں کے گچھے کو دونوں لبوں کے درمیان دبا لیا حالانکہ بڑی جدوجہد کے بعد ہی برف کی پرت کو توڑ کر دونوں ایک ہوئے ہونٹوں کو الگ کر سکا تھا۔ بہر حال مستقل حوصلے اور جدوجہد کے نتیجے میں وہ ایک تیلی کو باقی تیلیوں کے گچھے سے الگ کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ پھر اس تیلی کو اُس نے اپنی گود مین گرا دیا۔ اب انگلیاں ناکارہ ہو جانے سے اُسے اُٹھانا بھی بڑا سنگین مسئلہ تھا۔ اس نے ایک بار پھر دانتوں کی مدد کو آزمایا تو تیلی من چاہیے زاویے سے تیلی کے مسالے والے سرے کو زور سے جانگھ پر رگڑ کھلائی مگر وہ روشن نہ ہو پائی۔ مگر اُس نے کوشش جاری رکھی اور غالباً بیسویں رگڑ پر وہ ایک خاص آواز کیساتھ روشن ہو ہی گئی۔ اب اُس نے جیسے ہی جلدی سے تیلی شعلے پر سوکھی چھال کو رکھنا چاہا۔ جلتی تیلی کے مسالے کا زہریلا دھواں اس کی ناک کے نتھنوں میں ہو کر اُس کے پھیپھڑوں میں سما گیا۔ اس پر اسے شدید کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور مشکل سے ہی منتشر سانسیں اعتدال پر آ پائیں۔ مگر اسی دوران تیلی دانتوں کی گرفت سے آزاد ہو کر برف پر گرتے ہی بجھ گئی تھی۔

اتنی دیر کی کوشش پر پانی پھر جانے سے اس کا دل ٹوٹ گیا۔ سخت مایوسی کے عالم میں اُسے پھر سے اپنے ہموطن بزرگ دانا کا قول یاد آ گیا کہ اگر درجہ حرارت پچاس سے نیچے ہو اور سفر ناگزیر ہو تو مسافر کو

ہمسفر ضرور ساتھ میں رکھنا چاہیے۔ اسے اس قول کی صداقت پر اب ایمان لانا ہی پڑا۔ زندگی سے وفا نبھانے کی کوشش میں اُس نے اب پھر باہوں کو ہوا میں جھٹکا، زور سز ور سے تالیاں بھی بجائیں۔ ہاتھوں کو جانگھوں پر بھی پھٹپھٹایا مگر کوئی تدبیر کام نہ آئی اور اُس کی ایک نہ چلی۔ اُس کی انگلیاں جیسی بے حس پہلے تھیں ویسی ہی رہیں۔ پھر اچانک ہی کوئی خیال بجلی کی طرح دماغ میں کوندھ جانے پر اُس نے دانتوں کی مدد سے فوراً ہی دونوں ہاتھوں سے دستانے اُتار دیے اور پھر سے تیلیوں کے گچھے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ چونکہ ابھی اُس کے بازؤں کے پٹھے بے جان نہیں ہوئے تھے۔ لہٰذا اُن کی مدد سے تیلیوں کے گچھے کو ہتھیلیوں کے بیچ مضبوطی سے دبا کر اُٹھانے میں وہ بار پھر کامیاب ہوگیا تھا۔ اب اگلا کام تھا تیلیون کو روشن کرنا۔ اب ایک نئی اُمید کے ساتھ اس نے جیسے ہی تیلیوں کے مسالے والے سروں کو جانگھ پر ایک رگڑ کھلائی تقریباً ستر ماچس کی تیلیاں ایک دھماکے کے ساتھ جل کر شعلہ بار ہوا اُٹھیں اور چونکہ ہوا میں ہیجان نہیں تھا اس لے وہ جلتی ہی رہیں۔ اُس نے سر کوتر چھا کر لیا تھا تا کہ تیلیوں کا زہریا دھواں پھر سے پھیپھڑوں میں سما کر مسئلہ کھڑا نہ کردے اور پھر جب وہ برچ نامی درخت کی سوکھی چھال کو دیا سلائیوں کا شعلہ دکھانے میں مصروف تھا کہ ناگاہ ہی اُسے محسوس ہوا کہ اس کے مردہ ہاتھوں میں قوت محسوسہ واپس لوٹ آئی ہے کیونکہ اس کی ہتھیلیون میں اچانک ہی شدید درد جاگ اٹھا تھا اور اُسے گوشت جلنے کی چراند بھی محسوس ہوئی تھی۔ اُس نے گھبرا کر جیسے ہی ہاتھوں پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ اس کی ہتھیلیوں کا گوشت جل رہا تھا۔ مگر درد کی یہ لہریں محض ہتھیلیوں کی بالائی سطح تک ہی محدود تھیں۔ شروع کی معمولی جلن بتدریج فزوں ہوکر شدید درد میں بدل گئی تھی جسے وہ بڑی پامردی سے جھیل رہا تھا۔ سوکھی چھال کو وہ برابر آگ رکھا رہا تھا مگر وہ آگ پکڑ ہی نہیں پا رہی تھی کیونکہ ہاتھ کا شدید درد ٹھیک سے آگ لگانے کے عمل میں آڑے آرہا تھا۔ تکلیف سہنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے لہٰذا جب یہ درد نا قابل برداشت ہوگیا تو اُس نے جھٹکے سے ہاتھ پیچھے کی طرف کھینچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی جلتی تیلیاں اُچھل کر اس کی ہتھیلیوں کی گرفت سے آزاد ہوگئیں اور فوراً ہی برف پر گر کر "چھن" کی آواز کیساتھ بجھ گئیں۔ مگر یہ دیکھ کر کہ سوکھی چھال روشن ہو چکی تھی اس کی خوشی آسمان کو چھونے لگی۔ اُس نے فوراً ہی اس کی لو پر گھاس پھوس اور انگلی برابر چھوٹی چھوٹی لکڑیاں ڈالنی شروع کردیں۔ یہ کام کا ایندھن اُس نے ہتھیلیوں کی مدد سے ہی اُٹھایا تھا۔ بہر حال آگ کو ترقی دینے اور اُسے اُس کے قدموں پر کھڑا کرنے میں وہ بڑی ہوشمندی اور احتیاط سے کام لے رہا تھا کیونکہ آگ کا ہونا ہی زندگی تھا اور نہ ہونا تھا موت۔ وہ چاہتا تھا آگ دم پکڑ جائے تو وہ اس کو لکڑیوں کے چٹے پر ڈالدے تا کہ آگ کا بڑا الاؤ روشن ہوکر زندہ رہنے کا جواز بن جائے۔

ادھر اُس کے جسم کی بالائی سطح پر خون کی گردش میں کمی آجانے سے اسے بار بار کپکپی چھوٹ رہی تھی۔ اس غیر معمولی کپکپاہٹ کی ناگہاں مصیبت نے اُسے خوفزدہ کردیا تھا اور وہ شدت سے محسوس کررہا تھا کہ اس کی جسمانی حالت بتدریج بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ ہر چند کہ صورتحال تشویشناک تھی مگر اُس نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ وہ بڑی توجہ سے آگ کو ترقی دینے میں مصروف تھا اور اُسے یقین تھا کہ کوئی دم میں آگ کا الاؤ روشن ہوجائے گا اور ساری پریشانیاں دور ہوجائینگی۔ مگر ضروری نہیں کہ انسان کا چاہا پورا ہی ہو جائے۔ ناگاہ اُسے ایک اور غیر متوقع حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ ہوا یوں کہ آگ کو جاندار بنانے کے

خیال سے اُس نے جیسے ہی ایک بڑی لکڑی کے سرے کو آگ میں داخل کیا اس لکڑی پر لگا کائی کا ایک چوکور ٹکڑا لکڑی سے الگ ہو کر آگ پر گر پڑا اور اس نے چھوٹی لکڑیوں میں لگے آگ کے ننھے منے شعلوں کو اپنے نیچے پوری طرح ڈھک لیا اور جب گھبرا کر مسافر نے اسے ہاتھ سے ہٹانے کی کوشش کی تو ناگاہ ہی اسے کپکپی چھوٹ گئی جس سے اُس کا ہاتھ بہک گیا اور آن کی آن میں اُس کے ہاتھ کی چوٹ سے جلتی سلگتی لو دیتی ننھی منی لکڑیوں کا شیرازہ ہی بکھر گیا اور وہ دھواں دھواں ہو کر رہ گئیں۔ اُس نے صبر سے کام لے کر اپنی کپکپی پر قابو حاصل کیا اور پھر سلگتی ہوئی لکڑیوں کو پھر سے یکجا کر کے ان مین تال میل پیدا کرنے اور انہیں پھر سے روشن کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر سلگتی ہوئی لکڑیاں شعلہ بار نہ ہو سکیں اور سرد ہو گئیں۔ اس بر کی ناکامی سے اُس کے دل کو گہرا دھکا لگا۔ اُس کے مایوس چہرے پر مردنی سی چھا گئی اور وہ اپنی قسمت کو کوسنے لگا۔ اس نے دیکھا اس کا کتا جو آدھ جلیا الاؤ کے پاس بیٹھا تھا، بڑی عجیب وغریب حرکتیں کر رہا تھا۔ اُچھل کود مچاتے ہوئے کبھی وہ اپنے آقا کو دیکھتا اور کبھی بکھرے ہوئے ننھے منھے الاؤ کو۔ اُسے آگ کے شعلون کی طلب تھی اور وہ بجھے منتشر الاؤ کو دیکھ کر بے چینی کا اظہار کر رہا تھا۔

کتے کو دیکھ کر اچانک ہی بڑا ہولناک سا خیال اُس کے دماغ میں سر اُبھارنے لگا جس کا محرک مہماتی کہانیاں تھیں۔ اُس نے ایسی مہم جویانہ کئی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں جن میں ایسے مہم جوؤں کا ذکر تھا جنہوں نے برفانی برسات میں گھر کر زندہ رہنے کی آس چھوڑ دی تھی۔ پھر منجمد ہو کر مرنے سے بچنے کے لئے انہیں ایک ترکیب سوجھی۔ انہوں نے بچھڑا ذبح کی اور پھر اس کے ڈھانچے میں پناہ گزین ہو کر اپنی جانیں بچائی تھیں۔ اُس نے سوچا جان تو اسے بھی بچانی ہے۔ بچھڑا نہیں تو کتا ہی سہی۔ اگر کتے کے چاک شدہ شکم میں ہاتھ گھسیڑ کر انہیں گرم کرنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر سے آگ کا الاؤ روشن کرنا اس کے لئے ذرا بھی مشکل نہ ہوگا اور پھر جب اُس نے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے ارادے سے آواز دے کر کتے کو قریب آنے کا اشارہ کیا تو نہ صرف کتا بلکہ وہ خود بھی اپنی بدلی ہوئی بھیانک سی بھاری آواز سن کر خوفزدہ ہو گیا۔ یہ لہجہ انسانی لہجے سے قطعاً مختلف تھا جو کتے نے پہلی بار سنا تھا۔ اُس کے حیوانی شعور نے اسے خطرے کا احساس دلا دیا تھا لہٰذا مالک کے قریب جانے میں اُسے ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ دماغ میں کھلبلی مچ اٹھنے کی وجہ سے جسمانی طور پر وہ عجیب وغریب حرکتیں کرنے لگا جو اُس کے خوف و اضطراب پر دال تھا۔ وہ مالک کے بار بار بلانے پر بھی اُس کے قریب نہیں گیا۔ کتے کی نافرمانی اُسے غصہ دلا رہی تھا۔ اُس کے نہ آنے پر اب وہ خود ہی گھٹنوں اور کہنیوں کے بل جیسے ہی اسے پکڑنے کے لئے آگے بڑھا مالک کو کتوں کی طرح چلتے دیکھ کر وہ اور بھی خوفزدہ ہو کر دور چلا گیا۔

مسافر جو اکڑوں بیٹھا تھا اس نے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے لگا اس کے پاؤں قوت محسوسہ سے عاری ہو چکے تھے۔ وہ زمین پر کھڑا تھا مگر لگ ہی نہیں رہا تھا کہ اس کے پاؤں کا زمین سے کوئی رشتہ ہے۔ اس کے پاؤں کسی بھی شئے کے لمس کو محسوس کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے تھے اور اُسے لگ رہا تھا کہ وہ خلا میں معلق ہو کر رہ گیا ہے۔

اُس نے بڑے کرخت لہجے میں کتے کو دھمکی دی کہ اگر وہ کہنا نہیں مانے گا تو وہ اُس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دے گا۔ اب جانور کا خوف اور بھی دوبالا ہو گیا مگر وفاداری کی جبلت سے مربوط اُس کے کتے

پن نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنے مالک کی حکم عدولی کا مرتکب نہ ہو لہٰذا خوف و دہشت سے کانپتے لرزتے ہوئے بھی اپنے مالک کے پاس پہنچ ہی گیا۔ مسافر نے جھٹ اُسے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا مگر وہ اپنے بازوؤں کے حلقے کو اُس پر تنگ نہ کر سکا اور کتا اس کی گرفت سے آزاد رہی رہا۔ اُس کے بازو اور کلائیاں بھی اب سرعت سے منجمد ہوتی جارہی تھیں۔ ہاتھوں کی مردہ انگلیوں سے وہ جانور کا گلا گھونٹنے کے لائق بھی نہیں رہا تھا اس میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ چاقو تھام کر کتے کا کام تمام کر سکے۔ مجبوراً اُسے اپنے وفادار کو زندہ ہی چھوڑ دینا پڑا۔ کتا فوراً ہی وہاں سے کھسک لیا اور پھر چالیس فٹ کے فاصلے سے اپنے مالک کی بشری ذہنیت کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ اپنے ہاتھوں کے معائنے میں مشغول تھا اور اندر ہی اندر اُس کا دل بھاری ہو کر ڈوبتا ہی چلا جارہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا اس کے ہاتھ مفلوج و معدوم ہو گئے ہیں۔ یہ احساس انتہائی مہیب اور اذیتناک تھا۔ اُس پر دیوانگی سی طاری ہوگئی اور وہ بڑے جنونی انداز میں بازوؤں کو ہوا میں جھٹکتا رہا۔ پھر اُس نے اپنے دستانہ بند ہاتھوں سے اپنی جانگھوں کی بھی خوب پٹائی کی۔ پانچ منٹ تک یہ کاروائی لگاتار جاری رکھنے پر اس کے جسم میں خون کا دوران خاصہ تیز ہو گیا اور بالائی جلد میں گرمی آجانے سے کپکپی کی شکایت تو دور ہوگئی لیکن ہاتھ جیسے بے حس اور بے جان پہللے تھے ویسے ہی رہے۔ اُن میں کوئی افاقہ ممکن نہ ہو سکا۔ یہ احساس کہ کلائیوں میں ہاتھ کے بجائے وزنی پتھر لٹکے ہوئے ہیں بڑا ہیبت ناک و دہشتناک تھا۔

اب اس کی دماغی حالت پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اب موت کا مہیب اور اذیت ناک تصور آہنی میخ کی طرح اس کے دماغ میں گڑھ کر رہ گیا تھا۔ یہ جارحانہ و وحشیانہ تصور صرف اس بات تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ یہ معاملہ واقعتاً اور حقیقتاً زندگی اور موت کا معاملہ تھا اور چراغ حیات گل نہ ہونے کی امید کم ہی تھی۔

موت کو اپنے اوپر سوار ہوتے دیکھ کر اس پر بری طرح گھبراہٹ طاری ہوگئی تھی۔ سوچے سمجھے بغیر ہی اُس نے گاڑیوں کے منجمد نشانات کی سیدھ میں کھاڑی کے برفیلی میدان میں تیزی سے دوڑ لگانی شروع کر دی۔ اُس کی تقلید میں کتا برابر پیچھے سے اس کا تعاقب کرتا رہا۔ یہ دوڑ کچھ عجیب ہی نوعیت کی دوڑ تھی اور یہ زندگی و موت کی دوڑ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ میں ایک نیا تجربہ بھی تھی۔ اس دوڑ سے بس اتنا ہی فائدہ ممکن ہو سکا کہ جسم گرم ہو جانے کے دوران وہ ہاتھوں کی انگلیاں، پاؤں کے انگوٹھے اور چہرے کے کچھ حصے بھلے ہی گنوا بیٹھے لیکن جیسے بھی ہو اور کسی بھی طرح وہ یونہی دوڑتا ہوا اپنے خیمے میں پہنچ جائے۔ وہاں اُس کے ساتھی اُسے سنبھالینگے اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ مگر اب کبھی اپنے کیمپ نہیں پہنچ پائے گا کیونکہ درمیان میں طول طویل فاصلہ حائل تھا۔ ادھر کڑاکے کی سردی میں اور بھی اضافہ ہو جانے سے اُس کے سُن ہوئے اعضاء تیزی سے منجمد ہونا شروع ہو گئے تھے اور اس بات کا قوی خطرہ موجود تھا کہ اس کا وجود اس کا سارا جسم سردی کی تاب نہ لا کر اکڑ جائے گا منجمد ہو کر کلہاری سے بھی نہ ٹوٹنے والا پتھر ہو جائے گا۔ موت کے تصور سے تو کوشش کر کے اُس نے نجات حاصل کر لی تھی مگر طرح طرح کے خیالات کی آمد و رفت شروع ہوگئی تھی۔ وہ دوڑ تو رہا تھا مگر دوڑتے ہوئے پاؤں منجمد ہو جانے کے سبب اسے لگ رہا تھا کہ اس کا زمین سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے اور وہ ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ ایسے میں توازن بگڑ جانے

پر گر پڑنے کا خدشہ بھی برقرار تھا۔
اس کا اپنا منصوبہ اور خواب کہ کیسے بھی دوڑ لگا کر وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائے گا اُسے پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ پاؤں کے ذریعے زمین کے لمس کو محسوس کئے بغیر دوڑنا اس لئے مشکل تھا کہ ایسے میں جسمانی توازن کو برقرار رکھنا ممکن نہیں تو دشوار ترین امر تو ضرور ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دوڑتے ہوئے زمین کی موجودگی کا عدم احساس راستے کا رخنہ بنا ہوا تھا اور وہ دوڑ لگاتے ہوئے ڈگمگا رہا تھا، لڑکھڑا رہا تھا اور آخر کار وہ گر ہی پڑا اور پھر جب اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی تو اس سے اُٹھا نہ گیا۔ اُس نے سوچا اُسے اب بیٹھ کر آرام کرنا چاہیے تا کہ تازہ دم ہو کر وہ پھر سے اچھی طرح دوڑ لگا سکے۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد اُسے لگا کہ وہ تازہ دم ہو گیا تھا۔ جسم میں گرمی بھی آ گئی تھی۔ سردی سے اب نہ تو اس کے دانت بج رہے تھے اور نہ ہی جسم کانپ رہا تھا۔ اُسے اپنی چھاتی اور ٹانگوں میں بھی گرم لہریں سی دوڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ یہ خوشگوار تبدیلی اصل میں اُس کے دوڑ لگانے کی وجہ سے تھی اور وہ جو تازگی اور جسم میں فرحت سی محسوس کر رہا تھا وہ جسم میں خون کی گردش تیز ہو جانے کا نتیجہ تھی کہ تن بدن میں حیات آفرین حرارت پیدا ہو گئی تھی۔ مگر جب اُس نے اپنے رخسار اور ناک کو چھو کر دیکھا تو ہاتھ ناک اور رخسار جیسے تھے ہی نہیں اور تھا تو بس فریب نظر ہی تھا۔ اس کی دوڑ اس کے رخسار ناک ہاتھ اور پیروں پر جمی برف کو تو پگھلا ہی نہ پائی تھی۔ یہ بات بھی کہ اُس کے منجمد اعضاء مزید منجمد ہوتے جا رہے تھے اس سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ سب زبردست خطرے کی علامات ہیں مگر وہ خطرے کے منفی اور مہیب احساسات سے خود کو دور ہی رکھنا چاہتا تھا۔ مگر وہ اس تلخ سچائی سے صرف نظر نہیں کر پا رہا تھا کہ اب سے کچھ ہی دیر میں اس کا سارا جسم برف کی منجمد اور پتھر کی ٹھوس سل میں تبدیل ہو جائے گا اور پھر وزنی کلہاڑیوں کی چوٹ بھی اس کا بال بیکا نہ کر پائے گی۔ ہر چند کہ سب کی طرح اُسے بھی زندگی عزیز تھی مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ موت نے اس کے بچ نکلنے کا کوئی راستہ چھوڑا ہی نہیں تھا۔ برفستان کے اس ویران قبرستان میں برف کے کفن میں لپٹی اپنی لاش اُسے صاف نظر آ رہی تھی۔ موت کے تصور نے اس کے دل پر دہشت سی طاری کر دی تھی جس سے گھبرا کر وہ ایک بار پھر دوڑ لگانے لگا تا کہ اپنے جسم کو منجمد ہونے سے محفوظ رکھ سکے۔

جب تک وہ دوڑتا رہا اس کی ایڑیوں کو سونگھتا ہوا اُس کا کتا بھی اُس کے پیچھے دوڑ لگاتا رہا اور دوڑتے ہوئے جب وہ لڑکھڑا کر برف پر ڈھیر ہو گیا تو کتے نے بھی اپنی دم کو رگڑ سے اپنی ٹانگیں گرم کرنی شروع کر دیں۔ وہ اپنے مالک کو بڑی اپنائیت اور دردمند نظروں سے تکے جا رہا تھا۔ اُسے کتے کے فطری طور پر حفاظتی نظام اور اس معاملے میں انسان پر اس کی برتری کو محسوس کر کے اُس پر غصہ آنے لگا اور جب تک کہ کتے نے انکسار اور تعبید اری کے طور پر اپنے کھڑے کان جھکا نہ لئے وہ منہ ہی منہ میں اُسے بُرا بھلا کہتا ہی رہا۔

ایکا ایکی اس کا جسم پھر سے تھر تھر کانپنے لگا اور یہ کپکپاہٹ انتہائی شدید نوعیت کی تھی۔ اُسے بڑی بے رحم شدت سے محسوس ہوا کہ کہرا اس کے رگ و ریشے میں اندر تک سما چکا ہے اور اس کا جسم اندر باہر سب طرف سے بڑی تیزی سے منجمد ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ اس برفستان کے لا محدود قبرستان میں اُس کی زندگی موت سے جنگ لڑتے ہوئے شکست کھا گئی ہے۔ موت جیت گئی ہے اور

وہ ہار گیا ہے۔ اس ہار کو جیت میں بدلنے کے ارادے سے اُس نے ایک بار پھر حوصلہ جتایا اور انجماد سے جسم کو محفوظ کرنے کے لئے وہ ایک بار پھر تیزی سے دوڑنے لگا۔ مگر قریب سوفٹ کی دوڑ کے بعد وہ قلابازی کا کرتب دکھاتے ہوئے پھر سے برف پر ڈھیر ہو گیا اور پھر جب سانس بحال ہوئی تو وہ پھر سے برف پر اُکڑوں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب جب کہ موت ناگزیر ہی ٹھہری تو کیوں نہ با تمکنت و باوقار انداز میں زندگی کا الوداع کہا جائے۔ مگر دلیرانہ حوصلہ مندی اور ہمت وشجاعت کا مظاہرہ کیا جائے تو کیسے کیا جائے؟

یہ بات اس کے فہم وشعور سے بعید تھی۔ موجود صورتحال میں وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا کہ اس کا یہ بقایا جسمانی تھرک کسی گردان کٹے مرغ کے جسمانی تحرک اور بے معنی پھڑ پھڑاہٹ سے ذرا بھی مختلف نہ تھا اور اب برفپوش پتھر کی ٹھوس مورت بن کر لقمہ اجل ہو جانا یقینی تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر زہرخندسی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

ایکا ایکی اس کی جاگتی آنکھیں اسے متضاد نوعیت کے خواب دکھانے لگیں۔ خوشگوار اور ناخوشگوار قسم کے خواب۔ اُس نے دیکھا دوسرے دن اُس کے ساتھی اُسے تلاش کرتے ہوئے یہاں آگئے ہیں اور باری باری اُس سے بغلگیر ہو رہے ہیں اور پھر یہ منظر جیسے ہی دھند میں روپوش ہوتا ہے ایک اور ہی منظر اس کی نگاہوں میں جلوہ گر ہو جاتا ہے اور وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ جو شخص منجمد حالت میں برف پر بے حس وحرکت پڑا ہے۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ وہ خود ہے۔ منظر پھر بدلتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ وہ خیمے میں آگ کے الاؤ کے پاس اپنے یار دوستوں میں گھر انہیں اپنی سیاحت کی سرگذشت مزے لے لے کر سنا رہا ہے۔ پھر پلک جھپکتے ہی سلفر کریک میں واقع اس کی اپنی بستی اُس کے دائرہ نگاہ میں آگئی۔ وہاں وہ دوستوں کی محفل میں گھرا ایک دم صحتمند اور تندرست و توانا حالت میں پائپ میں کش پہ کش لگا کر تمبا کو کا لطف لے رہا تھا اور اپنے سفر کی روداد بھی بیان کرتا جا رہا تھا اسکے ساتھی بڑی حیرت اور توجہ سے اُس کی باتوں کو یوں سن رہے تھے مانو وہ الف لیلیٰ کے دلچسپ قصے بیان کر رہا تھا۔ اسی دوران اسے وہ تجربے کار دانا بزرگ نظر آ گئے جو پچاس سے نیچے کے درجہ حرارت میں سفر نہ کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ وہ فوراً ہی اُن سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''مان گیا باس مان گیا۔ آپ کا فرمایا حرف بہ حرف صحیح تھا۔ آپ کی بات نہ ماننے پر مین نے بہت دکھ جھیلے ہیں۔ نا قابل برداشت تکلیفوں اور اذیتوں کا بارگراں ڈھویا ہے۔''

دھواں چھوڑتے برف کے فرش پر اُکڑوں بیٹھا اور آنکھیں موندے وہ منہ ہی منہ میں نہ جانے کیا کیا بڑبڑائے جا رہا تھا۔ غفلت اور نیم غنودگی کی کیفیت میں دبے پاؤں نیند کا اس کے قریب آنا اُسے بڑا آرام دہ اور سکون بخش محسوس ہو رہا تھا۔

اسکے پہلو میں بیٹھا اُس کا پالتو کتا بڑی بے چینی سے مالک کے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا۔

دن رخصت ہو چکا تھا اور شام گھر آئی تھی۔ شفق پھول رہی تھی۔ جہاں تک نگاہ جاتی برف ہی برف بچھی تھی اور آگ کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔ مسافر دیر سے یونہی بے حس وحرکت بیٹھا ہوا تھا۔ بغیر آگ روشن کئے کسی کا اتنی دیر تک برف پر بیٹھے رہنا کتے کی زندگی کا پہلا اور انوکھا ہی تجربہ تھا۔ شفق پھولنے اور اسکے ساتھ ہی سردی میں مزید اضافہ ہو جانے پر کتا سردی سے پریشان ہو اُٹھا۔ وہ مالک کو نیند

سے بیدار کرنے اور آگ روشن کرانے کے لئے رقص نما عجیب سی اُچھل کود کرنے لگا جو جسم کو گرمی پہنچانے کے لئے بھی تھی اور آقا کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے بھی، اپنی کوشش کو کامیاب بنانے کے لئے اُس نے منہ سے عجیب و غریب آوازیں بھی نکالنی شروع کردیں اور جب اُس کی ان حرکات وسکنات کا مالک نے کوئی اثر ہی قبول نہیں کیا تو اُسے مالک کی ناراضگی پر محمول کرکے اظہار ندامت کے طور پر اس نے اپنے کان جھکا دیئے اور اُداسی سے دم ہلانے لگا۔ وہ پھر سے مالک کے جاگنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ پھر بھی نہیں جاگا۔ اُسے لگا مالک کو ضروری کوئی سانحہ پیش آیا ہے اور وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ مالک کو ابتر حالت میں دیکھ کر کتے کا دل بھر آیا اور وہ بڑی دلدوز اور جگر خراش آواز میں آہ و بکا کرنے لگا۔ پھر ایکا ایکی خاموش ہوکر وہ مالک کے قریب پہنچ گیا اور پھر مالک کی ناک سے ناک ملا کر اُس نے اُس کی موت کو سونگھ ہی لیا۔ مالک کی موت کے خیال سے اُسے بڑے زور کا جھٹکا لگا تھا۔ وہ فوراً ہی وہاں ہٹ کر فاصلے پر جا بیٹھا اور خاموشی سے آنسو بہانے لگا اور جب جذباتی ہیجان اس پر بھی کم نہ ہوا تو سیاہ آسمان کے نیچے جھیل کے برف آلود پختہ فرش پر عجیب وغریب دردیلی آوازوں کے ساتھ دیر ماتمی رقص کرتا رہا اور جب مالک کے لئے نوحہ خوانی کرتے ہوئے ہوئے تھک گیا تو پھر اُس نے گاڑی کے چھوڑے نشانات کی رہنمائی میں اُسی رخ پر دوڑنا شروع کردیا جہاں کیمپ ایستادہ تھا۔

اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اُسے آگ کی گرمی اور خورک مہیا کرنے والے مہربان کہاں ملیں گے۔

......☆☆☆......

☆......الیکسانڈر پشکن

☆......رفیق شاہین

نوشتۂ تقدیر

۱۸۱۱ء کے اواخر کا زمانہ جو روس پر نپولین بونا پارٹ کے حملہ آور ہونے کا زمانہ بھی ہے اور جسے تاریخ عالم کبھی فراموش نہ کر پائے گی، انہیں دنوں زمیندار گاوریلا گاوریلووچ اپنے آبائی قصبے ''نینار ادودو'' میں اہائش پذیر تھے۔ ان کی وضعداری، مہمان نوازی اور نیک چلنی کے ضلعے بھر میں چرچے عام تھے۔ ان کے یہاں پاس پڑوس والوں کا بے روک ٹوک آنا جانا لگا رہتا تھا اور ان کی جام وطعام سے اچھی طرح ضیافت کی جاتی تھی۔ ان میں جو تاش کے شوقین ہوتے تھے انہیں زمیندار کے ساتھ پانچ کوپک فی شخص کے حساب سے ''بوسٹن'' کھیلنے کو موقع بھی میسر آ جاتا تھا۔ کچھ لوگ وہاں اس لئے بھی چلے آتے تھے کہ اُنہیں وہاں زمیندار کی حسین وجمیل بیٹی ماریا گاوریلونا کے دیدار نصیب ہو جاتے تھے۔ ماریا ایک نازک اندام اور دبلی پتلی سی لڑکی تھی جس کے چہرے کے نقش ونگار بڑے دلآویز تھے۔ رنگ کھلتا ہوا تھا اور بڑی بڑی متحرک آنکھیں بھی جادو جگاتی تھیں۔ جنہیں اپنے بیٹوں کے لئے حسین سی دلہن کی تلاش تھی وہ بھی یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔

ماریا گاوریلونا نے فرانسیسی رومانی ناول کثرت سے پڑھے تھے اس لئے اس کے دل میں عشقیہ جذبات کا انگڑائی لے کر بیدار ہو جانا کچھ غیر فطری نہ تھا۔ اس کی نگاہ انتخاب جس نوجوان پر مرتکز تھی وہ خاصہ سرو قد تھا۔ رنگ گندمی تھا اور وہ اُن دنوں اپنے آبائی گاؤں میں آیا ہوا تھا۔ اب یہ بتانا کہ وہ بھی ماریا کی طرح اسے دل وجان سے چاہنے لگا تھا ایسا ضروری بھی نہیں ہے کیونکہ ان کی یہ محبت یک طرفہ نہیں بلکہ دو طرفہ تھی اور دونوں ہی ایک دوسرے کے لئے بے قرار تھے۔ اُن نا تجربے کار محبت کرنے والوں کی محبت کا راز تو فاش ہونا ہی تھا۔ جیسے ہی یہ بات لڑکی کے باپ کو معلوم ہوئی انہوں نے بیٹی کو سخت تنبیہ کر دی کہ آج کے بعد نہ تو وہ اُس کی طرف دیکھے اور نہ ہی اُس سے بات کرنے کی کوشش کرے۔ انہوں نے لڑکے کی آمد ورفت پر بھی اہانت آمیز انداز میں پابندی عائد کر دی لیکن محبت کرنے والوں نے اس روک تھام کا کوئی اثر قبول نہیں کیا اور خفیہ پیغامات کی آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ علاوہ جنگل میں صنوبر کے درختوں کے جھرمٹ اور قدیم چرچ کے ویران کھنڈر میں اُن کا ملنا ملانا بھی بدستور جاری رہا۔ وہاں وہ باہم مل کر اپنے دل بے قرار کا احوال بیان کرتے، آہیں بھرتے، آنسو بہاتے اور قسموں وعدوں کے ذریعے ایک دوسرے کو یقین دلاتے کہ وہ محبت میں کبھی جدا نہ ہونگے۔ ظاہر ہے کہ والدین کی مخالفت، اُن کی پیش بندیوں اور اُن کی پسند وناپسند کو اپنے طور پر دونوں نے ہی مسترد کر دیا تھا۔

موسم سرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس لئے خراب موسم میں گھر سے نہ نکلنے کے سبب اب اُن کی ملاقاتوں کا سلسلہ موقوف ہو چکا تھا۔ البتہ مراسلہ نگاری میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ لڑکا اپنے ہر رقعے میں لگاتار اس بات پر مصر تھا کہ ہمیں گھر سے راہ فرار اختیار کر کے فوراً ہی شادی کر لینی چاہیے۔ مانا کہ والدین

خفا ہو جائینگے مگر کب تک؟ جب تھوڑا وقت گزار کر ہم واپس گھر لوٹ آئینگے تو ان کے دل پگھل ہی جائینگے اور وہ ہمیں ضرور معاف کر دینگے۔

ماریا گاوریلوونا بھی گھر سے فرار ہونے کے نہ جانے کب سے منصوبے بناتی اور رد کرتی چلی آ رہی تھی مگر اُس نے اب جو منصوبہ بنایا تھا وہ اپنی جگہ ٹھوس اور اٹل تھا اور اُسے عملی جامہ پہنانے کا دونوں نے ہی پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ وہ منصوبہ اس طرح تھا کہ فرار کے مقررہ دن وہ سر درد کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں بند ہو جائے گی۔ اُس کے ساتھ اُس کی ہم عمر اور ہمراز خادمہ بھی ہوگی جو ملبوسات پیک کرنے میں اُس کی مدد کریگی اور جب تیاری مکمل ہو جائے گی تو دونوں لڑکیاں شب خوابی کے کمرے کے عقبی دروازے سے باغ میں داخل ہو جائینگی اور پھر احاطے کے پچھلے دروازے سے سڑک پر پہنچ جائینگی جہاں تین گھوڑوں والی گاڑی (TROIKA) اُنہیں تیار کھڑی ملے گی جس میں وہ فوراً ہی سوار ہو جائینگی۔ پھر گاڑی پانچ کوس کا فاصلہ طے کر کے ''زھادرینو'' گاؤں کے چرچ پہنچ جائینگی۔ وہاں اُنہیں ولادیمر کھڑا ملے گا جو اُن ہی کا منتظر ہوگا۔

مقررہ وقت سے قبل ماریا گاوریلوونا ساری رات جاگتی ہی رہی تھی۔ اُس نے الماری سے اپنے ملبوسات نکال کر اُن کو ایک گٹھری میں تبدیل کر دیا تھا۔ کچھ کپڑے اپنی ہمراز کو دے دیے اُس نے بھی اُن کی گٹھری بنا دی۔ اس کام سے فراغت پا کر اُس نے دو وداعی رقعے بھی لکھ دیے۔ ایک رقعہ والدین کے لئے اور دوسرا ایک خاص ہمجولی کے لئے تھا۔ والدین والے رقعے کا آخری جملہ یہ تھا کہ ''اس کی زندگی کا انتہائی پُرمسرت دن وہ ہوگا جب اُس کے والدین انہیں معاف کر کے بیٹی اور داماد کو اپنے گلے سے لگا لینگے۔''

اب وہ اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ نیم غنودگی کے عالم میں اُسے عجیب عجیب منظر نظر آنے لگے۔ کبھی لگتا وہ پکڑی جا چکی ہے اور اس کا باپ اُسے گھسیٹ کر حویلی میں لایا ہے جہاں ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں اُسے قید کر دیا گیا ہے اور کبھی اُسے ولادیمیر کی لہو میں تر بتر لاش گھاس پر پڑی دکھائی دینے لگتی اُس کے دماغ کے پردے پر ایسے ہی ہیبت ناک و ہولناک منظر گردش کر رہے تھے وہ بمشکل اُن پر غالب آ سکی۔ اس کا چہرا انجانے سے خوف سے زرد پڑ چکا تھا ادھر کڑاکے کی سردی بھی کچھ کم تکلیف دہ نہ تھی۔

''یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ کیا ہوا؟...... کیا تم بیمار ہو ماریا؟'' اُس کے باپ نے دریافت کیا۔

''نہیں تو...... میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔'' اُس نے بظاہر مسکراتے ہوئے اور خوش نظر آنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔

شام گھر آئی تھی۔ اس خیال سے کہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ یہ اُس کا آخری دن ہوگا، اس کو اپنا دل ڈوبتا سا محسوس ہوا۔ کھانے کی میز پر بھی خود کار طور پر اُس کا دل ایکا یکی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

''ہاں بیٹی جاؤ۔'' اُس کے باپ نے اُس کی پیشانی کو بوسہ دے کر کہا۔ ''تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔''

شب خوابی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے خود کو کھڑے سے ہی آرام کرسی پر گرا دیا اور خاموشی سے اپنا چہرا اپنے ہاتھوں میں چھپا کر سسکنے لگی۔ اُس کی ہمراز خادمہ نے اُسے تنبیہ کی کہ وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرے ورنہ بڑی مشکل کا سامنا ہو سکتا ہے۔

ساری تیاریاں پہلے ہی مکمل ہو چکی تھیں۔ لہٰذا نصف گھنٹے کے بعد اس نے اپنے ماں، باپ اپنے گھر اور اپنے بچپن کو الوداع کر دیا۔

باہر برفانی ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ آندھی کے تھپیڑوں نے بھیڑیوں کی آواز میں شور و غل مچانا شروع کر دیا تھا۔ پاگل ہوا کے بے لگام جھونکے فولادی پھاٹک اور در و دریچوں سے سر ٹکرا رہے تھے۔ ارد گرد کا اداس ماحول آنے والی کسی نئی نحوست کا اعلان کر رہا تھا۔ ساری حویلی نیند کی آغوش میں کھو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر نظر آ رہی تھی۔ ماریا نے گرم شال اوڑھ کر اوپر سے گرم لبادہ زیب تن کیا اور زنجیر سے بندھا بکس اُٹھا کر کمرے کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ دو گٹھریاں ہاتھوں میں تھامے اس کی ہمراز خادمہ بھی اس کے پیچھے تھی۔ دونوں باغ سے ہو کر گزرنے لگیں۔ طوفانی موسم کا غیض و غضب سرد ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ یخ بستہ ہوا کے بپھرے ہوئے جھونکے ان کے چہروں پر طمانچوں پر طمانچے رسید کئے جا رہے تھے جیسے گناہگاروں کو ارتکاب جرم سے باز رکھنے کا انہوں نے تہیہ کر رکھا تھا۔ بالآخر باغ کی آخری حد آ چکی تھی۔ انہوں نے احاطے کا عقبی دروازہ دھیرے سے کھولا اور حویلی سے باہر نکل آئیں۔

ویران و سنسان سڑک کے کنارے کھڑی وہ تین گھوڑوں والی گاڑی انہیں ڈھونڈنی نہیں پڑی وہ دیر سے ان ہی کی منتظر تھی۔ ولادیمیر کا بھیجا ہوا کوچوان بڑی گھبراہٹ اور بے چینی کے عالم میں چہل قدمی کرتے ہوئے اپنی مخصوص سواریوں کا شدّت سے منتظر تھا۔ اُس نے سواریوں کو آتا دیکھ کر اطمینان کی سانس لی اور جلدی سے آگے بڑھ کر سامان کو گاڑی میں لاد دیا اور سواریوں کے گاڑی میں سوار ہونے کے بعد خود بھی گاڑی میں اپنی نشست پر پہنچ گیا۔ سردی میں گھوڑے جم کر رہ گئے تھے۔ کوچوان کے چابک کی چوتھی ضرب سے ان میں جان آ گئی اور اُن کے ساتھ گاڑی بھی حرکت میں آ گئی تھی۔

اب کچھ وقت کے لئے ہم ماریا اُس کی خادمہ اور کوچوان کو ان کی قسمتوں کے سپرد کر کے انہیں یہیں چھوڑے دیتے ہیں اور اپنے ہیرو ولادیمیر کا حال جاننے کے لئے دوسری طرف چلتے ہیں تا کہ اُدھر کا آنکھوں دیکھا حال آپ کو بھی دکھا سکیں۔

ولادیمیر اپنے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی دُھن میں سارے دن ادھر سے اُدھر بھاگتا دوڑتا پھرا۔ علی الصبح وہ ''زھادرینو'' پہنچ کر چرچ کے پادری سے ملا اور اُس سے شادی کی رسم انجام دینے کی درخواست کی جو بلا حیل و حجت منظور کر لی گئی۔ اب شادی کے گواہان کی تلاش کا مسئلہ باقی تھا۔ اس کے لئے اُس نے پڑوس میں رہائش بذیر زمینداروں کا رُخ کیا اور سب سے پہلے وہ ''دراون'' نام کے ایک اکتالیس سالہ فوجی افسر دوئیم (رٹائرڈ) سے ملا جس نے اُس کی آمد کا مدعا جان کر شادی کا گواہ بننا منظور کر لیا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ یہ کون سا ایسا بڑا مسئلہ ہے وہ تو اس طرح کی محبت کی شادیوں میں نہ جانے کب سے گواہ بنتا چلا آ رہا ہے۔ اُس نے ولادیمیر کو جام طعام قبول کرنے پر بھی مجبور کیا اور اُسے یقین بھی دلایا کہ کہ وہ مطلق بھی فکرمند نہ ہو اُسے باقی دو گواہ بھی مہیا کر دیے جائینگے اور پھر ہوا بھی یہی وہ ابھی

کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ "سیمدت" نام کا پٹواری جس کا چہرا گل مچھوں میں دھنسا ہوا تھا اپنے ہمراہ ضلع پولیس افسر کے سولہ سالہ بیٹے کو لئے وہاں آ گیا۔ ان دونوں نے نہ صرف گواہی کے لئے چرچ پہنچنے کا وعدہ کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ اُس کی خاطر وہ بڑی سے بڑی جوکھم بھی اُٹھانے کے لئے تیار ہیں۔ ولادیمیر سارے کام آپ ہی آپ بنتے دیکھ کر خوشی سے پھولا نہیں سمایا۔ وہ ان سے بغلگیر ہو کر اور ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد بقایا ضروری کام انجام دینے کے لئے وہاں سے فوراً ہی رخصت ہو گیا۔

جب وہ گھر پہنچا جھٹپٹے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہاں اُس نے اپنے معتمد کو چوان تریشکا کو ہدایت کی کہ وہ ایک گھوڑے والی گاڑی جوت کر اُس کے لئے تیار کر دے اور تین گھوڑوں والی تر دیکا لے کر براہ راست "تینا رادووو" پہنچ جائے۔ وہاں پہنچ کر اُسے کیسے ماریا اور اس کی خادمہ کو گاڑی میں سوار کرنا اور انہیں لے کر کرز دھادرینو چرچ پہنچنا ہے؟ دوبارہ اُسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا اب اُس کے پاس دو گھنٹے تھے اور ٹھیک ان دو گھنٹوں کے بعد اس کی ملاقات "زھادرینو" کے چرچ میں ماریا گاوریلوونا سے ہونے والی تھی۔ یہاں سے زھادرینو کا فاصلہ بیس پچیس منٹ سے زیادہ نہ تھا۔ گاڑی تیار کھڑی تھی۔ سڑک ہموار تھی۔ سب کچھ منصوبے کے عین مطابق بڑی خوش اسلوبی سے انجام پا رہا تھا۔

ولادیمیر خوشی خوشی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اُس کی گاڑی گاؤں کی آبادی کو اپنے پیچھے چھوڑ کر کھلی فضا میں پہنچی ہی تھی کہ ناگاہ طوفان نازل ہو گیا اور آندھی کے تھپیڑوں کی ہاتھی جیسے چنگھاڑ کے ساتھ ہی برفباری کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔ برف کے اڑتے ہوئے ذرات نے آپس میں یکجا ہو کر چاروں طرف دبیز کہرے کی سفید چادر سی تان دی تھی جس کے پیچھے کھیت، کھلیان، کھمبے نالے، تالاب، درخت اور سرسبز پہاڑیاں سبھی گم ہو کر رہ گئے تھے۔

چند ہی منٹ میں زمین پر ہر طرف برف کے سفید قالین بچھ گئے تھے جن کے پیچھے گم ہو جانے سے سارے زمینی منظر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ زمین و آسمان دونوں ہی سفید سے پٹ کر ایک جیسے ہو گئے تھے۔ پاگلوں کی طرح چیختی دوڑتی سرکش ہوائیں اپنے سروں پر اُڑتے برفانی آنچل ہوا میں لہراتی ہوئی ادھر سے ادھر قلابازیاں کھاتی پھر رہی تھی۔ دُھنی ہوئی روئی کے سے گالے چاروں طرف رقصاں نظر آ رہے تھے۔

ولادیمیر کی گاڑی سڑک پر لانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تھی۔ گاڑی اب ایک انجانے اور ان دیکھے میدان میں دوڑ رہی تھی۔ وہ دسیوں بار میدان میں کھڑے اونچے اونچے برف پوش تودوں سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گئی تھی گاڑی کا کسی گڑھے میں گر جانے کا خطرہ برابر بنا ہوا تھا۔ ولادیمیر کی توجہ خطرات سے زیادہ وقت پر مرکوز تھی اور اس بات پر بھی دھیان تھا کہ کہیں وہ راستہ نہ بھٹک جائے۔ اب تک ایک گھنٹے کی مسافت طے ہو چکی تھی مگر حیرت اس بات پر تھی کہ زھادرینو سے پہلے راستے میں جو جنگل واقع تھا اُس کا کہیں دور دور بھی پتہ نہ تھا۔ برفباری کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ آسمان پر بدستور برفیلے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ولادیمیر کی ہچکولے کھاتی اور ادھر ادھر لہراتی گاڑی برف میں اپنے پیچھے ایک دگڑا سا بنائی ہوئی میدان میں لگاتار آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ برف دبیز ہو کر ولادیمیر کی کمر تک پہنچ گئی تھی اور وہ برف میں دھنس کر بھی گھوڑے کی برابر آگے بڑھنے پر مجبور کئے ہوئے تھا۔ مگر

برف کو چیر کر قدم آگے بڑھانے اور قوت زیادہ صرف ہو جانے کی وجہ سے گھوڑا بے جان ہوتا جا رہا تھا اور اُس کے قدموں کی رفتار بھی سست پڑ گئی تھی۔

فضا میں ٹھٹرن اور کڑاکے کی سردی کے باوجود ولا دیمیر پسینہ پسینہ ہوا اُٹھا تھا۔ ناگاہ اُسے گمان ہوا کہ گاڑی راستہ بھٹک کر کہیں کی کہیں پہنچ گئی ہے۔ اُس نے یکلخت ہی گاڑی کو روک دیا اور سوچنے لگا کہ موجودہ صورتحال کی نزاکت کے پیش نظر اُسے کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہئے لہٰذا کچھ سوچ کر گھوڑے کا رُخ دائیں سمت موڑ کر اُسے پھر سے دوڑا دیا۔ مگر گھوڑے کی رفتار امید افزا اور تسلی بخش نہ تھی۔ اس ناموافق موسم اور تکلیف دہ سفر میں پیش رفت کرتے ہوئے اُسے ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔

''زھاردینو'' اب یہاں دور نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن متواتر آگے بڑھتے رہنے کے باوجود بھی تا حد نظر میدان ہی میدان نظر آ رہا تھا۔ چاروں طرف یا تو برف پوش پشتارے اور برف کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے نظر آ رہے تھے یا جا بجا برف آلود چھوٹے بڑے گڑھوں کا جال سا بچھا نظر آ رہا تھا۔ زمین ناہموار ہونے کے سبب جب ایک پہیہ بلند ہو جاتا تو گاڑی دوسری جانب پلٹتے پلٹتے رہ جاتی ولا دیمیر کمال ہوشیاری سے گاڑی کو کبھی دائیں طرف تو کبھی بائیں طرف پلٹنے سے بار بار بچانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا ویسے ویسے ہی ولا دیمیر کی اضطرابی واضطراری کیفیت اور ذہنی ہیجان و خلجان میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

بالآخر کچھ آگے نکل کر ولا دیمیر کو دور بہت دور ایک سیاہ لکیر سی نظر آئی جسے دیکھتے ہی اُس کے چہرے کی رونق بحال ہوگئی۔ خوشی سے اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی کیونکہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ دور سے سیہ لکیر سا نظر آنے والا یہ ہی جنگل ہے جو زھاردینو جاتے ہوئے راستے میں پڑتا ہے اُس نے گھوڑے کو جنگل کی طرف ہی ہانکنا شروع کر دیا۔ قریب پہنچنے پر وہ سیا لکیر واقعی جنگل میں تبدیل ہو چکی تھی۔

''اوہ خدا! تیرا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ تو نے مجھے بھٹکنے سے بچایا ہے۔ اب زھاردینو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ جیسے ہی جنگل ختم ہوگا زھاردینو بدلی کی اوٹ سے نکلے چاند کی طرح ہماری نگاہوں کے سامنے ہوگا۔''

گاڑی اب سڑک پر آ گئی تھی۔ دو رویہ درختوں کی شاخوں نے آپس میں ہم آغوش ہو کر سڑک پر چھاتہ سا تان رکھا تھا۔ یہاں ہوا کا زور و شور بھی نہ ہونے کے برابر تھا اور سڑک ہموار ہونے کے سبب گھوڑے کو بھی گاڑی کھینچنے میں زیادہ طاقت صرف نہیں کرنی پڑ رہی تھی جس سے گاڑی کی رفتار میں بھی خود کار طور پر خاصہ اضافہ ہو گیا تھا۔ ادھر ولا دیمیر کے دل پر جو خوف و اضطراب طاری تھا اس سے بھی اسے نجات مل گئی تھی۔

گاڑی ایک خاص تسلسل سے آگے ہی آگے رواں دواں تھی اور وہ خاصہ فاصلہ طے بھی کر چکی تھی مگر زھاردینو ابھی تک آنکھوں سے اوجھل تھا۔ جنگل کا رقبہ اس قدر وسیع و عریض اور راستہ اس درجہ طولانی تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس انکشاف پر کہ گاڑی رہ بھٹک کر کسی انجان جنگل کی بھول بھلیوں میں چکرا رہی ہے نا اُمیدی کا ایک جلتا ہوا تیر اس کے سینے کو شق کر کے اس کے قلب و جگر کے پار نکل گیا۔ جنونی و ہذیانی سی کیفیت میں مبتلا ہو کر اُس کے نے گھوڑے کی پشت پر چابکوں کی برسات

کردی۔ شدت درد و کرب سے گھبرا کر گھوڑے نے فوراً ہی برق رفتاری کے ساتھ دوڑ لگانا شروع کر دیا۔ مگر چند ہی منٹ کے بعد اُس کی رفتار پیدل کی چال سے بھی زیادہ سُست ہوگئی۔ گاڑی کی رفتار کو پھر سے بحال کرنے کے لئے اُس نے ایڑی چوٹی کا زور لگالیا اور سارے ممکنہ جتن آزمالئے مگر کچھ نہ ہو سکا۔ تھکا ہارا اور بے جان گھوڑا اب ہر طرح سے ہاتھ پاؤں ڈال چکا تھا۔ ولادیمیر کا دل تو چپکے چپکے رو ہی رہا تھا اب جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس وقت تک پھوٹ پھوٹ کر روتا رہے جب تک کہ اُس کے دل کی ساری بھڑاس نہ نکل جائے۔ ولادیمیر نے بجائے رونے کے ایک بار پھر ہمت سے کام لے کر روٹھے گھوڑے کو منانے میں کامیابی حاصل کر ہی لی۔ گھوڑا چل تو پڑا مگر رفتار نہ بڑھ سکی مجبوراً ولادیمیر نے اُسی پر قناعت کر لی اور رفتار کو گھوڑے کی مرضی ہی کے تابع کر دیا تھا۔

جنگل کا گھنا پن اب کم ہونا شروع ہو گیا تھا اور خدا خدا کر کے وہ وقت بھی آ ہی گیا جب گاڑی جنگل کی آخری جد سے باہر نکل آئی تھی۔ پھر بھی بجز مایوسی کچھ ہاتھ نہ آیا۔ ولادیمیر نے ہر طرف نظر دوڑا کر دیکھ لیا تھا مگر زھادرینو کا کہیں نام و نشان تک نظر نہ آیا۔

اُس کے اندازے کے مطابق یہ آدھی رات کا وقت تھا۔ گرم گرم آنسوؤں کی ندی اُس کی آنکھوں سے لے کر ٹھوڑی تک بڑے تسلسل کے ساتھ دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی ساتھ ہی گھوڑے کی مرضی کے مطابق ایک خاص مدھم رفتار سے گاڑی کے پہیوں کی گردش بھی برقرار تھی۔ طوفان اب تھم چکا تھا۔ بادل چھٹ گئے تھے اور کہرے کی دبازت بھی بڑی حد تک کم ہوگئی تھی اور اب اُس کی نظروں کے سامنے تاحد نظر بلورین برف کا دودھیا قالین سا بچھا ہوا تھا۔ یہ ایک نکھری سنوری سی صاف و شفاف رات تھی۔

ولادیمر کی چاروں سمت میں گھومتی نظر ایکا ایکی چند جھونپڑیوں پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھیں۔ ولادیمیر گاڑی ہانکتا ہوا وہیں جا پہنچا اُس نے گاڑی سے اُتر کر پہلی ہی جھونپڑی پر دستک دینا شروع کر دیا۔ درواز کھلا اور ایک داڑھی والے بزرگ نے نمودار ہو کر پوچھا۔ ’’کہئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟۔‘‘

’’کیا زھادرینو یہاں سے دور ہے؟۔ ولادیمر نے پوچھا۔

’’ہاں دور ہے...... خاصہ دور ہے۔‘‘ بزرک نے بتایا۔

’’کچھ نہیں تو یہاں سے دس کوس کا فاصلہ تو ضرور ہی ہوگا۔‘‘

بوڑھے کے منہ سے یہ بات سُن کر ولادیمر کو ایسا لگا جیسے کہ اس بوڑھے نے اُسے سزائے موت کا حکم سنا دیا تھا۔ وہ اپنے سر کے بال نوچنے لگا اور اپنا سر پیٹ لیا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر بوڑھا دریافت کرنے لگا کہ آخر ماجرا کیا ہے جو وہ اتنا مایوس مغموم نظر آرہا ہے۔ ولادیمیر تو اپنے ہی غم کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا اُس کے پاس وہ دماغ ہی کہاں تھا کہ بوڑھے کے سوالات کے جواب دے پاتا۔ اُس نے خود ہی سوال داغ دیا۔

’’بڑے میاں! زھاردینو جانے کے لئے کیا آپ کرائے پر مجھے ایک تازہ دم گھوڑا مہیا کرا سکتے ہیں؟۔‘‘

''ہمارے یہاں گھوڑے نہیں ہوتے ہیں۔''بوڑھے کسان نے جواب دیا۔

''اچھا! آپ اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ مجھے زھادرنیو پہنچانے لے لئے ایک آدمی میرے ساتھ کر دیجئے۔ وہ جو بھی مختانہ طلب کریگا میں اُسے دیدونگا۔''

''ایک منٹ انتظار کیجئے۔''بوڑھے نے واپس جھونپڑی میں جاتے ہوئے کہا ''میں اپنے لڑکے کو آپ کے ساتھ کئے دیتا ہوں وہ آپ کو زھاردنیو پہنچادے گا۔''

بمشکل نصف منٹ بھی نہ گزرا ہوگا کہ اُس نے پھر سے دوروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ بوڑھے نے دروازے پر آکر پوچھا۔''بتائے کیا چاہئے آپ کو۔؟''

''کہاں ہے آپ کا بیٹا۔؟''

''وہ بوٹ پہن رہا ہے بس آتا ہی ہوگا۔ آپ اندر آکر ہاتھ تاپ لیجئے۔''

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے، آپ اُسے جلدی سے بھیج دیجئے۔''

ایک بار بھر جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان ہاتھ میں لاٹھی لئے برآمد ہوا اور فوراً ہی گاڑی کے پاس پہنچ گیا اور پیدل چل کر ولادیمیر کی رہنمائی کرنے لگا۔ وہ کبھی اُسے برف کے تودوں سے بچنے کا اشارہ کرتا اور کبھی صحیح راستے کی رہنمائی کرتا۔ وہ اسی کی ہدایت کے مطابق گاڑی ہانکتا اور مسافت طے کرتا ہوا مسلسل آگے بڑھتا رہا۔

''کچھ وقت کا اندازہ ہے کہ اس وقت کیا بجا ہوگا؟''۔ ولادیمیر نے اپنے ہونٹ آپس میں کس کر بھینچ لئے۔ پھر وہ کچھ بولا ہی نہیں۔

پھر جب وہ زھادرنیو پہنچا صبح کا اُجالا اچھی طرح پھیل چکا تھا اور مرغ بانگ دے رہے تھے۔ اُس نے گاڑی چرچ کے باہر روک دی۔ چرچ کا دروازہ مقفل تھا اور وہاں کوئی بھی ذی روح موجود نہ تھا۔ ولادیمیر نے رہنما کا مختانہ ادا کر دیا اور فوراً ہی چرچ کے پادری کے مکان پر جا پہنچا۔ اُس کے مکان کے احاطے میں ماریا کو لے کر آنے والی اُس کی تین گھوڑوں والی ترویا کا کوئی پتہ نشان نہ تھا۔

ہمارے بدنصیب ہیرو کو کیا سانحہ پیش آیا اور اُس پر کیا بیتی اس کا آنکھوں دیکھا حال تو ہم آپ کو دکھا ہی چکے ہیں اس لئے ہیرو کو اُس کے نصیب کے سپرد کر کے آپ کو واپس ''نینارادووو'' زمیندار کے یہاں لئے چلتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ ہیروئن کے گھر سے فرار ہونے پر وہاں کیا ہنگامہ برپا ہوا۔؟

مگر وہاں تو کوئی ہنگامہ بپا ہوا ہی نہیں......جی ہاں چونکئے نہیں...... یہ سچ ہے حقیقتاً وہاں کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوا۔

صبح جب زمیندار اور اُن کی بیگم نیند سے بیدار ہو کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو گاوریلا گاوریلووچ نے مخملیں جیکٹ زیب تن کی ہوئی تھی اور سر پر نائٹ کیپ لگا ہوا تھا کہ تبھی خادمہ نے چائے کے ساوار اور پیالیوں سے سجی ٹرے میز پر اُن کے سامنے رکھ دی۔ انہوں نے اس جوان خادمہ کو حکم دیا کہ وہ ماریا کی خواب گاہ میں جا کر دریافت کرے کہ اُس کی طبیعت اب کیسی ہے اور کیا رات کو اُسے اچھی طرح نیند آئی تھی؟ واپس آکر انہیں خادمہ نے بتایا کہ رات کو وہ گہری نیند سوئی تھیں اور اب طبیعت بھی پہلے سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہاں بس آنے ہی والی ہیں۔'' ملازمہ ابھی یہ بات پوری طرح بتا بھی نہ پائی تھی

کہ تبھی ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور ماریا گاورلوونا اندر آ کر اپنے والدین کے گلے لگ گئیں۔

دن تو بخیرت گزر گیا مگر رات ہوتے ہی ماریا بیمار ہوگئی۔ فوراً ہی پڑوس کے قصبے سے ڈاکٹر کو طلب کیا گیا۔ اگلے دن شام کو جب ڈاکٹر وہاں آیا تو ماریا بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ وہ نمونیہ کا شکار ہو چکی تھی۔ اور بُری طرح بخار میں تپ رہی تھی۔ بے چاری دو ہفتے تک حیات وموت کا جھولا جھولتی رہی۔ گھر سے فرار ہونے کا راز گھر میں ابھی تک راز ہی بنا ہوا تھا۔ گھر سے روانگی سے قبل جو تحریر شدہ رقعے چھوڑے گئے تھے۔ حویلی کی ایک دوراندیش خادمہ نے انہیں مشتہر کرنے کے بجائے نذر آتش کر دیا تھا۔

معتبر و معتمد خادماؤں کے ہوتے ہوئے راز افشا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ خادمہ سہیلی نے بھی ماریا کو تلقین کر دی تھی کہ وہ اس بات کو کبھی زبان پر لانے کی کوشش نہ کرے رہے پٹواری، سولہ سالہ لڑکا اور چرچ کے پادری تو وہ خود بھی اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ خاموش رہنے میں ہی سلامتی اور بہتری مضمر ہے۔ کوچوان تریشکا راز فشانہ کرنے کے لئے پہلے ہی قسمیں کھا چکا تھا۔ اس طرح نصف درجن راز داروں کی بڑی تعداد کے باوجود بھی یہ راز راز ہی رہا۔

عالم غفلت میں بڑبڑاتے ہوئے ولادیمیر کا نام جو کئی بار اس کی زبان سے ادا ہوا اُسے سب نے سنا تھا۔ اُس کی ماں جان گئی کہ ان کی بیٹی ولادیمیر کے عشق میں گرفتار ہے اور اس بیماری کا بنیادی سبب بھی یہی حضرت عشق ہیں۔

لہٰذا خوشامد سے کام لے کر انہوں نے اپنے شوہر کو بیٹی کی شادی ولادیمیر سے کرا دینے پر رضامند کر ہی لیا۔

ماریا کے گھر والوں نے جس طرح بگڑے ہوئے لہجے میں ولادیمیر کو اپنے گھر آنے سے منع کیا تھا اور اُس کی بے عزتی کی تھی اُسے وہ بھولا نہیں تھا۔ ماریا کے صحت یاب ہوتے ہی اُس کے ماں باپ نے بلا تاخیر اپنی بیٹی کی شادی اُس کے ساتھ کرنے کی منظوری کی اطلاع ولادیمیر کے گھر بھجوا دی جس کے جواب میں انہیں اُس کا لکھا ایک رقعہ موصول ہوا جس نے سبھی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

اس نے لکھا تھا۔

''جس در پر مجھے ذلیل وخوار کیا گیا ہے اُس پر برات لے کر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا'' اُس نے یہ بھی لکھا تھا کہ۔

''اب میری دلچسپی شادی میں نہیں موت میں ہے۔''

اور پھر چند یوم کے بعد ہی وہ فوج میں بھرتی ہو کر کہیں دور چلا گیا۔ یہ ۱۸۱۲ء کا سیاسی طور پر بڑا نازک دور تھا۔

ماریا اگرچہ ولادیمیر کا نام اب اپنی زبان پر لانے سے پرہیز کرتی تھی مگر وہ اب بھی اس کے دل کی گہرائیوں میں رہائش پذیر تھا۔ پھر ایک دن جب اُس نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ ''بوردنیو'' کے مورچے پر فرانسیسی افواج سے لوہا لیتے ہوئے جو وطن پرست روسی جانباز شدید زخمی ہوئے ہیں ان کی فہرست میں ولادیمیر کا نام بھی شامل ہے تو دلی صدمے سے وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ وہ ہوش میں آ تو گئی مگر ولادیمیر کی محبت کا درد برابر اس کے دل کا چا تار ہتا تھا۔ کچھ ہی دن گزرے ہونگے کہ اُسے ایک اور صدمہ

جانکاہ سے دوچار ہونا پڑا۔ اُس کے سر سے اس کے باپ کا سایہ اُٹھ گیا تھا۔ اب وہ ہمہ وقت ماں سے لپٹ لپٹ کر روتی رہتی تھی۔ اگر چہ اُس کے باپ نے ورثے میں اس کے لئے بہت دولت اور جائیداد چھوڑی تھی مگر یہ وراثت بھی اس کو غموں کی شعلہ بار دھوپ سے بچانے میں معاون نہ ہو پائی۔ یہاں کی پریشانی کن اور دردانگیز یادوں سے بچنے کے لئے اُس کی ماں نے یہ حویلی ہی چھوڑ دی اور بیٹی کو ساتھ لے کر اپنی جاگیر ایکس کے ایک گاؤں میں جا کر رہنے لگیں۔

یہاں بھی ماریا کے لئے رشتے لے کر آنے والوں نے اُن کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ سبھی کی نظریں ماریا پر کم اور اس کے دھن دولت پر زیادہ مرکوز تھیں۔ ماریا کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔

پھر اُس وقت جب نپولین بوناپارٹ کی فوجیں ماسکو میں داخل ہو رہی تھیں زخموں کی تاب نہ لا کر ولادیمیر نے دنیا کو الوداع کہہ دیا تھا۔

ماریا جو لگاتار صدموں پر صدمے جھیلتی چلی آ رہی تھی اسے ایک اور عظیم اور روح فرسا صدمہ جھیلنا پڑا۔ وہ اس کے مکتوبات اور دیرینہ ملاقاتوں کے سہانے تصورات میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔

اب جنگ کا نقشہ پلٹ چکا تھا۔ شکست خوردہ فرانسیسی فوجیں پسپا ہو کر واپس پلٹ چکی تھیں۔ عظیم روس فتح کے نشے میں سرشار تھا۔ دور دراز مورچوں پر تعینات روسی فوجی اب اپنے گھروں کو واپس آ چکے تھے۔ جگہ جگہ فتح کے شادیانے بج رہے تھے۔ جشن منائے جا رہے تھے ہر طرف زندگی ناچتی جھومتی اور گاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

انہی دنوں ''برمن'' نام کا ایک چھبیس سالہ نوجوان بھی اپنے آبائی گاؤں میں آیا ہوا تھا۔ اس کا گاؤں ماریا کے گاؤں سے بہت نزدیک تھا۔ زخمی فوجی افسر کے بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ اپنی مردانہ وجاہت زندہ دلی اور خوش مزاجی کے سبب ماریا اور اُس کی ماں کے دل میں گھر چکا تھا۔ کچھ ذاتی پسند اور کچھ ماں کے سمجھانے بجھانے پر وہ اُس پر مائل ہو گئی تھی۔ وہ بھی ماریا کو پسند کرنے لگا تھا اور برابر گھر کے چکر لگا رہا تھا۔ مشا کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ جلدی ہی کھل جائے گا اور اظہار محبت کر بیٹھے گا۔ مگر کافی عرصہ یوں ہی گزر گیا اور بات ہنسی مذاق سے آگے نہ بڑھ سکی۔ محبت کے تعلق سے ابھی تک اُس نے ایک لفظ تک نہیں کہا تھا۔ وہ بڑا پُر اسرار سا نظر آ رہا تھا۔ پتہ نہیں یہ اُس کی رعونت تھی، انا تھی یا کوئی مجبوری۔ اُس کے بارے مین یقین سے کوئی رائے قائم کرنا آسان نہ تھا۔

ایک دن وہ گھر آیا اور ماریا کے بارے میں پوچھا تو ماں نے اُسے باغ میں بھیج دیا۔ ماریا تالاب کے کنارے بیٹھی کہانیوں کی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ ماریا نے اُس کے خیر مقدم میں قصداً سرد مہری اختیار کی۔ اس پر وہ جذباتی ہو کر کہنے لگا۔

''ماریا! میں جانتا ہوں تم مجھ سے ناراض ہو۔ میں بہت دن سے اپنے دل کی بات تمہیں بتانا چاہتا تھا مگر نہ بتا سکا۔ خیر! ابتائے دیتا ہوں اور وہ بات یہ ہے کہ میں شادی شدہ ہوں۔''

''کیا؟'' ماریا نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ''تم شادی شدہ ہو؟''

''ہاں میں شادی شدہ ہوں مگر میری شادی عام شادیوں سے قطعاً مختلف ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ میری بیوی کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ دوبارہ کبھی اُس سے

ملاقات ہوگی بھی یا نہیں۔"

"کمال ہے۔" ماریا نے کہا۔" آپ کی باتیں تو بڑی پُر اسرار اور عجیب وغریب معلو ہوتی ہیں۔ کیا آپ اپنی شادی کے بارے میں کچھ بتانا پسند کرینگے؟"

"میری شادی کی کہانی ذرا لمبی ہے اگر آپ بور نہ ہوں تو مجھے سنانے میں کوئی تامل کوئی تکلف نہیں ہے"

"یہ ۱۸۱۲ء کے ابتدائی دنوں کی بات ہے۔" برمن نے کہانی کا آغاز کیا۔ "وائلنا" میں ہمارے فوجی دستے کی چھاؤنی قائم تھی جہاں جلد از جلد پہنچنے کی دُھن میں میں گاڑی کو بھگائے لئے جارہا تھا کہ سڑک کے ایک کنارے مجھے تازہ دم گھوڑے مہیا کرنے والے پوسٹ اسٹیشن کی عمارت نظر آ گئی۔ میں گاڑی سے اُتر کر عمارت میں داخل ہوگیا اور وہاں کے منتظم سے کہا کہ میری گاڑی میں تازہ دم گھوڑے جوت دیے جائیں۔ یہ غروب آفتاب کا وقات تھا کہ تبھی طوفان آ گیا۔ منتظم نے مجھے مشورہ دیا کہ میں وہیں رُک کر آرام کروں اور طوفان تھمنے کے بعد ہی سفر کروں تو بہتر ہوگا۔

میں منتظم کی بات مان کر کچھ دیر وہاں رکا بھی لیکن جب طوفان کا زور کم ہی نہ ہوا تو گھبرا کر میں نے گاڑی میں نئے گھوڑے جتوائے اور اپنے ٹھکانے پر پہنچ کے لئے طوفان میں ہی نکل پڑا۔ تھوڑا آگے جا کر میری گاڑی کے کوچوان نے گاڑی کو ندی کے کنارے والے راستے پر ڈال دیا کیونکہ یہ تین میل چھوٹا راستہ تھا۔ چونکہ ساحلی میدان برف کا فرش بن گئے تھے اس لئے کوچوان وہ مقام تلاش نہ کر سکا جہاں سے گاڑی کو سڑک پر لانا تھا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ وہ مقام پیچھے چھوٹ گیا ہے اور وہ آگے نکل آیا ہے۔ اب ہم ایک اجنبی اور انجانے سے ویرانے میں پہنچ گئے تھے۔ طوفان ابھی تک اپنے شباب پر تھا۔ اس دہشت انگیز ویرانے میں ناگاہ ہی ایک جانب مدھم سی روشنی کا سُراغ میرے ہاتھ لگ چکا تھا۔ میں نے کوچوان کو اُدھر ہی چلنے کو کہا۔ کچھ ہی وقت میں ہم ایک گاؤں میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ روشنی اسی گاؤں میں واقع ایک چرچ سے آ رہی تھی ہم وہیں جا پہنچے۔ چرچ کے احاطے کا صدر دروازہ کھلا ہوا تھا اور احاطے کے اندر تقریباً نصف درجن گھوڑا گاڑیاں اور تریکا وغیرہ کھڑی ہوئی تھیں۔ چرچ لکڑی کا بنا ہوا تھا جہاں پورچ میں کچھ لوگ بڑی بے چینی سے چہل قدمی کرتے نظر آ رہے تھے۔

"اندر چلے آیئے......اندر چلے آیئے۔" ہمیں دیکھتے ہی بیک وقت کتنی ہی آوازیں گونج اُٹھیں۔ میرے اشارے پر کوچوان نے گاڑی چرچ کے احاطے میں لے جا کر کھڑی کر دی۔

"کمال کرتے ہیں آپ بھی" کسی نے چیں بہ چبیں ہو کر اپنی خفگی کا اظہار کیا۔

"کوئی اتنی بھی دیر لگاتا ہوگا......آپ نے تو حد ہی کر دی......جانتے ہو دلہن بے ہوش ہو چکی ہے......ہم لوگ بھی اُکتا کر بس جانے ہی والے تھے......کیا کر رہے ہیں......پلیز جلدی کیجئے جلدی۔"

کچھ کہے سُنے بغیر ہی میں نے گاڑی سے زمین پر چھلانگ لگا دی اور فوراً ہی چرچ میں داخل ہو گیا۔ چرچ میں موم بتیوں کی بہت مدھم روشنی تھی۔

نیم تاریکی میں جہاں ایک طرف بنچیں پڑی تھیں دلہن بیٹھی ہوئی تھی اور اُس کے پہلو میں بیٹھی ایک لڑکی سر درد دور کرنے کے لئے بار بار اپنی کنپٹیاں دبا رہی تھی اتنے میں ایک شخص نے میرا بازو تھام کر

کہا۔

''خدا کا شکر ہے کہ دیر سے ہی سہی مگر آپ آتو گئے ورنہ تو ہماری لڑکی کو آپ نے قریب قریب قتل ہی کر دیا تھا۔'' اتنے میں ایک بزرگ پادری نے قریب آ کر کہا۔'' کیا خیال ہے نوجوان ! کیا شروعات کی جائے؟''

''ضرور کیجئے فادر ! ضرور کیجئے۔'' یہ میرے الفاظ تھے جو بوکھلاہٹ میں بغیر سوچے سمجھے بغیر ہی خود کار طور پر میرے منہ سے نکل گئے تھے۔ اپنی بدحواسی پر میں خود بھی حیران و پریشان تھا۔

لڑکی بینچ سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ مدہم سی روشنی میں مجھے اس کی مبہم سی بس ایک ہی جھلک دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ وہ مجھے بڑی پُرکشش اور اس قدر من لبھاؤنی محسوس ہوئی کہ اسے الفاظ میں بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ ہم دونو شہہ نشین پر جا کر ایک ساتھ کھڑے ہو گئے۔ پادری عجلت میں تھا۔ تین گواہان اور ایک لڑکی دلہن کو سنبھالے ہوئے تھے اور میری طرف کوئی بھی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ اچانک ایک بھاری سی آواز سے سارا چرچ گونج اُٹھا۔'' بوسے دیجئے ایک دوسرے کو۔ اب آپ شادی کے مقدس بندھن میں بندھ چکے ہیں۔'' بوسہ لینے کے ارادے سے میں جیسے ہی دلہن کے نزدیک پہنچا اُس کے گلے سے چیخ نکل گئی۔

''یہ وہ نہیں ہے...... یہ وہ نہیں۔'' کہتی ہوتی وہ تیورا کر گری اور گرتے ہی بے ہوش ہوگئی۔ اب گواہان بھی چوکنے ہوگئے اور میری شناخت کرنے کے ارادے سے جب وہ میری طرف تیزی سے بڑھے تو خوفزدہ ہوکر میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور بے تحاشہ بھاگ کر گاڑی میں سوار ہو گیا پھر میں نے کوچوان سے کہا۔'' ہمیں لوگ پکڑنے آرہے ہیں گاڑی جلدی بھگاؤ۔''

''اف میرے خدا!۔'' اتنا سُن کر ماریا نے سرد آہ بھری اور کہا۔

''کیا آپ نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی کہ آپ کی بدنصیب بیوی کا کیا حال ہوا؟''

''نہیں کی۔'' برمن نے وجوہات بیان کرتے ہوئے کہا۔

''ایک تو مجھ یہی نہیں معلوم کہ اُس جگہ کا نام کیا ہے؟ اور وہ کونسا گاؤں ہے جہاں شادی انجام پائی تھی۔ دوسرے جہاں میں نے گھوڑے تبدیل کئے تھے مجھے یاد نہیں کہ وہ پوسٹ اسٹیشن کہاں واقع ہے؟ کیونکہ چرچ سے نکلتے ہی خوف وخطر نے گہری نیند کی شکل اختیار کر لی تھی اور اگلے دن سویرے ہی میں نیند سے بیدار ہوا تھا۔ پھر تیسرے POST STAION پر میرا کوچوان بھی بیمار پڑ کر مر گیا۔ اب کوئی بھی ایسا ذریعہ موجود نہیں ہے جس سے میری بیوی کا پتہ ٹھکانہ معلوم کیا جاسکے۔''

''تو بڑی کرامت والا ہے میرے خدا!۔'' ماریا گاوریلوونا نے برمن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔'' اچھا تو وہ آپ ہی تھے۔ پہچانا آپ نے اپنی بیوی کو۔ جسے شادی کے بعد آپ چرچ میں ہی چھوڑ آئے تھے میں آپ کی وہی بدنصیب بیوی ہوں۔''

برمن نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اُسے بغور دیکھا اور پھر دیوانہ وار اسے آغوش میں بھر کر اُس کے رخساروں پر بوسوں کی برسات کر دی۔

......☆☆☆......

☆......انتون چیخوف
☆......رفیق شاہین

حرافہ

کالیجئیٹ اسیسر (Collegiate Accessor) یعنی اکاؤنٹینٹ میگوئیف جو شام کے وقت کھلی فضا میں ٹہلنے کا عادی تھا ٹیلیگراف کے کھمبے کے نزدیک پہنچ کر یکلخت ہی اس کے قدم جام ہو گئے اور ایک حسرتیہ سی سرد آہ اُس کے منہ سے نکل گئی۔ اُسے یاد آ گیا کہ جب وہ شام کو چہل قدمی کر کے گھر واپس آ رہا تھا تو ٹھیک اسی مقام اور اسی کھمبے کے قریب اس کی سابقہ گھریلو ملازمہ ایگنیا نے اُسے خوفناک دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا۔

''دیکھتے جاؤ کہ میں کس طرح تمہاری اصلیت کا بھانڈا پھوڑ کرونگی۔ تمہیں اچھی طرح پتہ چل جائے گا کہ کسی معصوم کی زندگی کے ساتھ کھلواڑ کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ میں تمہارے خلاف مقدمہ دائر کرونگی۔ تمہاری نشانی کو تمہارے گھر کی چوکھٹ پر چھوڑ آؤنگی اور بتاؤنگی تمہاری بیوی کو کہ بظاہر معصوم نظر آنے والا یہ شخص اندر سے کس قدر گھناؤنا ہے۔ اگر میں نے تمہارا سارا کچھا چٹھا کھول کر نہ رکھ دیا تو میرا نام ایگنیا نہیں۔'' اس کے علاوہ اُس نے یہ بھی مطالبہ کیا تھا کہ وہ پانچ ہزار روبل اُس کے بینک کے کھاتے میں جمع کروا دے۔

میگوئف نے پھر سے سرد آہ بھری۔ افسوس اور پچھتاوے کے ساتھ اُسے خود پر بھی بہت غصہ آ رہا تھا کہ وہ لمحاتی عیش و مسرت کے لئے نجانے کیسے ہوش و حواس گنوا بیٹھا جس کے نتیجے میں وہ مصیبت کے جال میں پھنس کر رہ گیا ہے۔

جب وہ موسم گرما گزارنے والے اپنے ''داچا'' میں پہنچا تو دم لینے کے لئے پورچ میں بیٹھ گیا۔ یہ کوئی رات کے دس بجے کا وقت تھا۔ بادلوں سے چھن کر آنے والی پھیکی سی چاندنی نے سارے منظر نامے کو اپنے آنچل میں لے رکھا تھا۔ گلیاں ویران اور سنسان پڑی ہوئی تھیں۔ لوگ اپنی اپنی خوابگاہوں میں خواب خرگوش کا مزہ لے رہے تھے جب کہ نوجوان لوگ ابھی جنگل کے سیر سپاٹے ہی میں مشغول تھے۔ میگوئیف نے سگریٹ جلانے کے لئے ماچس کی تلاش میں پہلے اپنے کوٹ کی بائیں جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر دائیں جیب میں کہ تبھی کوئی نرم سی شئے اُس کی کہنی سے پھسل گئی۔ اُس نے بڑی لاپروائی سے جیسے ہی اُس شئے پر نظر ڈالی ایکا ایکی اُس کا چہرا دہشت وہیبت اور خوف و حیرت سے بُری طرح مسخ ہو کر رہ گیا۔ یوں لگ رہا تھا گویا اُس نے کوبرا کالے ناگ کو پھن تانے کھڑا دیکھ لیا ہے۔ صدر دروازے کی دہلیز کے قریب جس شئے کو اُس نے دیکھا تھا وہ پوٹلی جیسی تھی کچھ تھا جو کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ پوٹلی کا ایک سرا کھلا ہوا دیکھ کر اس نے اُس پوٹلی کے خلا میں ہاتھ ڈالا تو محسوس ہوا کہ وہ کوئی زندہ شے اس میں ہے۔ ایک عجیب سی دہشت کے احساس سے ایک دم ہی اُس کا دل بڑی زور سے دھڑکنے لگا۔ کنپٹیاں پھڑکنے لگیں اور دماغ میں بارودی بم سے پھٹنے لگے۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے وہ قید سے بھاگا ہوا کوئی مفرور مجرم ہے جسے

گرفتار کرنے کیلئے قانون کے مسلح محافظوں نے اُسے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے اور بچ نکلنے کی ساری راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ وہ جسم کے ایک ہی جھٹکے کے ساتھ کچھ ایسے کھڑا ہو گیا جیسے بچھو نے پاؤں میں ڈنگ چبھو دیا ہو۔ اُس کی مٹھیاں اور دانت بھنچے ہوئے تھے۔ سانپ جیسی پھنکار کے ساتھ وہ بڑبڑایا۔

''تو بچے کو گھر کی دہلیز پر ڈال کر اُس لعینہ و خبیثہ نے اپنی خطرناک دھمکی کو عملی جامہ پہنا ہی دیا۔ یا خدا! مجھے بچا۔ میرے گناہ کا نتیجہ اور باپ کا پھل میری آنکھوں کے سامنے ہے اور مجھے اس گلے آپڑی آفت و مصیبت سے بچ نکلنے کی کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی ہے۔''

خوف و دہشت اور وحشت و پشیمانی کے ملے جلے احساس نے اُسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا تھا اور وہ پتھر کی بے حس و حرکت مورت کی طرح یوں کھڑا تھا جیسے اُس کے پاؤں زمین میں گڑے ہوئے تھے۔

''اب جو بھی ہوگا بہت بُرا ہوگا'' اُس نے سوچا۔ ''کیا کہے گی اس کی بیوی اُس کے آفس کا عملہ، پڑوسی اور رشتے کنبے والے۔ اُس کا افسر اعلیٰ اُس کی پشت تھپتھپا کر بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہے گا۔

''شاباش! میرے غیر مہذب حبشی شاباش! شیطان اپنے ایسے ہی چیلوں کی مدد سے سارے عالم پر حکمرانی کر رہا ہے۔ وہ تمہارے اس رفیع اُلشان کارنامے پر تم سے بہت خوش ہوا ہوگا۔۔۔۔ تم نے بہت خوب کارنامہ انجام دیا ہے میکوئیف۔''

موسم گرما میں آباد ہونے والا یہ سارا علاقہ آناً فاناً اس راز سے واقف ہو جائے گا۔ اُس پر سارے گھروں کے دروازے بند کر دیے جائینگے۔ راہ چلتے اُس پر اُنگلیاں اُٹھائی جائینگی۔ فقرے کسے جائینگے۔ ناممکن نہیں ہے کہ اُس کے نام کے ساتھ یہ واقعہ اخباروں میں بھی شائع کیا جائے۔ پھر تو ہر کوئی اُس کے منہ پر تھوکے گا اور اُسے دنیا میں منہ چھپانے کو کہیں جگہ بھی نہ ملے گی۔

کھانے کے کمرے کی کھڑکی کُھلی ہوئی تھی۔ اُس نے اندر جھانک کر دیکھا تو اُسے اپنی خوبصورت بیوی آنا فلیپو ونا نظر آگئی جو دوپہر کے کھانے کے لئے میز کرسیاں قرینے سے لگا رہی تھی اور عقب میں واقع حویلی کے احاطے میں گھریلو ملازم پرمولائی نے ستار پر کوئی دلکش دُھن چھیڑی ہوئی تھی۔ اُس نے سوچا قبل اس کے کہ بچہ بیدار ہو کر رونے لگے میں کیوں نہ اپنی جان بچانے کے لئے اس مصیبت کو اپنے دروازے سے اُٹھا کر کسی اور کے دروازے پر پھینک آؤں۔ اُس نے فوراً ہی بچے کی گٹھری جھک کر ہاتھ میں اُٹھایا اور بلا تاخیر گلی میں داخل ہو گیا۔ وہ اس خوف سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا کہ کہیں اُس پر کسی کی نظر نہ پڑ جائے ورنہ سرکاری ملازمت کی وجہ سے جو محلے میں اپنی ساکھ قائم ہے اُس پر پانی پھر جائے گا۔ آگے چل کر اُسے ایک مکان نظر آ گیا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس مکان کی کھڑکیاں کُھلی ہوئی تھیں جس سے خطرہ اس بات کا تھا کہ کھڑکیوں کے پیچھے سے کوئی بھی اُسے بچہ دروازے پر ڈالتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ لہٰذا اس جگہ کو نامناسب مان کر رد کر دیا۔ پھر فوراً ہی اُس کے تصور میں تاجر میلکن کا مکان روشن ہو گیا۔ اُس نے سوچا تاجر لوگ امیر و کبیر اور رحمدل ہوتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ میلکن کو اس بچے پر ترس آ جائے اور وہ اپنے بیٹے کی طرح اس کی پرورش بڑے ناز و نعم کے ساتھ کرنے کے لئے رضامند ہو جائے۔ بہر

حال اس کام کے لئے اُسے یہی گھر نہایت موزوں اور مناسب معلوم ہوا اور اُس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ بچّے کو اُسی کے گھر کے دروازے پر چھوڑ دے گا۔

اگر چہ میلکن کا مکان آبادی کے آخری سرے پر دریا کے کنارے واقع ہونے کے سبب خاصے فاصلے پر تھا پھر بھی اس کام کو انجام دینے کو اُس نے اسی گھر کا انتخاب کیا تھا۔

میگوئیف دریا کے رُخ پر چلتے ہوئے دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ آج وہ جس ذی روح اشرف المخلوق کو ایک کُتیا کے پلّے کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ پھینکنے جا رہا ہے کیا پتہ کل کو یہ بچہ پڑھ لکھ کر اور بڑا ہو کر کوئی فوجی جنرل، کوئی پروفیسر یا کوئی بڑا ادیب بن جائے اور وہ اس وقت اس کے دربار میں ایک ضرورت مند کی حیثیت سے سر جھکائے کھڑا ہو تو یہ بات کس قدر عجیب معلوم ہوگی۔

وہ جن رتیلی اور ویران وسنسان گلیوں سے ہو کر گزر رہا تھا اُن کے دوطرفہ مکانوں کے باہری لانوں کی باڑھ سے ملحق درختوں کے گہرے سایوں کی وجہ سے مکانات نظروں اُوجھل تھے۔ مسلسل قدم آگے بڑھاتے ہوئے اس کا ذہن بیدار ہو گیا اور وہ سوچنے لگا۔

''بھلے ہی وہ اپنے اس عمل کو مصلحت آمیز بھلائی مان کر انجام دینے جا رہا ہے پھر بھی تو اُس کی یہ حرکت ہے تو وحشیانہ وسفاکانہ اور مجرمانہ ہی بچے کو ایک در سے دوسرے در پہ پھینکنا یقیناً رذالت وکمینگی کی انتہا ہے۔ اس میں نومولود بچّے کا کیا قصور، وہ تو ننھا معصوم فرشتہ ہے۔ حقیقتاً قصوروار و گنہگار تو ہم جیسے بوالہوس اور عیاش مرد ہی ہوتے ہیں جو بیل کی طرح اِدھر اُدھر مونہہ مار کر معاشرے کو سنگین مسائل سے دوچار کرتے رہتے ہیں اور اس جنسی بے راہ روی کی سزا بھگتنی پڑتی ہے ان معصوم فرشتوں کو۔ اگر صورتحال کا دیانتداری سے جائزہ لیا جائے تو گناہ میں نے کیا ہے۔ مجرم میں ہوں اور سزا بھگتنی پڑ رہی ہے اس ننھی منی جان کو۔ اگر اُس کو دردناک زندگی بسر کرنا پڑی تو اس کا ذمے دار قصوروار میں ہی قرار دیا جاؤں گا۔ میں اُسے میلکن کے در پر چھوڑ آؤں گا۔ میلکن اُسے یتیم خانے میں بھرتی کرادیگا جہاں اُسے والدین کی شفقتوں کے بجائے بے رحم اجنبیوں کے ظلم وستم سہنے پڑینگے۔ بیکسی و بے بسی اور مجبوری ولاچاری کی ذلت آمیز زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونا پڑیگا۔ جیسے ہی وہ چار پانچ سال کا ہو جائے گا اُسے جوتہ سازی کا ہُنر سیکھنے کے لئے'' کسی جلاد قسم کے سخت گیر موچی کی سُپردگی میں دے دیا جائے گا جہاں پٹ پٹ کر وہ بے حیا اور ڈھیٹ ہو جائے گا اور روز کنواں کھودنے اور روز پانی پینے والی عسرت وغربت کی زندگی بسر کریگا۔ بُری صحبتیں اختیار کریگا۔ شراب پیئے گا۔ جُوا کھیلے گا۔ بدکاریوں میں ملوث ہوگا۔ ماں بہن کی گالیاں بکے گا۔ اور ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ وہ کسی جاہل موالی کی اولاد نہیں ہے بلکہ اس کی رگوں میں مجھ اعلیٰ نسل کے ایک مہذب انسان کا ہی لہو گردش کر رہا ہے اور وہ مجھ عزت مآب اکاؤنٹینٹ کا ہی بیٹا ہے۔ مگر افسوس وہ میرا بیٹا نہیں کہلائے گا۔ اُسے محض ایک کم ذات موچی کے شاگرد کی حیثیت سے ہی پہچانا جائے گا۔

میگوئیف اب دورویہ درختوں کے گھنے سایوں سے نیم تاریک نظر آنے والے گلی کوچوں سے گزر کر دریا کے کنارے والی روشن سڑک پر پہنچ گیا تھا۔ چاند بدلی کی اوٹ سے باہر آکر مند مند مُسکا رہا تھا۔ میگوئیف نے کپڑا ہٹا کر بچّے کو بغور دیکھا۔ اور اُس کے ہونٹوں پر تبسم کھل اُٹھا۔

''کیسی مست نیند سو رہا ہے۔ اور ذرا اس کی ناک تو دیکھو بالکل مجھ پر گئی ہے...... آگے سے

تھوڑی اُٹھی ہوئی...... سونے کا ناٹک کر رہا ہے جیسے بچّو کو پتہ ہی نہیں کہ اُس کا باپ اُسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا ہے......

اور اگر یہ مجھ پر طنز کرنے لگے کہ محبت کا ناٹک تو میں خود کر رہا ہوں اور الزام دے رہا ہوں اُسے...... تو میرا جواب یہی ہوگا۔ ''بیٹے تم اپنی قسمت ہی ایسی لکھوا کر لائے ہو...... اب تم ایک سعادتمند بیٹے کی طرح اپنے مجبور باپ کو سچے دل سے معاف کردو میرے لال۔''

میگوئیف کا دل بھر آیا اور یک بیک آنکھیں چھلک اُٹھنے پر اُس کے رخسار بھیگ گئے۔ اُس نے نومولود کو پھر سے کپڑے میں لپیٹ دیا اور اُسے بغل میں دبائے پھر سے اپنی راہ چل پڑا۔ راستے پھر اس کا ضمیر اسے کچھوٹتا رہا اور اُس کے دل و دماغ میں جنگ چھڑی رہی۔ اُس کا ضمیر اسے ایک شریف اور دیانتدار انسان تسلیم کرنے کے لئے کسی طور بھی رضامند نہیں تھا۔ وہ اُس کی دانشمندی اور مصلحت پسندی کو اُس کی ازلی بزدلی اور کمینگی سے تعبیر کر رہا تھا۔ اُس کے دل کی آواز کا مفہوم بھی یہی تھا کہ وہ واقعی ایک شریف ایماندار اور جرأت مند انسان ہوتا تو انگلیاں اُٹھانے والے سماج کو خاطر میں نہ لا کر اپنے بیٹے کو اپنے گھر لے جا کر خوشی خوشی اُس کی پرورش کرتا۔ اور جہاں تک بیوی کی ناراضگی ہے وہ اُس کی بھی پروانہ کرتا۔ وہ آنا فلیپو ونا کے آگے زمین پر گھٹنے ٹیک کر اُس سے کہتا۔

''آنا فلیپو ونا! مجھ سے گناہ سرزد ہوا ہے۔ یہ میرا ہی بچہ ہے اور میں تمہارا گنہگار ہوں...... شرمندہ ہوں کہ میں نے تمہارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے مگر اب سنگین سوال بچّے کے مستقبل اور اُس کی پرورش کا ہے لہٰذا اس پر ترس کھاتے ہوئے پلیز اپنے شوہر کو معاف کردو...... ہمارے کوئی اولاد نہیں ہے...... ہم اپنے بیٹے کو اچھی طرح پال لینگے۔'' اس کا دل بہ آواز بلند کہہ رہا تھا۔

''ہاں میگوئیف آنا فلیپو ونا ایک رحمدل خاتون ہے۔ وہ تمہیں ضرور معاف کردیگی اور تمہارا بیٹا تمہارے سایہ شفقت میں پل کہ بڑھاپے میں تمہاری ہمت اور طاقت بن کر تمہاری دیکھ بھال کریگا...... تمہارا سہارا بنے گا۔''

مہلکن کے مکان کے سامنے پہنچ کر اُس کے قدم خود بخود رُک گئے۔ اور اُس کے پردہ ذہن پر نئے نئے منظر اُبھرنے لگے۔ اُس نے دیکھا وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا اخبار پڑھنے میں محو ہے کہ تبھی آگے سے اُٹھی ناک والا ایک بچہ گھٹنوں کے بل قریب آ کر اُس کے گاون کا بلو کھینچنے لگتا ہے اور پھر ناگاہ ہی منظر بدل جاتا ہے۔ اُس کا باس اُسے دیکھ کر طنزیہ مسکرا رہا ہے...... اس پر اُنگلیاں اُٹھائی جا رہی ہیں جگہ جگہ اُس پر فقرے چُست کئے جا رہے ہیں۔ اور ہر چند کہ اس کا ضمیر اُس کے دل کی سختی میں نرمی لانے میں کامیاب تھا پھر بھی کانپتے ہاتھوں سے اس نے بچّے کو مہلکن کے دروازے کے آگے زمین پر لٹا دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اُس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اُس نے بڑے پُر سوز لہجے میں کہا۔

''میرے معصوم مگر بدنصیب بچّے اپنے ظالم باپ کی مجبوری کو دھیان میں رکھ کر اپنے دل میں میل مت رکھنا اور مجھے معاف کر دینا۔''

اور قبل اس کے کہ وہ بچے کو اس کے حال پر چھوڑ کر اور جی کڑا کر کے وہاں سے واپس لوٹ آتا۔ اُس کے ضمیر کی آگ نے ایکا ایکی بھڑک کر اُسے موم کی طرح پگھلا کر رکھ دیا۔ وہ بڑبڑا اُٹھا۔

''نہیں میرے جگر کے ٹکڑے نہیں......اب تم کسی غیر کے گھر میں نہیں بلکہ اپنے گھر میں اپنے باپ کے ساتھ رہو گے......لوگ بکواس کرتے ہیں تو کرتے رہیں......جہنم میں جائیں یہ زمانے والے......یہ اُنگلیاں اُٹھانے والے......میں اب کسی سے بھی نہیں ڈرتا ہوں۔''

اُس نے لپک کر بچّے کو زمین سے اُٹھا کر اپنے سینے سے لگایا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔

''اب مجھے کسی کی بھی کوئی پروانہیں ہے۔'' اس نے سوچا۔

''اب میں گھر جا کر آنا فلیپو ونا کے آگے زمین پر گھٹنے ٹیک کر اُس کو سب کچھ صاف صاف بتا دونگا ور معافی مانگ لوں گا۔ وہ ایک رفیق اُلقلب اور رحمدل خاتون ہے۔ ضرور معاف کر دیگی پھر ہمارا بچہ ہمارے گھر میں ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔ اگر یہ لڑکا ہوا تو ہم اس کا نام دلادیمیر رکھیں گے اور اگر لڑکی ہوئی تو اسے آنا کے نام سے پکارا کرینگے۔''

اور پھر جو عہد اس نے اپنے دل میں رکھا تھا اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے اُس نے آنا کے آگے گھٹنے ٹیک کر ایک گناہ گار مجرم کی طرح سر جھکا کر بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''رحم آنا فلیپو ونا رحم......میں تمہارا مجرم ہوں......مجھ سے گناہ سرزد ہوا ہے......یہ بچہ میرے گناہ کی ایک جیتی جاگتی نشانی ہے......یہ میرا بچہ ہے......تم ہماری گھریلو خادمہ اکسینا سے تو واقف ہو ہی ......ہاں اسی کو دیکھ کر میرے قدم بہک گئے تھے......اور میں وہ کر بیٹھا جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا......''

اور پھر یہ جانے بغیر کہ ان باتوں کا آنا فلیپو ونا پر کیا ردِّعمل ہوا وہ کسی چابک زدہ کُتے کی طرح بڑی برق رفتاری سے گھر سے باہر نکل گیا۔

''مجھے یہاں باہر بیٹھ کر اُس کے بُلانے کا انتظار کرنا چاہیے۔'' اس نے سوچا۔

''میرے اقبال جُرم سے اُسے شدید صدمہ پہنچا ہے۔ اس سے اُبھرنے میں اُسے تھوڑا وقت لگے گا تو ضرور مگر جلدی ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

پر مولائی ستار ہاتھ میں لئے جب اُس کے قریب سے گزرا تو وہ بار بار شانے اُچکا رہا تھا۔ اُس کے انداز وحرکات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ مضطرب اور پریشان سا ہے۔

''کیا بات ہے؟......کوئی پریشانی ہے کیا؟۔ میگوئیف نے دریافت کیا۔

''دھوبن اکسینا کی وجہ سے حیران وپریشان ہوں۔'' مولائی نے بتایا۔

''اکسینا اپنے نومولود بچّے کو پورچ میں لٹا کر دومنٹ کے لئے باہر گئی تھی۔ پھر وہاں سے آکر مجھ سے قپ شپ مین مشغول ہوگئی۔ اسی دوران کوئی اُس کا بچّہ اُٹھا کر لے گیا ہے۔ وہ اب پاگلوں کی طرح اپنے بچّے کو بستی میں ڈھونڈھتی پھر رہی ہے۔''

''کیا؟......یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟۔'' میگوئیف گلے کے بل چیخ اُٹھا۔

پر مولائی نے مالک کے چلانے کو اس کی ناراضگی پر محمول کیا لہٰذا ندامت بھرے لہجے میں اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

''معاف کیجئے گا مالک! یہ بات تو آپ بھی جانتے ہیں کہ عورت کے بغیر مرد رہ ہی نہیں سکتا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں بتائے دیتا ہوں کہ میں نے جو بھی ایسی ویسی حرکت کی ہے وہ حویلی کی چہار دیواری میں رہ کر کی ہے باہر کبھی کچھ نہیں کیا ہے۔'' اُس نے دیکھا مالک اُسے ایسی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جیسے کہ وہ کوئی بھوت ہو۔ اُس نے ندامت کے ساتھ اپنا بیان جاری رکھا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں گناہ کا مرتکب ہوا ہوں مگر آپ کا حکم ہی ایسا تھا کہ کوئی اجنبی عورت حویلی میں نہیں آنی چاہئے۔ لہٰذا جب تک ایگنیا یہاں رہی باہر کی کسی عورت نے حویلی میں قدم نہیں رکھا۔ ایگنیا کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کیونکہ چوری چھپے اپنی پریشانی میں اُس سے رفع کرلیا کرتا تھا مگر اس کے چلے جانے کے بعد مجھے شرمندگی ہے مالک! کہ مجھے آپ کی حکم عدولی کرنی پڑنی اور میں چوری چھپے باہر کی عورتوں کو حویلی میں بُلانے لگا۔''

''دفع ہو جاؤ یہاں سے کُتے کے بلّے۔'' میگوئیف نے زمین پر پاؤں ٹپک کر غصّے کا اظہار کیا اور خوشی سے ہانپتا کانپتا ہوا لپک کر حویلی میں داخل ہو گیا۔

آنا فلیپو ونا متحیر و مشتعل سی گم صم حالت میں اُسی جگہ موجود تھی جہاں وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ اُس کی نگاہیں بچے پر مرکوز تھیں اور اس کی اُداس آنکھوں سے لگاتار اشک چھلک کر اس کے رخساروں پر موتیوں کی طرح دمک رہے تھے۔

''ارے واہ! کیا رونی صورت بنا رکھی ہے۔'' میگوئیف نے چہرے پر مسکراہٹ کے رنگ بکھیرتے ہوئے بلبل کی طرح چہکتے ہوئے کہا۔

آپ نے تو کمال کر دیا کہ ہمارے ذرا سے مذاق کو سچ مان کر منہ لٹکائے بیٹھی ہیں۔ اچھا بابا آئندہ ایسا مذاق کبھی نہیں کرینگے وعدہ کرتے ہیں اب تو مسکرا دو۔ یہ میرا نہیں اکسینا دھوبن کا بچّہ ہے جسے آپ بھی جانتی ہیں۔ اب آنسو پونچھ کر یہ بچّہ پر مولائی کو دے دیجئے وہ اسے اس کی ماں کے پاس پہنچا دیگا۔''

اب وہ اُس بدکردار ایگنیا کی دھمکی سے ذرا بھی خائف نہیں تھا۔

............☆☆☆............

☆......نکولائی گوگول

☆......رفیق شاہین

ایک دیوانے کی ڈائری

☆ پاگل کو سبھی لوگ پاگل کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ جاننے کی کوشش کوئی نہیں کرتا کہ پاگل کی نفسیات کیا ہوسکتی ہے۔؟ وہ حیات و کائنات کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔؟ معاشرے میں رونما ہونے والے اچھے بُرے واقعات کا ایک غیر صحیح اُلدماغ پر کیا ردِّعمل ہوسکتا ہے؟ روس کے ممتاز اور شہرہ آفاق ادیب نکولائی گوگول نے نہ صرف ان سوالات کا جواب حاصل کیا ہے بلکہ اس اچھوتے اور بے عدیل و بے نظیر موضوع پر دلچسپ، درد انگیز اور ہوش و حواس پر چھا جانے والی ایک ایسی لافانی اور شاہکار کہانی تخلیق کی ہے جو ایک پاگل کی بتدریج بد سے بدتر ہوتی دماغی حالات کی آئینہ دار ہے اور اس موضوع پر اس انداز میں قلم اُٹھانے کا آج تک دنیا کے کسی بھی ادیب کی حوصلہ نہ ہوسکا۔ (ترجمہ نگار) ☆

☆ اکتوبر ۳

آج میرے ساتھ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ سویرے میری آنکھ ذرا دیر سے کھلی تھی۔ ماروا میرے جوتے پالش کر کے لائی تو میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ دن کے دس بج چکے ہیں۔ میں اٹھا اور عجلت میں لباس تبدیل کرنے لگا مگر سچ پوچھو تو دفتر جانے کا میرا ارادہ ہی نہیں تھا کیوں کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ دفتر میں میرا استقبال کس طرح کیا جائے گا۔ میرا اسیکشن انچارج میری شکل دیکھتے ہی سڑا سا منہ بنا کر وہی رٹے رٹائے برسوں پُرانے فقرے دہرانا شروع کر دیگا "بولو کیا ہوا ہے تمہیں، آخر کیا ہوگیا ہے تمہیں، کیا بالکل ہی سٹھیا گئے ہو کہ چھوٹے چھوٹے ڈرافٹ بھی ڈھنگ سے نہیں لکھ پاتے، نہ القاب نہ آداب نہ حوالہ نمبر نہ تاریخ، تمہارا یہ اول جلول کام تو شیطان کو بھی پسند نہ آئے گا"

بوڑھا بیمار کوا کہیں کا، خدا اُسے غارت کرے، بڑا کینہ پرور ہے کمینہ...... مجھ سے تو خدا واسطے کا بیر ہے اُسے، حاسد اور بدخواہ جو ٹھہرا، آپ اُس سے ایک ماہ کی پیشگی تنخواہ مانگ کر دیکھ لیجئے، فوراً ہی نہ میں سر ہلا دیگا۔ اُس کی خوشامد کیجئے، ٹھوڑیوں میں ہاتھ ڈالئے، اس کے پاؤں میں سر رکھ کر گڑگڑائیے مگر وہ پگھلنے والا کہاں ہے، اگر آسمان سے خدا زمین پر اُتر آئے تو یہ تو اُس کی بھی ماننے والا نہیں ہے۔ وہ تو شکیسپیر کے "شائی لاک" کا بھی باپ ہے، آپ بھوکوں مرتے ہوں تو مر جائیں، اس کی صحت پر کیا اثر دفتر میں تو اُس کا یہی رویہ ہے جبکہ گھر میں اس کا سر چڑھا اور منہ لگا باورچی بات بات میں اُس کے منہ پر طمانچے مارتا ہے اور یہ اُس سے پٹتا ہے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، ایک ایک کو معلوم ہے۔ ان حالات میں دفتر میں کام کرنے کی بات میری سمجھ میں تو آئی نہیں ہے۔

بارش ہو رہی تھی۔ میں نے کوٹ پہنا، چھاتہ ہاتھ میں لیا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ اس وقت گلی میں سوائے بزرگ خواتین کے کوئی بھی نہیں تھا۔ اُن خواتین نے بارش سے بچنے کے لئے اپنے کوٹ کے

فاضل حصے میں اپنے چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ اُن کے علاوہ کچھ تجارت پیشہ افراد بھی اپنے اپنے چھاتے تانے ادھر سے اُدھر آجا رہے تھے۔ ان کے علاوہ چوراہے سے گزرتا ہوا مجھے ایک ہی شریف آدمی دکھائی دیا۔ میں نے دل ہی میں کہا۔ آخاہ! تو جناب والا حسین و جوان خواتین کی تلاش میں ہیں تاکہ ذوق نظارگی سے لطف اندوز ہو سکیں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ تبھی مجھے اپنے ڈائریکٹر کی بگھی دکھائی دی جو قریب ہی ایک دکان کے نزدیک آکر رُکی۔ میں نے فوراً ہی اپنا چہرا اپنے کوٹ کے کالروں میں چھپا لیا اور دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ بگھی سے میرے ڈائریکٹر کی بیٹی نمودار ہوئی اور اُس نے اُچٹتی سی نگاہ سے آس پاس کا جائزہ لیا۔ اُس کی خوبصورتی میں اُس کی کمان سی تنی بھوؤں کو بھی بڑا دخل تھا۔ اُس کی لمبی لمبی گھنیری پلکوں پر پھڑ پھڑاتی ہوئی فاختہ کا گمان ہوتا تھا۔ وہ خود بھی کسی چڑیا کی طرح پھُدکتی ہوئی آگے بڑھ کر ایک دکان میں داخل ہو گئی اور میرا دل زور سے دھڑک اُٹھا۔ تبھی دو ماں بیٹیاں ایک چھاتے کے تلے میرے قریب ہی آکر کھڑی ہو گئیں۔ اُن کے ساتھ ایک کتا بھی تھا جس نے ڈائریکٹر کی بیٹی کے کتے میگی کو جو دکان کے باہر ہی رہ گیا تھا پہچان لیا اور بولا۔ ''ہلو میگی تم کیسے ہو۔؟''

''میں بیمار تھا......'' اُس نے مزید کہا۔ ''میں نے تمہیں ایک خط بھی لکھا تھا فدیلی! مگر وہ بد بخت پولکن ہے نا، وہی میرا خط دبا کر بیٹھ گیا مگر میں نے بھی جُرمانے میں اس کی تنخواہ میں سے پیسے کاٹ لئے ہیں۔''

میری حیرت آسمان کو چھو رہی تھی اور بات ہے بھی حیرت اور تعجب کی میں نے کیا کسی نے بھی کبھی کتوں کو اس طرح آپس میں بات کرتے نہیں دیکھا ہوگا مگر آج اپنی آنکھوں اور کانوں سے دیکھ اور سُن بھی لیا۔ یہاں اس بات کے اعتراف میں مجھے کوئی عار نہیں ہے کہ کچھ دن سے میرے ساتھ یہی ہو رہا ہے کہ ناقابل یقین واقعات بار بار میرے مشاہدے میں آرہے ہیں اور کتوں کی باہمی گفتگو اور ان میں مکتوب نگاری کا چلن میرے دعوے کی پختہ دلیل ہیں۔

☆ اکتوبر ۴

بدھ کے دن ڈائریکٹر نے مجھے آفس میں طلب فرمایا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اُسے بہت سے قلم پاس رکھنے کا شوق ہے لہٰذا وہاں جا کر میں نے بہت سے قلم تراش کر جب اس کے چیمبر میں اُسے پیش کئے اور اُس نے شکریے کے ساتھ قبول فرمائے تو مجھے لگا وہ مجھے پسند کرتا ہے۔ اس بات سے مجھے خوشی تو ہوئی مگر فوراً ہی ایک نئے خیال نے مجھے پھر سے اُداس کر دیا۔ وہ نیا خیال یہ تھا کہ کاش اس کی پری چہرہ بیٹی بھی مجھے اسی طرح چاہتی جیسا کہ اُس کا باپ مجھے چاہتا ہے۔

مجھے مطالعہ گاہ میں بیٹھے ہوئے ساڑھے بارہ بج چکے تھے مگر ڈائریکٹر اپنے کمرے سے ابھی تک باہر نہیں آئے تھے۔ پھر کوئی ڈیڑھ بجے حویلی کا ایک دروازہ کھلا میں سمجھا ڈائریکٹر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ میں کاغذات کی فائل ہاتھ میں لئے لپک کر آگے بڑھا تو دیکھا کہ وہ ڈائریکٹر صاحب نہیں تھے بلکہ وہی قیامت وہی مہ لقا اپنی بھرپور جلوہ سامانیوں کے ساتھ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اُس کے ہنس کے پروں سے بھی زیادہ سفید پوشاک اُس پر خوب سج رہی تھی اور اُس کی آنکھیں چاند تاروں کی طرح تاباں و درخشاں تھیں اور اُس کے چہرے سے کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں۔

پھر ایکا ایکی ایک شیریں نغمہ فضا میں تیرتا ہوا سماعت کے راستے روح میں حلول کر گیا اور مجھ پر وجدانی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ کہہ رہی تھی ''پاپا تو گھر سے نکل چکے ہیں۔'' ہائے! کیا آواز تھی، قند سے زیادہ شیریں اور برفی سے زیادہ لذیذ۔ میں کہنے ہی والا تھا کہ یور ایکسیلینسی! اور میری جانِ عزیز! دور رہ کر ایسے تو میری جان مت لو، جان لینا ہی ہے تو اپنے ان حسین ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دو، مجھے پھانسی پر چڑھا دو اور اس سے پہلے کہ میں لب کھولتا اُن محترمہ کے ہاتھ سے رومال چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ میں رومال اُٹھانے کے لئے لپکا تو ایکا ایکی مرا پاؤں پھسل گیا۔ کمرے کا فرش ہی ایسا چکنا تھا۔ میری تو ٹانگ ہی ٹوٹ گئی مگر میں فرش سے رومال اُٹھانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ ریشمی رومال تھا جس میں عنبر کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ میرے ادب سے رومال پیش کرنے پر اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور ایک بار پھر میرے کانوں میں نقرئی گھنٹیاں سی بج اُٹھیں۔ وہ بڑی بے تعلقی سے کمرے میں واپس چلی گئی تھی۔ ابھی آنکھوں کی پیاس اچھی طرح بجھی نہیں تھی لہٰذا دیدارِ یار کی آس لگائے اور ڈیرہ جمائے میں بھی وہاں بیٹھا ہی رہا۔ جب کافی وقت گزر گیا تو کہیں سے حویلی کے دربان نے نمودار ہو کر مجھ سے کہا کہ صاحب کے آنے میں تو وقت لگے گا مجھے چاہئے کہ میں کسی اور وقت میں اُن سے ملاقات کروں۔ آہ! پھر میں نے اپنا کوٹ خود پہنا کیونکہ کوٹ پہننے میں دربان نے میری مدد ہی نہیں کی۔ مجھے اس گستاخ اور بے ادب دربان پر غصہ تو بہت آیا مگر کچھ کہہ نہ پایا اور سر پر ہیٹ رکھ کر طوعاً و کرہاً وہاں سے چلا آیا۔

گھر آ کر مجہولوں کی طرح تا دیر بستر پر پڑا میں پشکن کی شاعری سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس کی عشقیہ نظمیں میرے جذبات کی ترجمان تھیں۔ میں نے اپنی پسند کی بہت سی لائنیں نقل بھی کیں اور پھر شام ہونے پر ایچ ای روڈ پر تا دیر اس اُمید میں بھٹکتا رہا کہ شاید اُن محترمہ کی گاڑی اِدھر سے گزرے اور ایک بار اور اُن کے دیدار کا شرف حاصل ہو جائے۔ مگر اُمید بر نہ آئی تو بے نیل و مرام واپسی پر مجبور ہونا پڑا۔

☆ نومبر ۶

میرے سیکشن آفیسر نے تو میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔ لگتا ہے وہ مجھے پاگل ہی بنا کر چھوڑے گا۔ اس کے طلب کرنے پر جیسے ہی میں آفس پہنچا مجھے دیکھتے ہی وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ کہنے لگا۔

''تو جناب والا اس کھیل کے بھی شوقین ہیں۔؟'' ''کیسا کھیل۔؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کا اشارہ کس کھیل کی طرف ہے۔ میرا تو کسی بھی کھیل کو دسے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔''

''تو پھر اب مجھ سے سُنو۔'' اُن نے مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''جنابِ اکیسنی ایوانو وِچ آپ نے اپنی عُمر کی کم از کم چالیس بہاریں تو دیکھ ہی لی ہیں حیرت ہے کہ آپ کو نہ تو اپنی عُمر کا پاس و لحاظ ہے اور نہ حیثیت کا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ جو آپ کر رہے ہیں کیا وہ آپ کو زیب دیتا ہے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں میں آپ کی حرکتوں سے واقف نہیں ہوں۔ جناب میں اچھی طرح واقف ہوں کہ آپ اس وقت بھی ڈائریکٹر صاحب کی بیٹی کے تصور میں کھوئے ہوئے ہیں۔ سوچئے جناب سوچئے کہ آپ اور آپ کی اوقات کیا ہے۔ جناب نہ تو آپ کی کوئی حیثیت ہے اور نہ وقعت آپ کو کسی چرچ کے فاقہ زدہ چوہے سے بھی گئے گزرے ہیں۔ آئینے میں بھی اپنی شکل ہی دیکھ لیجئے شاید آپ کو یہ منہ اور مسور کی دال والا محاورہ ہی یاد آ جائے آپ کو دیکھ کر تو سڑک چھاپ غلیظ دوا فروشوں کی یاد تازہ ہو

جاتی ہے۔ جناب آپ کی بھلائی اسی میں ہے کہ آپ اپنی یہ واہیات حرکتیں فوراً بند کر دیجئے۔''

میں سمجھ گیا۔ خوب اچھی طرح سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیوں کہہ رہا ہے۔ دراصل میرے چہرے پر میری کامیابی کی جھلک دیکھ اُس کا جذبہ حسد بھڑک اُٹھا ہے۔ رقابت کے احساس نے اُسے پاگل بنا دیا ہے اور وہ اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا ہے۔ آخر اس نے مجھے سمجھا کیا ہے۔ کیا میں کسی نیچ خاندان کا فرد ہوں۔؟ ہرگز نہیں۔ میرا تعلق بھی بطقہ اشرافیہ سے ہے۔ وہ مجھے میری عمر کا طعنہ دے رہا تھا۔ ٹٹولر کرنسل کی معمولی درجے کی ملازمت سے ترقی کر کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوسکتا ہوں۔ اگر کہنے پر آتا تو بہت کچھ کہہ کر میں اس کی بولتی بند کر سکتا تھا مگر اس گھٹیا حاسد کے منہ لگنا مجھے اپنی شان کے خلاف لگا لہٰذا کچھ بھی نہ کہہ کر میں نے یہی بہتر سمجھا کہ میں اُس کے منہ پر تھوک دوں ااس لئے میں نے حقارت سے اُس کے منہ پر تھوک دیا اور فوراً ہی دفتر سے باہر نکل آیا۔

☆نومبر ۸

آج تھیٹر میں ایک روسی مسخرے نے مجھے بہت ہنسایا۔ وہاں جو ڈرامہ اسٹیج کیا گیا وہ خاصہ دلچسپ تھا۔ ڈرامے کے ذریعے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ تاجر پیشہ لوگ معاشرے کی پیشانی کا کلنک ہیں کہ ان ٹھگوں کے دولت مند اور عیاش بیٹے اپنی دولت کا سہارا لے کر طبقہ اشرافیہ کی خواتین کو گمراہ کیا کرتے ہیں۔ مجھے اپنے باذوق ہونے پر فخر ہے کہ جب بھی میری جیب میرا ساتھ دیتی ہے میں سیدھا تھیٹر کا رخ کرتا ہوں۔ جب کہ ہمارے دہقانی کلرک تو ایسے کورذوق واقع ہوئے ہیں کہ آپ اگر ٹکٹ خرید کی بھی انہیں دیدیں وہ تب بھی تھیٹر نہیں جائینگے۔

☆نومبر ۹

آج صبح ٹھیک آٹھ بجے تیار ہو کر سیدھا آفس پہنچا۔ سیکشن انچارج ایسا انجان بنا رہا جیسے کل کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ میں نے بھی پچھلی باتوں کو اکھاڑنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے کام سے کام رکھا۔ پھر جیسے ہی شام کے چار بجے گھر آ گیا۔

☆سمبر۔۳

اکثر اوقات میں طبقاتی امتیازات کی نوعیت پر بھی غور و خوض سے کام لیا کرتا ہوں میری سوچ کا زاویہ کچھ یوں ہوتا ہے کہ میں اگر ایک معمولی حیثیت کا ٹٹولر کاؤنسلر ہوں تو کیوں ہوں؟ اور اس بات کا ثبوت ہی کیا ہے کہ میں واقعی ٹٹولر کاؤنسلر ہی ہوں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ میں ایک جلیل اُلقدر جنرل کے عہدے پر فائز ہوں۔ ھر بھی اس معاملے میں حتمی طور پر کچھ کہنا ابھی میرے لئے ممکن نہیں ہے کیونکہ ابھی میں خود بھی نہیں جانتا کہ میں اگر کچھ ہوں تو کیا ہوں اور کیوں ہوں اور اگر کچھ نہیں ہوں تو کیوں نہیں ہوں؟ مگر میری فکر بُلند ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تاریخی طور پر معمولی گڈریے بھی تخت و تاج کے مالک بنے ہیں اور معمولی کامگاروں نے بھی شہنشاہ بن کر ملکوں پر حکومتیں کی ہیں جبکہ میں تو ایک اعلیٰ خاندان کا ایک ذی حیثیت فرد ہوں۔ ہوسکتا ہے کل کو میں بھی ایک جنرل بنا دیا جاؤں اور میری بارعب وردی کی آستین اور چھاتی پر سجے تمغوں سے لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں پھر تو ہماری جانِ تمنا بھی اپنی مرمری باہیں ہمارے گلے میں حمائل کر دیگی اور اس کا باپ جو اپنے عہدے پر بڑا اتر تا ہے کیا میں اس کی

ذات نہیں جانتا۔؟ ذات کا بڑھئی ہے وہ بڑھئی۔ وہ انگلیوں کے پوروں سے مصافحہ اسی لئے تو کرتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں پڑی ٹھیکیں کہیں اُس کی ذات کا پردہ فاش نہ کردیں۔ وہ جب بڑھئی ہوکر بھی اونچا عہدہ پاسکتا ہے تو میں کیوں بلندی پر نہیں پہنچ سکتا۔ میں بھی ایک گورنر جنرل اور وزیر اعلیٰ بن سکتا ہوں مگر میں ابھی تک ایک ٹٹولر کا وُنسلر کی حیثیت سے کسی تاریک غار میں پڑا ہوں۔ کیوں؟ آخر کیوں۔؟

☆ دسمبر ۵

آج صبح سے ہی میں اخبار کے مطالعے میں محو ہوں۔ ملک اسپین کے دگرگوں سیاسی حالات نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ کہا جارہا ہے وہاں کے بادشاہ فریڈینینڈ (FREDINAND) ہشتم کی موت کے بعد حکمراں کے نہ ہونے سے ملک بے آسرا ہوگیا ہے۔ ایک مخصوص حلقے کا خیال ہے کہ مرحوم بادشاہ کی نابالغ بیٹی ازابیلا (IZABELA) تخت وتاج کی اصل وارث اور حقدار ہے۔ ایک اور حلقہ یہ بھی کہتا ہے کہ اسپین کا نیا بادشاہ جو فی الوقت کہیں چھپا ہوا ہے اچانک ہی نمودار ہوگا اور تخت وتاج پر اپنا قبضہ جمالے گا۔ یہ بات تو اب میری بھی سمجھ میں آچکی ہے کہ ایک نابالغ لڑکی جو جنس کے اعتبار سے عورت ہے وہ اپنی جنس تبدیل کرکے کیسے بادشاہ بن سکتی ہے۔ بادشاہ تو فطرتاً اور اصلاً ایک مرد ہی ہوتا ہے۔ میرا خیال بھی یہی ہے کہ ہونے والا بادشاہ کہیں فی الوقت چھپا ہوا ہے اور اس کی روپوشی کے پیچھے ضرور کوئی مصلحت یا مجبوری ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ فرانس اور برطانیہ کی امکانی جنگ سے خوفزدہ ہوکر کہیں روپوش ہوگیا ہو۔

☆ دسمبر ۸

ہسپانیہ کی اس سیاسی اُتھل پتھل نے مجھے دماغی طور پر اس قدر تھکا ڈالا ہے کہ میرا دفتر جانا بھی ممکن نہ ہوسکا اور میں بس یہی سوچتا رہا کہ وہ شہزادی کو کیسے تخت پر بٹھا سکتے ہیں جبکہ یورپی ممالک بالخصوص برطانیہ، فرانس اور اسٹریا تو ایسا ہرگز ہرگز بھی نہ ہونے دینگے۔ اس سنگین سیاسی مسئلے پر مسلسل غور وفکر میں مبتلا رہنے کے سبب میری صحت پر کافی مضرت رساں اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ماروا نے مجھے بتایا ہے کہ مجھ پر عجیب سی جنونی کیفیت طاری تھی۔

میرا چہرا خوفناک ہوگیا تھا اور گھر میں جتنی بھی چینی کی پلیٹیں اور شیشے کے گلاس تھے وہ سب کے سب میں نے فرش پر ٹپک کر توڑ دیے ہیں۔

☆ تینتالیسواں دن، ماہ اپریل: سال ۲۵۰۰ ع:۔ آج کے تاریخ ساز واقعے کی خوشی میں ہم نے ایک عظیم اُلشان اور یادگار جشن منایا ہے۔ آج ہسپانیہ کو اس کا حقیقی تاجدار اور شہنشاہ مل چکا ہے اور وہ شہنشاہ کوئی اور نہیں میں ہوں، جی ہاں میں یہ حقیقت مجھ پر آج ہی منکشف ہوئی ہے۔ روشنی کا ایک جھما کا سا ہوا اور ایکا ایکی مجھے عرفان حاصل ہوا کہ میں ہی شاہ ہسپانیہ ہوں۔ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ آخر کیوں اتنے عرصے میرے دماغ میں یہ غلیظ کیٹرارینگ کر کہ میں ایک حقیر ٹٹولر کا وُنسلر ہوں، مجھے گمراہ کرتا رہا۔ اس گندی سازش میں میرے حاسد دشمنوں کا ہاتھ رہا ہے کہ انہوں نے ایک پُرسطوت شہنشاہ کو لمبے عرصے تک ایک ٹٹولر کا وُنسلر کے غلیظ تابوت میں بند رکھا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے تو ہمات کے اس تابوت کو توڑ کر سچائی کی روشنی میں آنے کی قوت عطا فرمائی۔ جیسے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی دیتا ہے اسی طرح اب

مجھ پر حقیقت عُعیاں اور نمایاں نظر آرہی ہے اور ایسا لحظہ بھر میں ہوا ہے۔ بس سمجھئے جیسے بحر کیپین سے تازہ ہوا کی ایک موج اُٹھی، ادھر آئی اور جیسے ہی مجھ سے ٹکرائی مجھ پر سات طبق روشن ہو گئے۔ نظروں کے آگے کی ساری دھند غائب ہو گئی اور مجھ پر میری ذات مکمل طور پر منکشف ہو گئی۔ لگتا ہے میں کوئی ولی کامل ہو گیا ہوں۔

مارواجب چائے کی ٹرے لئے میرے نزدیک آئی اور جب یہ نئی بات میں نے اُسے بتائی تو ایک شہنشاہ کو جاگتی آنکھوں سے اپنے مدمقابل کھڑا ہوا پا کر حیرت وخوشی کا اظہار بھی نہ کر پائی کہ سطوت شاہی کے رعب ودبدبے کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو کر زمین بوس ہو گئی۔ بے چاری نادان عورت!۔ پھر جب وہ ہوش میں آئی تو شاہی آداب سے ناواقفیت کے سبب جان سے جانے کا خطرہ لاحق ہو جانے کے خوف نے اس کی حالت کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں خوف کے لرزتے ہوئے سائے مجھے صاف طور سے نظر آرہے تھے مگر جب اُس نے دیکھا کہ وہ شاہی عتاب سے محفوظ ہے تو اس کی جان میں جان آئی اور وہ چائے کے خالی برتن سمیٹ کر فوراً ہی کمرے سے باہر چلی گئی۔ جاہل مطلق اور گنوار ہے بے چاری! اس نے مجھے بھی شاہِ ہسپانیہ فلپ جیسا و جابر شہنشاہ خیال کیا تھا۔

☆ مارچو بر ۸۶ شب و روز کا کوئی وقفہ

آج میرے دفتر کا ایک ساتھی میرے پاس آیا اور کہا بلا چھٹی کی درخواست منظور کرائے میں تین ہفتے سے دفتر سے غائب ہوں۔ مجھے حکم ہوا ہے کہ میں فوراً ہی دفتر میں حاضر ہو جاؤں۔ میں بطور تفنن طبع دفتر پہنچ گیا۔ میرا اسکیشن آفیسر متوقع تھا کہ میں جھک کر اُس کی تعظیم بجالاؤں گا اور دفتر سے غیر حاضری پر ندامت کا اظہار کروں گا اور اس سے معافی طلب کروں گا مگر میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ سب کو نظر انداز کر کے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چپراسی نے ضروری کاغذات کی فائل میرے سامنے لا کر رکھ دی مگر میں نے فائل کھولنا تک گوارہ نہیں کیا۔ اچانک ڈائریکٹر صاحب دفتر میں تشریف لے آئے۔ کلرکوں نے جلدی سے اپنے کوٹ کے کالر اور بٹن درست کئے اور فائلیں ہاتھوں میں لئے اپنے افسر کے چیمبر کی طرف چل پڑے مگر میرے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ بھلے ہی وہ دوسرے کی نظر میں کچھ ہوگا میری نظر میں تو بوتل کے سڑے کارک کی اہمیت تھی مگر اہمیت نہ تھی تو اُس ڈائریکٹر کی۔ پھر جب سیکشن آفیسر نے کچھ ڈرافٹ میرے سامنے رکھ کر ڈائریکٹر کے دستخط کی جگہ کے نیچے مجھے اپنے چھوٹے دستخط کرنے کو کہا تو مجھے اس میں اپنی توہین محسوس ہوئی کہ میں ڈائریکٹر کے دستخط کے نچلے مقام پر دستخط کروں لہٰذا اپنے دستخط کے لئے میں نے شعبے کے سربراہ کے دستخط کی جگہ کو پسند کرتے ہوئے اُس کی جگہ پر اپنے یعنی شاہ ہسپانیہ ''فریڈی نینڈ ہشتم'' کے دستخط کر دیے۔ اب کیا تھا شاہی تعظیم سناٹے میں آ گئی۔ سب کی زبانیں بند تھیں اور وہ خوفزدہ نگاہوں سے مجھے تک جا رہے تھے۔ میں نے اس پر بڑے پُر وقار اور شاہانہ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ...... ہے...... مزید تعظیم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اتنا کہہ کر میں فوراً ہی دفتر سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی جی چاہا کہ کیوں نہ اپنی جانِ تمنا کا دیدار کیا جائے لہٰذا اس کی کوٹھی پہنچ ہی جو گیا۔ دربان نے مجھے یہ کہہ کر روکنے کی کوشش کی کہ ڈائریکٹر صاحب دفتر میں ہیں۔ یہ بات تو مجھے بھی معلوم تھی۔ میں دربان کو سُنا ان سنا کر کے آگے بڑھا تو دربان نے سامنے آ کر پھر سے مجھے روکا تو جلال

شاہی سے میرا چہرا انتہائی ہیبتناک وخوفناک ہوا تھا۔ دربان سہم کر رہ گیا۔ اسے سکتے کے عالم میں چھوڑ کر میں فی الفور زنان خانے میں گھس گیا۔ وہاں وہ سنگھار میز کے مدمقابل بیٹھی میک اَپ کرنے میں مشغول تھی۔ میری آہٹ پاکر اس نے مجھے مُڑ کر دیکھا تو وہ مضطرب ہوکر اور چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس مہ لقا کو دیکھتے ہی میری روح میں سرور سا گھل گیا۔ جی چاہا بس اُسے یوں ہی دیکھتا رہوں مگر وہ کمرے میں رُکی نہیں اور مجھ سے خوفزدہ ہوکر دوسرے کمرے میں جانے لگی۔ مگر اس کے جاتے جاتے بھی میں حالِ دل بیان کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ میں نے اس کو بول ہی دیا کہ ''اے میرے خوابوں کی حسین شہزادی تمہارا یہ عاشق صادق تمہیں پاکر ہی رہے گا۔ یہ دنیا والے ہمیں ایک ہونے سے کبھی نہ روک سکیں گے۔'' جب تک میں اپنی بات مکمل کرتا وہ اس سے پہلے ہی دوسرے کمرے میں جاکر بند ہوگئی۔ کواڑ اندر سے بند ہونے پر مجھے بڑی مایوسی ہوئی اور میں بددل ہوکر فوراً ہی کوٹھی سے باہر نکل آیا۔

☆ بے تاریخ کا دن کوئی نہ کوئی مہینہ

نیوسکی پروسپیکٹ روس کی قدیم راجدھانی پیٹرس برگ کا سب سے خوبصورت علاقہ ہے جہاں خوبصورت چوراہا، کشادہ شفاف سڑکیں، خوبصورت بلند عمارتیں اور دریائے نیوسکی پر ایستادہ پل بڑا خوبصورت نظارا پیش کرتا ہے۔ میں دیر سے اسی علاقے کی سیر سے محظوظ ہو رہا تھا تبھی شہنشاہ روس زار کا شاہی جلوس اسی طرف آتا دکھائی دیا۔ ساری مخلوق جلوس کے دائیں بائیں واقع فٹ پاتھوں پر اپنے اپنے ہیٹ ہاتھوں میں لئے اور سر جھکائے ہوئے شاہِ روس کی تعظیم بجالانے میں مصروف تھی۔ اُن کی طرح میں بھی شاہ کی تعظیم بجالایا۔ اگرچہ میں بذات خود بھی ہسپانیہ کا ایک مطلق اُلعنان شہنشاہ تھا مگر سڑکوں پر متعارف ہونا مجھے اپنی شان کے خلاف معلوم ہوا۔ شاہوں کا استقبال تو شاہی درباروں میں ہی بھلا لگتا ہے۔ پھر دیگر نامناسب بات یہ بھی تھی کہ اُس وقت میں شاہی لباس میں نہیں تھا۔ شہنشاہ روس کو جبہ شاہی میں دیکھ کر میرے دل میں بھی یہ تمنا جاگ اٹھی کہ میں بھی اپنے لئے ایک ایسا ہی جبہ شاہی بنواؤں۔ میں وہیں اپنے دل میں یہ مصمم ارادہ کر چکا تھا کہ میں یہ جبہ شاہی درزی سے نہیں سلواؤنگا۔ درزی لوگ اوّل تو بے حساب چکر لگواتے ہیں دوسرے کام بگاڑ بھی دیتے ہیں اس لئے اپنا جبہ شاہی میں خود ہی تیار کرونگا۔ گھر آکر میں نے اپنے کمرے میں پہلے خود کو اندر سے بند کیا اور اپنی شاندار یونیفارم پر، جسے کہ صرف دوبار ہی پہنا تھا اس پر بے دریغ قینچی چلا دی۔ اسے ٹکڑے ٹکڑے کرتے وقت مجھے ذرا بھی دکھ اس لئے نہیں ہوا کہ اس کے پیچھے مجھے نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب شاہی جبّے کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

☆ تاریخ یاد نہیں اور مہینہ شیطان کی مٹھی میں بند ہے

یہ شاہی جبہ بالآخر سِل کر تیار ہو ہی گیا۔ میں نے اسے خوشی خوشی زیب تن کر لیا تو خواہش ہوئی کہ اس کی تعریف دوسروں سے بھی سُنوں۔ اسی خیال کے زیر اثر جب میں ماروا کے سامنے پہنچا اور اُس کی نظر مجھ پر پڑی کہ ناگاہ اُس کے حلق سے ایسی بھیانک چیخ نکلی کہ مرا دل اُچھل کر میرے حلق میں آ گیا اور میں بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گیا۔ روس کے شاہی دربار میں داخلے کی خواہش اگرچہ اب بھی شباب پر تھی پر بھی میں اس خیال سے خود پر قدغن لگائے ہوئے تھا کہ ابھی ہسپانیہ سے چل کر میرے نائبین مجھ تک پہنچ نہیں پائے تھے۔ شاہوں کے پیچھے جب تک کہ ان کے نائبین کی فوج نہ ہو شاہی رعب ودبدبہ قائم ہو ہی

نہیں سکتا۔

☆ پہلا دن

میری سب سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ میرے نائب ابھی تک یہاں نہیں آپائے ہیں۔ گمان گزرتا ہے کہ کہیں کسی نے اغوا کر کے نائبین کو یرغمال تو نہیں بنالیا ہے اس میں کہیں فرانس کا تو ہاتھ نہیں ہے...... ہوسکتا ہے...... بالکل ہوسکتا ہے...... کیونکہ فرانس اس وقت طاقت کے نشے میں چور ہے۔ خیر! اب مجھے ہی کچھ کرنا چاہئے۔ اسی کوشش میں جب پوسٹ آفس پہنچ کر میں نے اس بارے میں پوسٹ ماسٹر سے دریافت کیا تو اس نے کہا۔ ''جی نہیں ابھی ہسپانیہ سے نائبین آئے نہیں ہیں، آپ اپنا پیغام اور ڈاک خرچہ ہمیں دیدیجئے ہم آپ کا پیغام اسپین پہنچادینگے۔''

☆ میڈرڈ ۳۰ رفروری

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اب اپنے ملک ہسپانیہ کی مقدس سرزمین پر ہوں۔ میں یہاں کیسے پہنچا کچھ یاد نہیں ہے۔ یاد ہے تو بس اتنا ہے کہ میرے نائبین آئے اور انہوں نے اپنے ساتھ مجھے اپنی گھوڑا گاڑی میں بٹھالیا۔ اُن کی جادوئی گاڑی کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ محض نصف گھنٹے میں ہم لوگ ہسپانیہ کی سرحد میں داخل ہوچکے تھے۔ دراصل یورپ بھر میں فولادی سڑکوں کا حال سا بچھا ہے۔ یہاں گاڑیاں ہی نہیں بحری جہاز بھی تیرتے اور دوڑتے دیکھے جاسکتے ہیں۔ بڑا عجیب وغریب ملک ہے ہسپانیہ۔ جب یہاں ہم ایک وسیع کمرے میں پہنچے تو یہاں کچھ ایسے لوگ موجود تھے جن کے سر منڈے ہوئے تھے۔ شروع میں تو انہیں دیکھ کر میں نے یہی سمجھا کہ یہ ''ڈومنی کنس'' اور ''کیپوچنس'' فرقے کے لوگ ہوں گے۔ کیونکہ یہی لوگ سر منڈواتے ہیں۔ یہاں کے صوبائی گورنر کا طرزِ عمل مجھے بڑا جارحانہ محسوس ہوا۔ اُس نے بڑی بدتمیزی سے میرا بازو تھاما اور مجھے بڑی بے دردی سے ایک کمرے میں ڈھکیل کر بڑے گستاخانہ لہجے میں بولا۔

''چل بیٹھ یہاں اور پھر کبھی تو نے خود کو شاہ فریڈی نینڈ کہا تو پھر میں تجھے اچھی طرح دیکھ لونگا'' اس کے ساتھ ہی اُس نے میری کمر پر اتنی زور سے ڈنڈا مارا کہ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں نے اُس کے اس عمل کو فوجی سرداروں کے پُر جوش استقبال کے انداز پر محمول کر کے اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ پھر جب میں کمرے میں تنہا بیٹھا تھا کہ روشنی کے ایک جھماکے کے ساتھ جو راز کی بات مجھ پر منکشف ہوئی وہ یہ تھی کہ اسپین اور چین دو ملک نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ملک کے دو نام ہیں۔ بعد میں یہ نئی اور چونکا دینے والی بات میں نے لوگوں کو بتائی تو انہوں نے میری بات میں مطلق بھی دلچسپی نہ لی۔ میں نے اپنی بات کا یقین دلانے کے لئے یہ تک کہا کہ آپ کاغذ کے ٹکڑے پر ہسپانیہ لکھ دیں اور پھر اسے پڑھیں تو آپ کو وہاں چائنا لکھا ہوا ملے گا۔

ادھر آنے والے کل کا تصور بھی میرے لئے سوہانِ روح بنا ہوا ہے۔ اگلے دن ٹھیک سات بجے ہماری یہ دھرتی چاند کی سطح پر چاند کی طرح بجھ جائے گی یہ میرا کہا نہیں بلکہ برطانیہ کے ماہر و معتبر عطار جناب ولنگٹن کی پیش گوئی ہے۔ اس پیش گوئی سے میری پریشانی میں خاصہ اضافہ ہوگیا ہے کہ چاند کی زمین نرم ہے اور ہمارے چہروں کی ناکیں چاند پر خوشحالی کی زندگی بسر کر رہی ہیں جب ہماری سخت دھرتی چاند

کی نرم زمین میں دھنس جائے گی تو ہماری ناکیں تو وہاں زندہ دفن ہو کر رہ جائینگی۔ پھر جب ہماری وہ ناکیں جو ہماری آن بان اور شان کی علامت مانی جاتی ہیں ہمارے چہروں سے معدوم ہو جائینگی تو کیا ہم دنیا کی سب سے زیادہ پسماندہ قوم بن کر نہ رہ جائینگے؟ کیا یہ لمحہ فکریہ نہیں ہے۔؟ میں کمرے سے نکل کر بھاگتا ہوا سٹیٹ کاؤنسلر کے چیمبر میں گیا اور انہیں حکم دیا کہ آرمی کو فوراً الرٹ کیا جائے کہ زمین کو چاند پر اترنے سے ہر صورت سے روکا جائے۔ گنجے ڈومنی کنس اور کیپوچنس جن کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں بڑے فرمانبردار اور اطاعت گزار ثابت ہوئے۔ جیسے ہی میں نے اُن سے کہا کہ شاہی فرمان کے مطابق آپ لوگوں کا فرض بنتا ہے کہ آپ دھرتی سے چاند کو محفوظ رکھنے میں سرکار کی مدد کریں۔ اتنا سنتے ہی انہوں نے کمرے کی کھڑی دیواروں پر چھپکلی کی طرح تیزی سے اُوپر کی طرف چڑھنا شروع کر دیا کہ تبھی صوبائی گورنر وہاں آ دھمکا۔ اُس کے آتے ہی تمام گنجے دیواروں سے پھسلتے ہوئے فرش کی سطح پر آ گئے۔ میں بحثیت شہنشاہ ہسپانیہ کی صورتحال پر ابھی غور و فکر کر ہی رہا تھا کہ میری حیرت اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب اس گورنر نے مجھے بڑی بیدردی سے ڈنڈے سے پیٹنا شروع کر دیا پھر گھسیٹ کر مجھے میرے کمرے تک لے گیا اور اندر کی طرف ڈھکیل دیا۔ ہسپانیہ میں طاقت کا یہ بے جا استعمال مجھے بہت بُرا لگا۔

☆اسی سال کی جنوری جو فروری کے بعد آتی ہے

ہسپانیہ کے رسوم و رواج اور شاہی آداب کے طور طریقے میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ میں نہ تو ڈومنی کنس سے تعلق رکھتا ہوں اور نہ ہی کیپوچنس فرقے سے ہی مجھے کوئی نسبت ہے اور گنجاپن تو مجھے ایک آنکھ بھی نہیں بھاتا اس کے باوجود بھی میری مرضی کے خلاف ان لوگوں نے جبراً میرا بھی سَر اُسترے سے مونڈ ڈالا۔ میں ان لوگوں کی گرفت میں تڑپتا رہا، گلا پھاڑ کر چلاتا رہا۔ ''میرا سر مت مونڈو، میں راہب بننا نہیں چاہتا ہوں۔'' مگر اُن لوگوں نے میری ایک نہ سنی اُوپر سے برف کے پانی کی کئی بالٹیاں میرے سر پر اونڈھا دیں اُن کی ان سفاکانہ اور جابرانہ کارروئیوں کا مجھے پہلے سے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ گنجے سر پر برفیلے پانی کی تکلیف کو میں سہہ نہ سکا اور مجھے دورہ پڑ گیا مگر ان لوگوں کی مضبوط گرفت نے مجھے تڑپنے تک کی اجازت نہ دی۔ مجھے تو اس دستور میں دانش مندی کا کوئی پہلو نظر آیا نہیں۔ مجھے تو اس وقت ہسپانیہ کے اُن سابق شہنشاہوں پر بہت غصہ آ رہا ہے جنھوں نے ملک و معاشرے کی اصلاح کی خاطر ایسے لغو اور واہیات رسوم و رواج کے چلن کو مسترد کرنے میں ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں لی اور ہاں جس کو میں ابھی تک صوبائی گورنر سمجھتا رہا ہوں وہ تو کوئی تحقیقاتی افسر ہے۔ اس جابر کو کوئی کیسے سمجھائے کہ ایک شہنشاہ ہر طرح کے سوال و جواب اور تحقیق کھوج بین سے بالاتر ہوتا ہے۔ اور سچ پوچھو تو میرے ساتھ جو ہوا مجھے تو اس میں بھی فرانس کی سازش کارفرما دکھائی دیتی ہے۔ یہ شخص یقیناً ہی فرانس کا ظالم تحقیقاتی افسر ''پولی نیک'' ہے جس نے مجھے موت کے گھاٹ اتار دینے کا قصد کر رکھا ہے۔ اس کی متشدد دانہ کارروائیاں مجھے طرح طرح کی اذیتوں سے دوچار کئے ہوئے ہیں۔ میں جتنا سہتا ہوں وہ مجھ پر اتنا ہی ظلم ڈھاتا ہے مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ وہ برطانیہ کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن کر کر رہا ہے۔ انگریزوں سے بڑا سازشی تو روئے زمین پر کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تحقیقاتی افسر اُن کے ہاتھوں بکا ہوا ہے اور انہیں کے ایماً پر مجھے جہنمی عذابوں میں مبتلا کر رہا ہے۔

☆ پچیسواں دن

آج وہ ظالم تفتیش کار جب میرے کمرے میں آیا تو میں نے اُس کے قدموں کی آہٹ پہلے ہی سن لی تھی چنانچہ میں خوفزدہ ہو کر کرسیوں کے نیچے چھپ گیا۔ جب اُس نے مجھے کمرے میں غائب پایا تو مجھے پکارنا شروع کر دیا۔ "پوپرشچن"! میں خاموش رہا۔ اُس نے پھر صدا لگائی۔ "اکسینی ایوانوف ! ٹولر کاؤنسلر" میں پھر بھی نہ بولا تو اس نے پھر پکارا۔ "فریڈی ننینڈ ہشتم شاہِ ہسپانیہ" میں نے چاہا بول پڑوں مگر میں سمجھ گیا کہ یہ اُس کی چال ہے اس سے قبل کہ وہ میری گنجی کھوپڑی کو پھر سے برف کے پانی سے دھارنا شروع کر دے میں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی مگر وہ مجھے تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اس نے اپنے ڈنڈے کی مدد سے مجھے باہر گھسیٹ لیا۔ یہ ڈنڈا بھی کیسی ظالم چیز ہے جو بدن کو چھوتے ہی نس نس میں درد بھر دیتا ہے۔ ڈنڈے کے سہارے زمین پر گھسٹتے ہوئے مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ تفتیش کار غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اُس نے مجھے سزا دینے کی دھمکی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ لیکن اس کے زنانے غصّے سے میں ذرا بھی مرعوب نہ ہوا چونکہ میں جان چکا ہوں کہ وہ کوئی انسان نہیں بلکہ مشین ہے، ایک ایسی مشین جس میں انگریزی کل پُرزے لگے ہوئے ہیں۔

☆ فروری۔ ۳۴۹۔ ۳۴ سال

نہیں میرے مالک نہیں۔ اُن کا وحشیانہ اور ظالمانہ سلوک اب نہیں سہا جاتا۔ وہ برابر میرے سر پر برف کا پانی چھوڑتے ہیں۔ وہ میری کوئی بات نہیں سنتے۔ رحم و کرم کی التجاؤں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میری سمجھ میں تو یہی نہیں آتا وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ میری اُن سے آخر کیا دشمنی ہے؟ میں نے تو آج تک کسی کے ساتھ کبھی بُرا سلوک نہیں کیا پھر کیوں وہ مجھے جان لیوا اذیتوں میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ اُن کے متواتر ظلم سہتے سہتے اب تو میری جسمانی قوتِ مدافعت ہی سلب ہو چکی ہے۔ اُن کا مزید تشدّد اب مجھ سے نہیں سہا جائے گا۔ میرے دل میں آگ لگی ہوئی ہے۔ میری شریانوں میں درد کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ میری روح میں درد و کرب کا آتش فشاں بھڑک اُٹھا ہے۔ کائنات اور کائنات کی ہر شے میرے گرد تیزی سے گردش کر رہی ہے۔ مجھے چکّر آ رہے ہیں۔ بچالے میرے مالک مجھے بچالے۔ رحم کر مجھ پر اور میرے لئے تین گھوڑوں والی برق رفتار گاڑی ٹرویکا کا میرے لئے بندوبست کر دے۔ واہ مالک واہ! تیرے صدقے جاؤں کہ تو نے میری دعا قبول فرما ہی لی تبھی تو میں ٹرویکا میں بیٹھا ہوا اُڑتا ہی چلا جا رہا ہوں۔ اے میرے بہادر کوچوان ! تیز......اور تیز......گاڑی میں جُتے اے میرے جان نثار رفیقو! اپنی ٹاپوں کی تھاپ دیتے ہوئے......اپنے گھنگھروؤں کی موسیقی کا جادو جگاتے ہوئے......تیز......اور بھی تیز کر دو اپنی رفتار......کہ آج تمہیں بہیمانہ مظالم کی وحشی آندھیوں کے خلاف مقابلے میں ہر صورت فتحیاب ہو کر دکھانا ہے......ہمیں آج ہر حال میں اس جہنمی ملک کی خونی سرحد کے اس پار نکل جانا......ہوگا......شاباش میرے شیرو!......ایسے ہی......اسی رفتار سے......آگے......اور آگے......اور بھی آگے......اتنا آگے کہ پیچھے کے سارے منظر ہمارے تصور میں بھی نہ آسکیں......یہ دیکھو آسمان نے میرے سر پر شامیانہ تان رکھا ہے......اور دور وہاں ایک درخشاں ستارہ ٹمٹما رہا ہے......وہ دیکھو سامنے سیاہ دھبے جیسا نظر آنے والا وہ جنگل جس کے مضبوط تناور درختوں کی نرم و سبک شاخوں کو چنچل اور مست ہوائیں جھولا جھلا رہی ہیں......

اور اب تو آسمان کی پیشانی پر روپہلے چاند کا جھومر بھی جگمگا رہا ہے...... ہر طرف چاندنی چٹک رہی ہے...... راستے کی زمین سے ٹکرا کر گھوڑوں کی ٹاپیں تال دے رہی ہیں......اور خاموشی نغمہ بنی ہوئی ہے......سڑک کے ایک طرف ہے بحر روم کا ساحل ......اور دوسری طرف ملک اطالیہ (Italy) ہے...... جہاں ایستادہ روسی مکانات قطار اندر قطار نظروں سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ حالانکہ وہ اب بھی خاصے فاصلے پر ہیں مگر فاصلے اور دھند لکے کے باوجود بھی میں اپنے مکان کو صاف طور پر دیکھ رہا ہوں......وہ دیکھو مکان کے جھروکے میں کون بیٹھا؟......وہ کوئی اور نہیں ہے ......وہ میری ماں ہے جس کی آنکھیں انتظار میں خشک ہو چکی ہیں......وہ ٹکٹکی باندھے مجھ کو دیکھ رہی ہے۔

''ماں!......میری پیاری ماں!......بچا لے......اپنے معصوم اور مظلوم بچے کو ان ظالموں سے بچا لے...... اپنے بدقسمت بچے کے منڈے ہوئے سر پر اپنے مقدس آنسوؤں کی شبنم چھڑک دے......اپنے بے آسرا بچے کو اپنی چھاتی سے لگا لے ماں......ماں! اب فقط تو ہی میری آخری آس ہے......تو ہی میرا سہارا ہے ماں!...... یہ مجھے بڑی اذیتیں دے رہے ہیں ماں...... میں مر جاؤں گا ماں بچا لے...... مجھے بچا لے ماں۔''

..................☆☆☆..................

☆......الیکساندر پشکن

☆......رفیق شاہین

گردشِ رنگ چمن

کربلا پیتر ووچ ترئیکروف اور گدر یلووچ دیرِوفسکی دونوں فوج میں اعلیٰ منصب پر فائز تھے مگر اب وہ دونوں ہی اپنے عہدوں سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ دونوں زمیندار تھے اور آپس میں اچھے دوست بھی تھے۔ ان مثالی دوستوں کی آپس میں گاڑھی چھنتی تھی۔ دونوں نے شادیاں بھی اپنی پسند سے کی تھیں۔ مگر کچھ ہی عرصے پہلے دونوں کی بیویاں داغ مفارقت دیکر انہیں رنڈوا بنا چکی تھیں۔ دونوں کے پاس ایک ایک اولاد تھی۔ ترئیکروف بیٹی کا باپ تھا اور دیرِوفسکی بیٹے کا دونوں میں اگر کچھ فرق تھا تو بس حیثیت کا تھا۔ دیرِوفسکی کی ملکیت بس وہی گاؤں تھا جس میں ان کی بود و باش تھی۔ جب کہ ترئیکروف کا شمار بڑے اور نامی گرامی زمینداروں میں ہوتا تھا۔ بے شمار گاؤں، رفیع الشان حویلیاں اور انواع واقسام کے باغات ان کی جاگیر میں شامل تھے۔ گاؤں ''پوکروسکوئے'' میں واقع محل نما ان کی پرشکوہ حویلی کا زنان خانہ بچاسیوں کنیزوں سے آباد رہتا تھا۔ پرانی کنیزوں کی شادی کے بعد جو جگہ خالی ہوتی تھی اُسے فوراً ہی نوخیز کنیزوں کی بھرتی کر کے پُر کر دیا جاتا تھا۔ بڑے پیمانے پر فیوماً دعوتوں کی تقریبات منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ مگر نشہء اقتدار اور دولت کی فراوانی نے مزاجاً انہیں ضدی بنا دیا تھا۔ اپنی ضد میں وہ جس بات پر اڑ جاتے اُسے پایہ تکمیل کو پہنچا کر ہی دم لیتے تھے۔ اگر چہ دیرِوفسکی کی اُن کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں تھی مگر وہ اپنے دوست سے ملنے حویلی میں برابر آتے جاتے رہتے تھے۔ ترئیکروف کے دولت مند مہمانوں کو بے حیثیت دیرِوفسکی کی حویلی کی تقریبات میں شرکت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور وہ اس کے خلاف اپنے میز بان کے برابر کان بھرتے رہتے تھے۔ مگر اس کے باوجود بھی ان دونوں کی آپس میں دوستی بڑی مضبوط اور مستحکم تھی اور ترئیکروف نے تو دیرِوفسکی سے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ اگر اس کا بیٹا اچھے چال چلن والا ہوا تو اپنی بیٹی اسے بیاہ دینے میں اُنہیں کوئی تکلف نہ ہوگا۔ مگر دیرِوفسکی غیور اور خود دار انسان واقع ہوا تھا۔ اُسے اپنے دوست کی فراخدلانہ پیشکش میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی اپنی حیثیت کے گھرانے میں ہی کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔

دونوں کی مثالی دوستی یونہی چلی آرہی تھی کہ ان کی دوستی کی نہ جانے کس کی نظر لگ گئی اور کچھ کا کچھ ہو کر رہ گیا۔ ہوا یوں کہ یکا یک ترئیکروف نے شکار پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُسی دن شکار گاہ میں خیمے اور رسوئی گھر نصب کر دیے گئے اور کتا خانے کے منتظم کو بھی حکم سنا دیا گیا کہ کل صبح شکار کے لئے کُتے تیار رکھے جائیں۔ اس کے بعد مہمانوں کو ساتھ لئے ترئیکروف خود بھی بہ نفس نفیس کتا خانے میں تشریف لے آئے۔ وہاں پانچ سو سے بھی زائد ''بینگل'' نسل کے کُتے اور تقریباً اتنے ہی گرے ہاونڈ'' عیش و آرام میں پل رہے تھے۔ کتا خانے کے وسیع احاطے میں کُتوں کا اسپتال بھی قائم تھا۔ وہاں بیمار کتوں کا علاج ہوا کرتا

تھا اوراس کی ذمے داری اسٹاف سرجن کے سپرد تھی۔ احاطے کے دوسرے بازو میں نرسنگ ہوم بھی تھا جہاں کتوں کی مادائیں پلوں کو جنم دیا کرتی تھیں۔ ترونیکروف کو اپنے مہمانوں کے درمیان اپنی شان و شوکت جتانے اور دوسرے کو مرعوب کرنے میں اس کتا خانے سے بڑی مدد ملتی تھی۔ وہ کتوں کی آڑ میں اپنی سطوت شاہانہ کا مظاہرہ کرکے دل ہی دل میں بڑی خوشی محسوس کرتے تھے۔ اُس دن بھی وہ اپنی اعلیٰ نسل کے کتوں کی شان میں قصیدہ خوانی فرمار ہے تھے جس پر دیروفسکی نے چپ سادھ رکھی تھی۔ ویسے کتے پالنے کا شوق تو انہیں بھی تھا مگر اپنی حیثیت کے مطابق انہوں نے صرف چار ہی کتے پال رکھے تھے۔ دراصل ترونیکروف کے کتوں کے یہ شاہی ٹھاٹ بھاٹ دیکھکر ان کے دل میں حسد کے جذبات جاگ اُٹھے تھے۔ اُن کی بیزار کُن پراسرار خاموشی سے کبیدہ خاطر ہوکر ترونیکروف کو کہنا ہی پڑا۔ ''بھائی دیروفسکی! کیا آپ کو ہمارا کتا گھر پسند نہیں آیا؟ اور انہوں سنبھل کر کہا۔ ''نہیں دوست! ایسی بات نہیں ہے۔ آپ کے یہاں واقعی بڑے نایاب و کمیاب اور اعلیٰ نسل کے کتے موجود ہیں۔ میں بس یونہی خیالوں میں گم ہوگیا تھا۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ جو عیش و آرام یہاں پلنے والے کتوں کو حاصل ہے وہ تو ان کے منتظمین کو بھی حاصل نہ ہوگا۔'' اس پر کتوں کے رکھوالے ''پاراموشکا نے'' جو ایک زر خرید غلام تھا، دخل در معقولات سے کام لیتے ہوئے احتجاج کیا۔

''جی نہیں، ایسا تو بالکل بھی نہیں ہے۔ مالک کے کرم سے ہم لوگ بھی یہاں خوب مستی کی چھانتے ہیں۔ بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار اگر ہمارے آقا کا کتا گھر دیکھ لیں تو اپنے سارے کتے یہیں لے آئینگے تاکہ بڑھیا خوراک سے موٹے تازے اور فربہ ہوجائیں۔'' اس پر ترونیکروف نے غلام کی گستاخی پر بجائے اسے ڈانٹنے کے فضا میں ایک بلند بانگ قہقہہ اُچھال دیا جس کی تقلید میں مہمان نما مصاحبین نے بھی گونجدار قہقے فضا کی چھاتی میں ٹھونک دیے جو دیروفسکی کے کلیجے میں جلتے ہوئے تیروں کی طرح اُتر گئے مگر وہ خاموشی ہی رہے۔ اتنے میں ایک غلام نے نوازئد پلوں کی جھال سامنے لاکر رکھ دی۔ ترونیکروف نے بغور معائنے کے بعد ان میں سے دو پلے منتخب کر لئے اور بقیہ پلوں کو ندی میں غرقاب کرنے کا حکم صادر فرمادیا۔ اس درمیانی وقفے میں دیروفسکی کسی سے کچھ کہے بنا ہی وہاں سے کھسک لئے پھر جب کھانے کی میز پر دیروفسکی کو غائب پر کر ترونیکروف نے استفسار کیا تو خادم نے کہا کہ ''وہ اصرار کے باوجود بھی نہیں آئے۔ انہوں نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔'' اس پر ترونیکروف نے کہلا بھیجا کہ اُن سے کہہ دینا کہ اگر انہوں نے ''پوکروسکوئے'' میں ہمارے شب بسری نہیں کی تو پھر وہ ہماری دوستی کو ختم ہی سمجھیں۔ وہ پھر بھی نہیں آئے اتنا کہہ کر خادم نے اُن کا نوشتہ رقعہ اپنے مالک کے ہاتھ میں تھما دیا۔ رقعے میں لکھا تھا۔ ''آنے نہ آنے کا فیصلہ تو بعد میں کرونگا۔ پہلے تو اُس گستاخ غلام پراموشکا کو میرے سامنے حاضر کیا جائے۔ مجھے یہ حق حاصل ہوگا کہ میں چاہوں تو اُسے معاف کردوں یا پھر اس کی بدتمیزی کی اُسے عبرت تانک سزا دوں۔ یاد رہے کہ وہ اک زر خرید غلام ہے۔ اس جرات بے جا کا حق اُسے تو کیا میں آپ کو بھی دینا گوارا نہیں کرونگا۔

ترونیکروف نشے کی حالت میں تو پہلے ہی تھے رقعہ پڑھا تو آگ بگولہ ہوگئے ''دیروفسکی تو اپنی اوقات ہی بھول گیا۔ اس کی ہمت تو دیکھو کہ وہ غلام تو میرا ہے مگر اُسے سزا دیگا یہ خیر! بچو کو اب بتانا ہی پڑیگا

کہ ہم سے ٹکر لینے کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔"
اگلے دن وہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ شکار گاہ پہنچ گئے۔ دیروفسکی کی غیر موجودگی انہیں کھائے جارہی تھی۔ رسوئی سے آیا تازہ کھانا بھی انہیں بدذائقہ محسوس ہوا۔ انہوں نے کھسیا کر بلاوجہ باورچی کی پٹائی بھی کر دی۔ ادھر شکار بھی دکھائی نہ دیا۔ سارے دن تک و تاز کے بعد محض ایک خرگوش ہی نظر آیا اور اس پر نشانہ بھی چوک گیا تھا۔ سخت جھلاہٹ ان پر سوار ہو گئی تھی لہٰذا واپسی میں انہوں قصداً دیروفسکی کے ہرے بھرے کھیتوں کو بھی بری طرح روند کر رکھ دیا تھا۔
اب ترونیکروف کے مصاحبین جنہیں یہ دوستی ناپسند تھی، حالات موافقت میں پا کر ادھر کی خبریں نمک مرچ لگا کر دیروفسکی کو پہنچاتے رہتے تھے۔ ایک دن دیروفسکی نے جو گھوڑا گاڑی میں کہیں جارہے تھے اپنے علاقے کے اپنے جنگل میں پوکروسکوئے کے لکڑی چوروں کو لکڑی کاٹتے رنگے ہاتھوں پکڑلیا انہوں نے برافروختہ ہو کر چوروں کی جم کر پٹائی کی اور پوکروسکوئے کے تین گھوڑوں کو گرفت میں لے کر اپنے اصطبل میں ڈال دیا۔
یہ بات جب ترونیکروف کو معلوم ہوئی تو ان کے غیض و غضب کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ پہلا خیال تو ان کے دل میں یہ آیا کہ کیوں نہ وہ اپنے غلاموں کی فوج ساتھ لے کر دیروفسکی پر حملہ بول دیں اور اسے گرفتار کر کے اپنے علاقے کے قید خانے میں پھنکوادیں لیکن بعد میں جب انہوں نے ضلع کچہری سے اتفاقیہ طور پر قانون گو شابشکن کے حویلی میں آنے پر اس سے مشورہ کیا اور کہا کہ ہم نے اپنی جائداد دیروفسکی کے ہاتھوں فروخت کی تھی جس کے سرکاری کاغذات اس کے یہاں آگ لگنے پر نذر آتش ہو چکے ہیں۔ اس بات کا فائدہ اٹھا کر اگر ہم جائداد کی واپسی کا اس پر مقدمہ دائر کر دیں، تو کیا یہ ٹھیک ہوگا؟ اس پر قانون گو نے کہا" کہنا کیا ہے سمجھ لیجئے مقدمہ جیتا جتایا ہے۔"
اگلے ہی دن عدالت میں اس الزام کے ساتھ گاؤں 'کستین یوفکا" ہماری اپنی ملکیت ہے مقدمہ چالو کر دیا گیا جس پر ہماری سرسبز کیاریاں اپنے جوبن کی بہار دکھاتی رہتی تھیں۔ یہ جگہ ولادیمیر کی اچھی طرح دیکھی بھالی تھی۔ اُسے یاد آگیا کہ وہ یہاں ماشا ترونیکروف کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ وہ اس سے دو سال چھوٹی تھی۔ اُس نے سوچا اب تو وہ جوان ہو چکی ہوگی۔ مگر وہ چاہ کر بھی انتوں کو چوان سے اس بارے میں کچھ نہ پوچھ سکا۔ گھوڑا گاڑی پل کو پار کر کے، گاؤں کو اپنے پیچھے چھوڑنے کے بعد چڑھائی کا راستہ تیزی سے طے کر رہی تھی۔ ولادیمیر کو وہاں برج کے درختوں کے جھنڈ کے بائیں جانب کھلے سبز میدان میں سرخ چھت والی ایک سرمئی رنگ کی چھوٹی سی حویلی دکھائی پڑی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی کیونکہ گاؤں سے ہٹ کر واقع یہ عمارت اُس کا آبائی مکان تھی۔ حویلی کے احاطے کے اندر کیاریاں رنگارنگ پھولوں سے سجی عروس نو بہار کا منظر پیش کر رہی تھی۔
ولادیمیر اپنے لاغر اور بیمار باپ سے لپٹ کر زارو قطار رونے لگا۔ اب ان کے اعصاب بھی جواب دے گئے تھے۔ ان کی دماغی حالت متزلزل ہونے کی وجہ سے مقدمے سے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنا بھی اب ممکن نہ تھا۔ اس نے جائداد کے کاغذات تلاش کرنے کی کوشش کی تو اس میں بھی کامیابی نہیں ملی۔ جس کے نتیجے میں اپیل دائر کرنے کا وقت بھی نکل گیا اور اپنی ساری جائدد قانونا

تر ونیکروف کے قبضے میں چلی گئی۔

تر ونیکروف کو مقدمہ جیت کر خوشی تو ضرور ہوئی لیکن دشمن کو بے دخل کرنے میں انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی اور سچ پوچھو تو مقدمہ جیت کر بھی انہیں کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی تھی۔ وہ دشمن سے دوستی کے پرانے واقعات یاد کر کے جذباتی ہو جاتے تھے۔ ایک دن اسی طرح جذباتی ہو کر وہ گھوڑا گاڑی دوڑاتے دیرو فسکی کے احاطے میں پہنچ گئے جنہیں دریچے کے پاس بیٹھے دیرو فسکی نے دور سے ہی پہچان لیا۔ شدت نفرت اور غیض و غضب سے ان کا سارا جسم تھر تھر کانپ اُٹھا۔ انہوں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو انہیں فالج مار گیا۔ وہ کھڑے سے زمین پر گرتے ہی بیہوش ہو گئے۔ اتنے میں کسی نے اطلاع دی کہ تر ونیکروف آئے ہیں۔ ملنے کے خواہشمند ہیں۔ ولادیمیر نے ان کے قریب پہنچ کر انہیں حقارت انگیز نظروں سے گھور کر دیکھا اور نہایت کرخت لہجے میں کہا۔

""قبل اس کے کہ میں آپ کو اُٹھا کر باہر ٹیک دوں آپ یہاں سے دفع ہو جائے۔

""تر ونیکروف کو ایسی ذلت وخواری کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ ان کا چہرا غصے کی شدت سے لال ہو گیا۔ وہ کہے سنے بغیر ہی جیسے آئے تھے ویسے ہی چلے گئے۔

ادھر دیرو فسکی دم توڑ چکے تھے۔ سارا گاؤں حویلی میں سمٹ آیا تھا۔ ولادیمیر اور اس کے تین ساتھیوں نے مل کر دیرو فسکی کا تابوت حویلی سے باہر نکالا۔ چرچ میں ان کے لئے دعا ہوئی اور انہیں قبرستان لے جا کر اُن کی ماں کے پہلو میں سپرد کر دیا گیا۔

گھنے جنگل کے وسط میں جہاں ایک نالہ بہہ رہا تھا ایک ہموار چٹان پر ولادیمیر سر جھکائے بیٹھا بڑا اداس نظر آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ سب کچھ تباہ ہو گیا۔ ساری جائداد، غلہ، غلام، کسان مزدور اور نوکر چاکر سب کے سب تر ونیکروف کی ملکیت میں شامل ہو جائیں گے۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب فی الوقت اس کے پاس نہیں تھا۔ جھٹ پٹے کا وقت ہو گیا تھا۔ واپسی میں اندھیرا گھر آنے پر وہ جنگل میں راستہ بھٹک گیا۔ پھر جیسے تیسے راستہ ملا تبھی گھر واپسی ممکن ہو سکی۔

وہ گھر پہنچا تو حویلی میں بھیڑ جمع دیکھی۔ تین گھوڑوں والی دو سرکاری گاڑیاں احاطے میں کھڑی تھیں۔ وہاں سرکاری وکیل، داروغہ، قانون گو منشی اور اردلی موجود تھے۔ قانون گو عدالتی حکم نامہ پڑھ کر سنا رہا تھا کہ ساری جائداد جانور، مویشی، غلہ اور نوکر چاکر اب تر ونیکروف کی ملکیت بن چکے ہیں لہٰذا سبھی زرخرید غلام، عورتوں مرد، بوڑھے بچے کسان اور گھریلو خدمتگار بلا تاخیر اپنے آپ کو تر نیکروف کے سپرد کر دیں۔ یہ سن کر حویلی میں موجود حویلی سے وابستہ سبھی غلام اور کسان غصے سے بری طرح بھڑک اٹھے اور چلانے لگے ہم اپنے آقا کی ملکیت چھوڑ کر کہیں نہیں جائینگے۔ ان میں جو اور بھی زیادہ غضبناک ہو گئے تھے وہ نعرے لگانے لگے کہ ہم تم سب کو کاٹ ڈالینگے۔

معاملے بے قابو ہوتے دیکھ کر سرکاری عملہ بری طرح سٹپٹا کر رہ گیا۔ انہوں نے خود کو ایک کمرے میں مقفل کر کے اپنی جانیں بچائیں۔ ولادیمیر نے خدام کو ڈانٹ کر کہا۔ ""بے وقوفو! اپنی بکواس بند کرو۔ یہ سرکاری لوگ جو کچھ بھی کر رہے ہیں۔ قاعدے قانون کے ہی مطابق کر رہے ہیں۔ اس میں ان لوگوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔"" اس نے سرکاری لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ صبح تک کے لئے یہیں رکے رہیں

ورنہ بھڑکے ہوئے خدام ان کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ سرکاری عملے نے ولا دیمیر کا شکریہ ادا کیا اور اندر سے کمرہ مقفل کر کے وہیں سو گئے۔

رات کے وقت ولا دیمیر نے اپنے کوچوان کو حکم دیا۔ ''انتوں! میری گاڑی گھوڑے جوت کر تیار رکھو۔ مجھے یہ ایک دم تیار ملنی چاہئے۔'' انتوں اصطبل سے گھوڑے کھولنے چلا گیا۔ ولا دیمیر نے آزحیب کی مدد سے کمرے سے ملحق پھونس کا چٹا لگوا کر اس میں آگ لگا دی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے حویلی کی ساری عمارت جل کر راکھ ہو گئی۔ حویلی کا وہ کمرہ جس میں سرکاری عملہ موجود تھا ان سب کی مشترکہ چتا بن گیا اور وہ سب کے سب جل کر بھسم ہو گئے۔

واقعے کی اطلاع ملتے ہی پولیس موقعہ واردات پر پہنچ گئی۔ ولا دیمیر اور کوچوان کو تلاش کیا مگر وہ تو جائے واردات سے پہلے ہی فرار ہو چکے تھے۔ چونکہ وہ شک دائرے میں آ چکے تھے لہٰذا تھانے میں اُن کے خلاف رپورٹ درج کر لی گئی۔

ادھر مضافات میں امن وسکوں کی زندگی خطرے میں پڑ چکی تھی۔ گاؤں گاؤں ڈاکو اور لٹیرے گاڑیوں میں سوار بے خوف وخطر ادھر سے ادھر دھندناتے پھر رہے تھے۔ زمینداروں کی حویلیوں پر ڈاکے ڈالے جا رہے تھے۔ سرکاری اور پولیس کا عملہ ان کی سرکوبی میں ناکام ہو چکا تھا اور جو ورطہ حیرت میں ڈالنے اور چونکانے والی جو بات تھی وہ یہ تھی کہ ان ڈکیتوں کا جو سرغنہ او سردار تھا وہ کوئی اور نہیں ولا دیمیر تھا ور دوسری خاص اُلخاص بات یہ بھی تھی کہ یہ ادھر ادھر کے گاؤں تک ہی محدود تھا۔ ترونیکروف کا علاقہ ان ڈاکے کی وارداتوں سے کلیتاً محفوظ تھا۔ ان کے علاقے میں ڈکیتی کی ایک بھی واردات نہیں کی گئی تھی۔ ترونیکروف ولا دیمیر کی دہشت گردی کے قصے سن کر گھبراتے نہیں تھے بلکہ ان سے لطف اندوز ہو کر بیساختہ قہقہے لگانے لگتے تھے۔ انہیں اپنے محافظوں کی تنظیمی صلاحیت اور چوکسی پر فخر تھا کہ ان کی بدولت ہی ان کا علاقہ پوری طرح محفوظ تھا۔

اگرچہ اب تک ترونیکروف کی بیٹی ماشا کا ذکر ہم نے صرف ایک ہی بار کیا ہے پھر بھی ہمارے ذہین قارئین اتنا تو ضرور ہی سمجھ گئے ہونگے کہ وہی ہماری کہانی کی ہیروئن ہے۔ ماشا کو اپنے باپ کا لاڈ پیار تو خوب ملا تھا اور وہ لاڈلی بیٹی کی مناسب ونامناسب بات مان بھی لیتے تھے۔ مگر پھر بھی ان کی مرضی ہی کو تقدم حاصل تھا۔ کبھی کبھی اُن کا رویہ دوسروں کی طرح اُس کے ساتھ بھی حاکمانہ اور جابرانہ ہوتا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی کس بات پر اُن کا ردعمل کیا ہوگا؟ اچھا ہوگا کہ برا۔ ان کی مزاج تنخی کی وجہ سے وہ ان سے کھل کر اپنے دل کی بات بھی کہنے سے معذور تھی۔ وہ بھیڑ میں رہ کر بھی خود کو تنہا محسوس کرتی تھی۔ نہ ماں تھی اُس کی نہ بہن، نہ بھائی نہ ہمجولیاں اور نہ ہی زمینداروں کی بیویوں اور بیٹیوں کا حویلی میں آنا جانا تھا۔ ان سب سے قطع نظر صرف قصے کہانیوں کی کتابیں اور ناولیں ہی اس کی سچی دوست تھیں۔ ویسے ایک فرنچ لڑکی میمی کو اس کا ٹیوٹر مقرر کیا گیا تھا۔ عورتوں کے معاملے میں ترونیکروف کچھ زیادہ ہی دل پھینک واقع ہوئے تھے۔ انہیں شراب وشباب اور رنگ ورامش کی محفلوں سے لذت کشید کرنے کا چسکا لگ چکا تھا۔ ان کی محل نما حویلی میں ان کا حرم خاصہ وسیع تھا جس میں ان کی پچاس سے بھی زائد کنیزیں آباد تھیں۔ ان میں جو ڈھلنے لگتی تھیں یا حسن وشباب میں کمی آ جانے کے سبب ان کے دل سے اتر جاتی تھیں وہ ان کی

شادیاں بطور انعام اپنے پسندیدہ خدمتگاروں سے کردیا کرتے تھے اور ان کے جانے سے حرم میں جو جگہ خالی ہو جاتی۔ اُسے نت نئی حسیناؤں سے پُر کردیا جاتا تھا۔ ان کی بیٹی ماشا کی فرینچ اتالیق میمی بھی ایک شوخ و شنگ حسینہ تھی جسے وہ پوری طرح اپنے شیشے میں اُتار چکے تھے۔ اس کی دن بہ دن بدلتی جسمانی کیفیت کا پردہ فاش ہونے اور رسوائی سے بچنے کی خاطر انہوں نے اسے ایک پڑوسی گاؤں میں منتقل کردیا تھا۔ میمی کو اپنے تہذیب واخلاق اور اچھے طور طریقوں کے سبب جہاں حرم کی دیگر کنیزوں پر تفوق حاصل تھا وہیں ترونیکروف کے دل میں بھی اُس کی خاص عزت تھی۔ میمی کا نو سالہ بیٹا ساشا انہیں کے ساتھ رہتا تھا جسے وہ بیٹا کہہ کر پکارتے تھے۔ ویسے ان کے اور بھی نہ جانے کتنے بیٹے تھے جو شکل صورت میں بھی ان سے ملتے جلتے تھے مگر حویلی میں ان کی حیثیت ادنیٰ درجے کے نوکروں چاکروں کی سی تھی۔ انہوں نے اپنے بیٹے ساشا کی تعلیم و تربیت کے لئے ماسکو سے فرینچ اتالیق بلوایا تھا۔ اُس کی پیش کردہ اسناد تو اطمینان بخش تھیں مگر وہ نوجوان تھا اور اس کی یہی بات انہیں کھٹک رہی تھی۔ انہیں فرینچ نہیں آتی تھی مگر ساشا کے فرانسیسی میں ترجمہ کی مدد سے اُنہوں نے نئے اتالیق کو یہ بات اچھی طرح گوش گزار کرادی کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے اور حویلی میں جوان عورتوں میں دلچسپی سے پرہیز کرے۔ بہرحال اُسے ساشا کا اتالیق تسلیم کرلیا گیا۔

شراب و شباب کے رسیا ترونیکروف کو جانوروں کی لڑائی سے لطف اندوز ہونے کا بھی شاہی شوق تھا۔ وہ ریچھ کے بچوں پر کُتے بلیاں چھوڑ کر ان کی لڑائی کے تماشے سے خوب خوب محظوظ ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں انہوں نے ایک پیپے کو لڑھکا تو یا تو کیلیں چبھنے پر مشتعل ہو کر اس سے جنونی انداز میں الجھ پڑتا تو زیادہ سے زیادہ زخمی ہو کر زیادہ زیادہ چیختا چلاتا۔ اس کی اس جنونی حالت پر ترونیکروف قہقہوں پر قہقہے لگاتے رہتے تھے۔ پھر جب ریچھ بری طرح زخمی ہو کر لہولہان ہو جاتا تو اُسے اُس کے پنجرے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ اُن کا ایک اور بھی خاص کھیل تھا۔ ہال میں ایک بھوکے ریچھ کو رسی سے باندھ دیا جاتا تھا اور رسی میں اتنی ڈھیل رکھی جاتی کہ ریچھ ہال کے ایک محفوظ گوشے کو چھوڑ کر باقی تمام ہال میں آزادانہ طور پر گھوم پھر سکے۔ پھر تماشے کا آغاز اس طرح کیا جاتا کہ کسی غلام کو ہال میں ڈھکیل کر باہر سے دروازہ بند کردیا جاتا تھا۔ ترونیکروف دوسرے کمرے کی اس کھڑکی سے لگ کر بیٹھ جاتے جو ہال میں کھلتی تھی وہاں سے وہ ریچھ کے ذریعے غلام کی درگت اور بوکھلاہٹ دیکھ کر دل کھول کر قہقہے لگاتے تھے۔ ہال میں ریچھ کے شکار غلام کا محفوظ گوشے تک پہنچے سے پہلے ہی برا حال ہو جاتا تھا۔ اس کا لباس تار تار ہو جاتا اور ریچھ کے ناخنوں سے کھال جگہ اجگہ ادھڑ جانے پر خونچکاں اور زخموں سے چور ہونے پر وہ جتنا بھی اس آفت ناگہاں پر واویلا کرتا چیختا چلاتا شور مچاتا اتنا ہی زیادہ اس تماشے سے ترونیکروف کو لطف و کیف حاصل ہوتا تھا۔ ایک دن ان کے اختراع پسند ذہن نے انہیں ایک نئی بات سمجھادی کہ کیوں نہ فرانسیسی ٹیوٹر ڈیفوز کی اپنے بھوکے ریچھ سے ملاقات کرادی جائے۔ بس پھر کیا تھا اس پر بلا تاخیر عمل کیا گیا کہ اسے تاریک راہ داریوں سے گزار کر ریچھ والے ہال میں ڈھکیل کر باہر سے دروازہ مقفل کردیا گیا۔ ریچھ اپنے شکار کو اپنے سامنے پاکر فوراً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈیفوز بڑے صبر واطمینان سے کھڑا رہا۔ یکایک ریچھ نے اُس پر چھلانگ لگادی مگر ڈیفوز ذرا بھی خائف نہ ہوا اُس نے بڑے آرام سے پستول کی نال اس کے سر پر رکھ کر

اسے شوٹ کر دیا۔ ساری حویلی میں ہنگامہ مچ گیا۔ فہمائش پر اس نے بیان دیا کہ مجھے ریچھ کے بارے میں کوئی علم نہ تھا اور نہ ہی کسی نے مجھے اس سے خبردار کیا تھا۔ میں اپنی حفاظت کے لئے اپنی پستول ہمیشہ اپنے پاس رکھتا ہوں جو اُس وقت میرے کام میں آئی۔

ماشا جواب تک اسے محض خادم کے درجے کا متصور کئے ہوئے تھی اُس کی طرف مائل ہونے پر مجبور ہوگئی۔ اُس کی آواز سُریلی تھی ایک دن وہ کوئی نغمہ گنگنا رہی تھی کہ ڈیفوز اُسے سُن کر کہا۔

''واہ! بڑا خوبصورت گلا پایا ہے آپ نے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں چاہونگا کہ آپ کو باقاعدہ موسیقی کی تعلیم دوں۔ کیا خیال ہے۔؟'' ماشا نے بڑے دیلرانہ ومعشوقانہ انداز میں اٹھلا کر کہا۔

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔'' وہ اسے دل دے بیٹھی تھی۔

ایسٹر پر چرچ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ترونیکوف اور ماشا چھ گھوڑوں والی پرشکوہ بگھی میں سوار ہوکر چرچ پہنچے تھے۔ انہوں نے وہاں موجود سبھی لوگوں کو بطور مہمان حویلی میں دعوت طعام میں شریک ہونے کے لئے کہا اور واپس حویلی آگئے۔

حویلی کا احاطہ گاڑیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اصطبل بھی گھوڑوں سے بھر چکا تھا۔ ادھر مہمان خانہ بھی بے شمار مہمانوں سے آباد ہو چکا تھا۔ آنے والے مہمانوں میں مرد بھی تھے اور خواتین بھی۔ ہال میں بیک وقت اسی مہمان اپنی نشستوں پر تشریف فرما تھے اور سبھی کے سامنے قطار میں لگی میزوں پر کھانا سجا دیا گیا تھا۔ کاکشین اور روسی ''شراب کی کوئی کمی نہ تھی کہ اتنے میں بھاری ڈیل ڈول والے مسٹر پختونچ بھی تشریف لے آئے اور گفتگو کا رخ ہنسی مذاق کی طرف مڑ گیا۔ ترونیکوف نے کہا۔

''یار پختونچ! تم چرچ کی عبادت میں بھی شامل نہ ہوئے اور کھانے پر بھی دیر سے آئے جبکہ خنزیر کی طرح خوب ڈٹ کے کھاتے ہو۔ بتاؤ تو سہی آخر بات کیا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم نے آج تک کسی بھی دوست کو اپنے گھر دعوت کے لئے مدعو نہیں کیا ہے پھر وقت پر یہاں پہنچنے میں قباحت کیا ہے۔

''حضور والا سچ ہی فرماتے ہیں۔ پختونچ نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔'' گھر سے میں چلا تو وقت پر ہی تھا مگر راستے میں گاڑی خراب ہوجانے کی وجہ سے دیر ہوگئی۔'' پھر انہوں نے ولادیمیر کی دہشت گردی کو موضوع سخن بناتے ہوئے کہا۔'' آج کل ہمارے علاقے کو بڑی نازک صورتحال کا سامنا ہے۔ ہمارا گودام لوٹ لیا گیا ہے اور اب حویلی کے بھی لُٹ جانے کا خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ میں نے ولادیمیر کے باپ دیرِدفسکی مرحوم کے حق میں بیان دینے سے انکار کر دیا تھا اس پر وہ مجھ سے چڑ گیا ہے۔ خدا جانے وہ اب کیا غضب ڈھانے والا ہے۔

''آخر اس ولادیمیر کا حلیہ کیا ہے۔؟'' ترونیکوف نے داروغہ جی سے دریافت کیا۔ اس پر جو حلیہ اپنے الفاظ میں اُنہوں نے بیان کیا اسے سن کر وہ خود کو قہقہہ زن ہونے سے نہ روک سکے۔ انہوں نے کہا'' اے شریف آدمی! جو حلیہ تم نے ولادیمیر کا بتایا ہے وہ تو کسی کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس حلئے کے تو کئی ولادیمیر ہمارے یہاں بھی مل جائینگے کیونکہ ستواں ناکوں بھوری آنکھوں اور میانہ قد والے نوجوانوں کی یہاں کوئی کمی نہیں ہے۔''

اب سبھی کا موضوع ولادیمیر بن گیا۔ اُس کے بارے میں سبھی مہمان اپنے خیالات کا اظہار

کرنے لگے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ولادیمیر بڑی پراسرار شخصیت کا مالک ہے کہ صرف دولتمندوں کو ہی لوٹتا ہے اور پوری طرح سے تو کبھی کسی کو لوٹتا بھی نہیں ہے۔ غرضکہ یہ محفل تین گھنٹے تک چلنے کے بعد اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔

ماشا جو پراسرار اور ہولناک قسم کے سنسنی خیز ناولیں پڑھا کرتی تھی وہ ولادیمیر کے سنسنی خیز واقعات سُن کر جوش میں بھر اٹھتی تھی۔ ولادیمیر کی پراسرار شخصیت میں اس کی دلچسپی روز افزوں بڑھتی ہی جارہی تھی۔ مہمان جب کھانے سے فارغ ہوگئے تو پھر راگ ورنگ کی محفل کا آغاز عمل میں آگیا۔ حویلی کو اندر سے مقفل کرنے کے بعد اعلان کر دیا گیا تھا کہ کل تک سب اندر رہنگے اور کوئی بھی باہر نہیں جائے گا۔ رقص وموسیقی میں حصہ لینے والے نوجوان لڑکوں کے مقابلے میں جوان حسینائیں تعداد میں کہیں زیادہ تھیں۔ طبلے کی تھاپ اور سازوں کی دل نشین جھنکار کے ساتھ جوان جسم حرکت میں آگئے اور موسیقی کی دلفریب دھن کے ساتھ ان کے پاؤں فرش پر تھرک اٹھے۔ ماشا بھی اپنے فرینچ اتالیق ڈیفوز کے ساتھ رقص میں شامل ہوچکی تھی۔ ڈیفوز ماشا کے ساتھ والز رقص کا بہترین مظاہرہ کررہا تھا۔ وہاں شامل رقص ہر لڑکی کی دلی تمنا تھی کہ ڈیفوز اسے اپنا رقص پارٹنر بنائے مگر ماشا کے سوائے وہ کسی کو بھی خاطر میں لانے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔ ترو ئیکوف نے کچھ ہی وقت تک رقص کی محفل کا لطف لیا مگر جب ان پر غنودگی کی کیفیت طاری ہونے لگی تو وہ سونے کے لئے اپنی خوابگاہ میں چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی نوجوان جوڑوں کی تو جیسے دلی مراد برآئی۔ وہ دوران رقص سرسے سر جوڑے سرگوشیوں میں محو ہوگئے او ادھیڑ عورتیں تاش کھیلتے ہوئے بلند آواز میں باتیں کرنے لگیں بالآخر خاصہ وقت گزر جانے کے بعد رقص وموسیقی کی یہ محفل برخاست کردی گئی اور سبھی مہمانان خواب خوگوش سے لطف اندوز ہونے کے لئے دوسرے بڑے ہال میں بچھے بستروں پر قابض ہوگئے۔

اس رات مہمانوں میں اکیلا بختونچ بے حد پریشان تھا اس نے اپنی ساری دولت ولادیمیر کے خوف سے چرمی بیگ میں رکھ لی تھی اور وہ بیگ اس وقت بھی اُس کے اندرونی لباوے میں چھپا ہوا تھا۔ اُس نے ڈیفوز کا ریچھ کو شوٹ کرنے والا واقعہ سن رکھا تھا اس لئے حفظ تقدم کے طور پر اسے ڈیفوز ہی کا کمرہ سب زیادہ محفوظ محسوس ہوا۔ اُس نے جب ڈیفوز کے کمرے میں شب بسری کی اجازت طلب کی تو ڈیفوز نے اسے اس کی بخوشی اجازت دے دی۔ بختونچ چاہتا تھا صبح تک بتی جلی رہے مگر ڈیفوز نے یہ بے تکی بات ماننے سے انکار کردیا۔ اندھیرا ہوتے ہی اسے خوف ستانے لگا کہ کہیں کوئی کھڑکی کی راہ سے اندر آکر اُسے لوٹ نہ لے۔ اُس نے دیکھ رکھا تھا کہ کھڑکی کے بولٹ ڈھیلے تھے دھکا دینے پر کھڑکی کا کھل جانا اسے بہت مہنگا پڑسکتا تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنی دولت کی حفاظت کی خاطر ساری رات جاگ کر بسر کریگا۔ مگر کچھ ہی وقفے کے بعد نیند کے آگے اس کی ایک نہ چلی اور نینداس پر غالب آکر ہی مانی۔ صبح کے وقت جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کی قمیض کے کالروں کو چھیڑ رہا ہے۔ اس نے چونک کر اپنے سرہانے دیکھنے کی کوشش کی تو خوف سے اس کا چہرا فق ہوگیا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اُس نے آنکھیں مل کر دیکھا تب بھی نظر آیا تو یہی نظر آیا کہ وہ ڈیفوز ہی تھا جس نے اپنی پستول کی نال اس کی کنپٹی پر لگا رکھی تھی اور وہ اس کے چرمی بیگ کے تسمے کھول رہا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے؟ کہ کیا کر رہے ہیں آپ۔؟ خوفزدہ ہو کر بوکھلاہٹ بھرے لہجے میں وہ اس سے زیادہ کچھ بھی نہ کہہ سکا کیونکہ ڈیفوز نے فوراً ہی پستول کی نال اُس کے منہ میں ٹھونس دی تھی۔ وہ بھیڑیئے کی سی غراہٹ بھری آواز میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر خالص روسی لب و لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''آپ کی بھلائی اسی میں ہے کہ اپنا منہ بند رکھیں۔ ورنہ پستول کی گولیوں سے سارا بدن چھلنی کر کے رکھ دونگا۔ مجھے دیکھ لو اور اچھی طرح پہچان لو میں فرانسیسی نہیں ہوں روسی ہوں، خالص روسی شہری۔ آیا سمجھ میں؟ جی ہاں میں ہی ولادیمیر دیروفسکی ہوں۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ میں یہاں پوکروسکوئے کیسے پہنچا؟ یہ ایک طول طویل قصہ ہے۔ چلو اختصار میں بتائے دیتا ہوں کہ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر واقعہ پوسٹ آفس میں گھوڑے تبدیل کرتے وقت میرے ملاقات ایک فرینچ معلم سے ہوئی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ تین ہزار روبل سالانہ مشاہرے کے عوض بطور اطالیق کروسکوئے ترئیکروف کے یہاں جارہا ہے میں نے دس ہزار روبل رشوت دے کر اسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ واپس جا کر اپنی زبان ہمیشہ کے لئے بند رکھے گا اور میں خود کو ڈیفوز بتا کر ترئیکروف کی حویلی میں اتالیق کے فرائض انجام دونگا۔ لہٰذا میں یہاں چلا آیا اور اپنے حسنِ اخلاق اور مہذب طور طریقوں سے سب کے دل جیت لئے۔ مگر ایسٹر کے مذہبی تیوہار تک میں نے نہیں بلکہ میرے ساتھیوں نے تھوری بہت لوٹ مار کی تھی۔ باقی بہت سے لوٹ مار کے واقعات محض گاؤں والوں کی افواہ تک ہی محدود ہیں اور مسٹر پختونچ تمہارا گودام اس لئے لوٹا گیا کہ تم نے جھوٹے مقدمے میں میرے باپ کے خلاف ترئیکوف کا ساتھ دیا تھا اور ہماری تباہی و بربادی کا سبب بنے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ اپنی جمع پونجی اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ خیر آپ نے رات کو میرے کمرے میں آکر میرا کام آسان کر دیا اس کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں۔''

صبح کا وقت تھا۔ سارے مہمان ڈرائنگ روم میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اُن میں ترئیکروف ماشا اور ڈیفوز بھی شامل تھے۔ اتنے میں پختونچ بھی آ گیا۔ اس کا چہرا زرد تھا جیسے کسی نے اس کا خون نچوڑ لیا ہو بے جان جسم سے اس کا چلنا پھرنا بھی ایسا تھا کہ جیسے وہ خود کو گھسیٹ رہا ہو۔ اس میں زبان کھولنے کا حوصلہ بھی نہ تھا۔ ولادیمیر کے خوف نے اسے بے حس پتھر کی طرح سن کر دیا تھا اس نے چائے بھی نہیں پی اور بڑی بے دلی کے ساتھ چپ چاپ وہاں سے کھسک گیا۔

اُسی دن شام کے وقت جب وہ ماشا کو پیانو بجانا سکھا رہا تھا اس کی طبیعت اُچاٹ سی تھی کہ اچانک اُس نے مختصر سا رقعہ لکھا اور وہاں سے چلا گیا ماشا نے متجسس ہو کر رقعہ اُٹھا لیا۔ لکھا تھا

'جھٹپٹے کے بعد چشمے کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں ملو۔ کچھ ضروری بات کرنی ہے'' ماشا پریشان ہو اُٹھی۔ وہ سمجھ گئی وہ اظہار محبت کرنا چاہتا ہے مگر کیا اس کا سب سے چھپ کر اس سے تنہائی میں ملاقات کرنا صحیح ہوگا؟ وہ جانتی تھی کہ ان کے مابین حیثیتوں کے فرق کی ایک اونچی دیوار کھڑی ہے۔ اس دیوار سے ٹکرانے کا نتیجہ ماسوا اس کے کہ خود کو لہولہان کر لیا جائے کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ دریا کے دو کنارے وقتی طور پر قریب تو آ سکتے ہیں لیکن باہم یکجا کبھی نہیں ہو سکتے۔ پھر بھی پر تجسس ملاقات کے اسرار سے پردہ اُٹھانے کی شدید خواہش نے اسے بے قابو کر دیا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس سے مقررہ ٹھکانے پر ملاقات کرنے جائے گی اور ضرور جائے گی۔

ماشا جیسے ہی جنگل میں چشمے کے کنارے پہنچی وہ درختوں کے جھنڈ سے نکل کر اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے کہا۔

''میرے کہنے کو آپ نے یہاں آ کر جو عزت بخشی ہے اس کے لئے میں صمیم قلب سے آپ کا شکر گزار ہوں۔ میں آپ کو تجسس میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتا اس لئے آپ کو بغیر کسی لاگ لپیٹ کے بتا دینا چاہتا ہوں کہ اب آگے ہماری ملاقاتیں ممکن نہ ہو سکیں گی مجھے آپ کے یہاں سے اب جانا ہی پڑیگا اور مجھے آپ کو یہ بھی بتانا ہے کہ میں ڈیفوز نہیں ہوں، میں ولادیمیر دیروفسکی ہوں۔''

اتنا سنتے ہی ماشا کے منہ سے بیساختہ چیخ نکل گئی۔

''مجھ سے ڈرنے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھ سے تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ میں تمہیں ہر بات صاف صاف بتائے دیتا ہوں۔ ہاں میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں آپ کی حویلی میں اچھے ارادے سے نہیں آیا تھا بلکہ بدلے اور انتقام کی خاطر آیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ حویلی میں آگ لگا کر سب کو زندہ جلا کر بھسم کر دوں مگر قبل اس کے کہ میں اپنے منصوبے پر عمل درآمد کرتا مجھے آپ سے محبت ہو گئی اور میں نے اپنا رادہ بدل دیا۔ اب میں نے آپ کے والد ترونیکروف کو بھی معاف کر دیا ہے۔ یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا اور اس محبت کی وجہ سے ہوا ہے جو مجھے تم سے ہے۔ اب آخر میں خاص بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وعدہ کرو تم اس محبت کا احترام کرو گی اور یہاں سے میرے چلے جانے کے بعد تمہیں جب بھی میری ضرورت محسوس ہو تم مجھے ضرور یاد کرو گی۔''

اتنا کہہ کر اس نے ماشا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس پر اپنے لبوں سے مہر محبت ثبت کر دی۔ اتنے میں جنگل میں سیٹیاں بجنے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اس پر ولادیمیر نے اُسے بتایا کہ

''یہ میرے ساتھی لوگ ہیں جو سیٹیاں بجا کر مجھے خطرے سے آگاہ کر رہے ہیں اگر اس پر بھی میں یہاں سے نہیں گیا تو میں ہلاکت میں پڑ جاؤں گا، تباہ و برباد ہو جاؤں نگا مگر مجھے پرواہ نہیں ہے۔ میں یہاں سے تب تک نہیں ہلونگا۔ جب تک کہ تم سچے دل سے میری محبت کو قبول نہیں کرو گی۔''

ماشا تذبذب پڑ گئی کہ تبھی ایک سیٹی بجی اور گھبرا کر ماشا نے اس کے سوال کے جواب میں ''ہاں'' کہہ دیا۔ ولادیمیر نے اس کے ہاتھ کو ایک بار پھر بوسہ دیا اور پھر فوراً ہی دوڑ کر جھاڑی کے عقب میں گم ہو گیا۔

واپسی پر ماشا نے دیکھا کہ حویلی کے احاطے میں داروغہ کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ ترونیکوف داروغہ سے گفتگو کرتے ہوئے بڑے سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ جیسے ہی ماشا ان کے قریب پہنچی انہوں نے ماشا سے پہلا سوال یہی کیا کہ کیا اُس ڈیفوز کو دیکھا ہے۔؟ ماشا نے لاعلمی کا اظہار کیا اور آگے بڑھ گئی ترئیکوف یکا یک داروغہ پر بگڑ گئے کہنے لگے۔

''آخر اس دوکوڑی کے چھوٹے پختونچ پر تم نے یقین کیسے کر لیا کہ ڈیفوز ہی ولادیمیر ہے لگتا ہے تم لوگ سٹھیا گئے ہو۔ کان کھول کر سن لو جب تک تم اس کے خلاف ٹھوس ثبوت پیش نہیں کرو گے میں ہرگز ہرگز بھی اُسے تمہارے سپرد نہیں کرونگا۔''

پوکرسکوئے سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر ''ارباتوف'' نامی گاؤں آباد تھا جو پرنس بیرسکی کی

جاگیر میں شامل تھا۔ ولایت سے واپسی پر انہوں نے اپنے اس گاؤں کو بہتر بنانے کے کچھ منصوبے بنائے تھے۔ ان کا پور کروسکوئے میں ترونیکوف نے بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا تھا اور ان کی ضیافت اور دلجوئی میں کوئی کسر بقایا نہیں چھوڑی تھی۔ واپسی پر انہوں نے جواباً ترونیکوف کو بھی اپنے یہاں آنے کے لئے مدعو کیا جسے ترونیکوف نے بخوشی قبول کرلیا اور مقررہ دن پر وہ ''ارباتوف'' پہنچ گئے جہاں ان کو شاندار ضیافت سے نوازا گیا۔ اسی دوران وہ ادھیڑ عیاش پرنس بیرسکی ماشا کو دل دے بیٹھا۔ ترونیکوف پرنس کی شان و شوکت اور ٹھاٹ باٹ سے مرعوب تو تھے ہی اس لئے جب اس نے ان سے ماشا کا ہاتھ مانگا تو اس شادی کی منظوری انہوں نے فوراً ہی دیدی۔ ماشا کو ادھیڑ پرنس ذرا بھی پسند نہ تھا اس لئے اس نے جنگل جا کر اس معاملے میں ولادیمیر سے مدد طلب کی۔ اپنی قسمت کو کوسا آنسو بہائے اس پر ولادیمیر نے اس کی انگلی میں اپنی انگوٹھی پہنادی اور کہا کہ۔ ''جاؤ گھر جا کر اپنے باپ سے فریاد کرو کہ وہ ادھیڑ آدمی تمہیں بالکل ناپسند ہے۔ وہ یہ شادی فی الفور رد کردیں۔ اگر وہ مان جاتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ تم شاہ بلوط کے کھوکھلے تنے میں اپنی کوئی نشانی رکھ دینا میں اشارہ ملتے ہی تمہاری مدد کے لئے بلا تاخیر پہنچ جاؤنگا اور سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔''

ماشا نے رو رو کر باپ سے بہت منت سماجت کی کہ بیٹی کو جان بوجھ کر جہنم میں نہ جھونکیں اور یہ رشتہ منسوخ کردیں مگر وہ بیٹی کی فریاد سن کر ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوئے اور اپنا فیصلہ بدلنے سے صاف انکار کردیا۔ ساتھ ہی اُنہیں بیٹی کے احتجاج میں بغاوت کی بُو بھی محسوس ہوئی لہٰذا حفظ ماتقدم کے طور پر انہوں نے ماشا کو کمرے میں مقفل کر کے اس پر پہریدار تعینات کردیے۔ ماشا نے کسی ہمجولی کی مدد سے ہدایت کے مطابق نشانی جیسے تیسے شاہ بلوط کے کھوکھلے تنے میں رکھوائی مگر وہ ولادیمیر کے ہاتھ لگنے سے پہلے ہی کسی مخبر کی خبر رسانی کے سبب ترونیکوف کے قبضے میں پہنچ گئی۔

اگلے دن جبراً اسے سجا سنوار کر اور دلہن بنا کر چرچ لے جایا گیا جہاں اُس کی شادی بریسکی کے ساتھ انجام پا گئی۔

آخر وقت تک قسمت کی ستائی اور غم کی ماری ماشا کو ولادیمیر کی آمد کا انتظار رہا۔ وہ بار بار آنکھیں پھاڑ کر دروازے کی سمت تکتی رہی کہ کاش اس کا نجات دہندہ آئے اور اسے اس ادھیڑ اور مکروہ صورت عیاش کی بیوی بننے سے بچالے مگر اسے نہ آنا تھا اور نہ وہ آیا نتیجتاً جو نہ ہونا چاہیے تھا ہو کر ہی رہا اور مذہب کی جکڑ بندیوں کے بل پر وہ ایک ناپسندیدہ مرد کی ملکیت بنادی گئی۔

مابعد شادی پھر جب کہ وہ اپنے دولہا کے ساتھ چرچ سے اپنی سسرال ''ارباتو'' ایک شاندار چھ گھنٹوں والی بگھی میں سوار ہو کر جارہی تھی اور دس میل کا سفر طے بھی ہو چکا تھا کہ یکایک ولادیمیر اپنے ساتھیوں کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ وہ آناً فاناً ان تک پہنچ گیا اور بگھی کو آگے نہ بڑھنے پر مجبور کردیا۔ پھر اس نے بگھی کا دروازہ کھول کر ماشا کو پیغام دیا کہ معیار قید ختم ہوئی۔ اب وہ خود کو ہر طرح سے آزاد سمجھے۔ اس پر ماشا نے گلوگیر آواز میں کہا۔

''ولادیمیر تم نے آنے میں دیر کردی۔ اب میں سہاگن ہوں، پرائی ہوچکی ہوں بریسا کی اب میرے شوہر ہیں۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ اب تم ہمارا راستہ روکنے کی کوشش نہ کرو اور اپنے ساتھیوں کے

ساتھ واپس لوٹ جاؤ۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو ماشا'' ولادیمیر تڑپ کر رہ گیا۔

''ایسا مت کہو۔ خدا کے لیے ایسا مت کہو۔ میرے ہوتے ہوئے تم کیسے پرائی ہو سکتی ہو۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔''

اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہے اُس کی غفلت کا فائدہ اُٹھا کر بیر سکی نے اپنی پستول سے اس پر گولی داغ دی جو اس کے شانے میں اتر گئی۔ وہ منہ کے بل زمین پر گرا اور گرتے ہی بیہوش ہو گیا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے گھوڑے پر سوار کیا اور جدھر سے نمودار ہوئے تھے ادھر ہی چلے گئے۔

ادھر شادی شدہ نو بیاہتا چوڑا ابھی بگھی میں سوار بعافیت ''ارباتوف'' پہنچ گیا تھا۔

............☆☆☆............

☆......لیو طالسطائی

☆......رفیق شاہین

حرّیتِ ابلیس

گاؤں کا ایک غریب کسان جب کھیت جوتنے کے لئے علی الصبح گھر سے نکلا تو اس نے ناشتے کے لئے رات کی بچی روکھی سوکھی روٹی بھی ایک کپڑے میں لپیٹ کر اپنے ساتھ رکھ لی تھی۔

اس نے وہ روٹی لپٹا کپڑا ایک جھاڑی کے نیچے رکھ کر اُسے اپنے کوٹ سے ڈھک دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے کھیت کی جُتائی میں مشغول ہو گیا۔ پھر جب دوپہر کے وقت اسے بھوک ستانے لگی اور گھوڑا بھی ہل کھینچتے کھینچتے تھک گیا۔ تو اس نے ہل ایک طرف ڈال دیا اور گھوڑے کو بھی چرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا اور پھر جب جھاڑی کے نیچے اس نے اپنا کوٹ اٹھایا اور کوٹ کے نیچے لپٹا کپڑا نہ پایا تو وہ بڑا حیران و پریشان ہو اُٹھا۔ اُس نے بار بار ادھر اُدھر دیکھا بار بار کوٹ کو جھٹکا مگر بے سود۔ روٹی نہ ملنی تھی نہ ملی۔ یہ بات بآسانی فراموش کر دینا بھی ممکن نہ تھا۔ سخت حیرت اور انتہائی تعجب کی بات تو یہ تھی کہ یہاں کوئی آیا نہ گیا اس کے باوجود بھی روٹی گم ہوگئی۔ اس نے سوچا اُس کی بے دھیانی میں کوئی روٹی لے کر چمپت ہو گیا ہوگا۔

لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ جب کسان نے روٹی جھاڑی کے نیچے رکھی۔ اسی جھاڑی کے پچھلے حصے میں ایک شیطان زادہ چھپا بیٹھا تھا۔ اُس نے ہاتھ آگے بڑھا کر روٹی چرا لی اور اب وہ اس بات کا منتظر تھا کہ دل برداشتہ ہو کر جب کسان خدا سے شکوہ گلہ کرلے گا تو یہ دیکھ کر اس کی خوشی کا کائی ٹھکانہ نہ رہے گا۔ اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔

کسان روٹی کی چوری پر کبیدہ خاطر ہوا تو ضرور مگر جلدی ہی خود پر قابو پا کر وہ زیرِ لب بڑ بڑانے لگا۔

''روٹی چوری ہو جانے اور تھوڑی دیر بھوکا رہنے سے میں مر تو نہ جاؤنگا۔ جس نے میری روٹی لی ہے وہ یقیناً ہی مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہوگا۔ کوئی بات نہیں۔ خدا اس شخص پر اپنا رحم و کرم فرمائے!''

ایک قریبی کنوئیں پر جا کر اُس نے ٹھنڈا تازہ پانی پیا۔ تھوڑی دیر لیٹ کر آرام کیا اور پھر سے گھوڑے کی مدد سے کھیت جوتنا شروع کر دیا۔

شیطان زادے نے اس خیال سے روٹی چرائی تھی کہ جب کسان جھنجلا کر خدا کو بُرا بھلا کہے گا تو اس کا آقا شیطان اس کی اس کارگذاری سے خوش ہو کر اسے انعام سے نوازے گا۔ مگر جب کسان نے اُس کے برعکس روٹی چور کو دعا دیتے ہوئے اپنے منہ سے خدا کا نام لیا تو وہ جل بھن کر کباب ہو گیا۔

یہ واقعہ جب شیطان کے علم میں آیا تو وہ غضبناک ہو اٹھا۔ اُس نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

''اگر اس کسان نے روٹی کی چوری پر ہماری پسند کے کلمات ادا نہیں کیے تو شیطان زادے اس کے ذمہ دار اور قصوروار تم ہو تم۔ تمہیں مان لینا چاہیے کہ تم سے کوتاہی ہوئی ہے اور تم اپنا فرضہ ٹھیک سے نہیں انجام دے پائے ہو۔ جاہل کسان اور توہمات میں گھری ان کی دقیانوسی بیویاں تمہارے کام میں معاون ثابت ہونگی۔ اگر واپس جا کر ان پر تم اپنے شیطان حربے ٹھیک سے آزماؤ گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ کامیابی تمہارے قدم نہ چومے۔ اس کام کے لئے میں تمہیں تین سال کی مہلت دیتا ہوں۔ اس مدت میں اگر تم کامیاب ہو جاتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ یاد رکھو میں تمہیں آب زم زم کے مقدس چشمے میں زندہ جلا کر خاک کر دونگا۔''

اتنا سن کر شیطان زادہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کا چہرا فق پڑ گیا۔ دنیا میں واپسی کے سفر میں راستے بھر وہ یہی سوچتا رہا کہ کامیابی کے حصول کے لئے وہ کونسی حکمت عملی اختیار کرے جس سے شیطانی عتاب سے چھٹکارہ نصیب ہو سکے۔

گاؤں میں آ کر اُس نے ایک محنت کش مزدور اور ایک غریب کسان کا رُوپ دھار لیا اور کسانوں میں شامل ہو کر خود بھی محنت مزدوری کرنے لگا اور پھر شیطان سے ملی تین سالہ مہلت کے پہلے ہی سال میں اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے ایک کسان ساتھی کو مشورہ دیا کہ وہ دلدل میں بیج بکھیرے۔ کسان نے اپنے ساتھی کی بات مان کر بیج دلدل میں بکھیر دے۔ یہ سال خشک سالی کا سال ثابت ہوا۔ علاقے بھر میں فصلیں کھیتوں میں کھڑی ہونے سے پہلے ہی جلتے سورج کی آگ سی دھوپ میں جل جھلس کر رہ گئیں۔ اس کے برعکس جس کسان نے دلدل میں بیج بوئے تھے اس کی گھنی اور اونچی کھڑی فصل سے اناج کے ڈھیر لگ گئے۔ یہ غلہ سال بھر کی گھریلو ضرورت پوری کرنے کے لئے نہ صرف کافی تھا بلکہ اتنا تھا کہ بہت کچھ بچ بھی گیا تھا۔

اور پھر شیطان سے ملی تین سالہ مہلت کے دوسرے سال میں اُسی غریب کسان کو اس نے پہاڑیوں کی ڈھلان پر بیج بکھیرنے کا مشورہ دیا۔ اس سال جہاں دوسرے کسانوں کے بیج پانی کی زیادتی سے زمین میں سڑ کر رہ گئے اور کہیں کہیں جو اناج پیدا ہوا وہ دو تین ماہ کی ضرورت پوری کرنے تک ہی محدود تھا۔ مگر غریب کسان کی پہاڑی ڈھلانوں پر اُگی فصل بہترین فصل ثابت ہوئی جس سے پچھلی فصل سے بھی زیادہ اناج پیدا ہوا۔ کسان ہر طرف اناج کے ڈھیر لگے دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا کہ اس کی کھپت کیسے ہوگی۔

اور پھر شیطان سے ملی تین سالہ مہلت کے تیسرے اور آخری سال میں اس شیطان زادے نے اُسے اناج سے تیز نشے والی شراب کشید کرنے کا ہُنر بھی سکھا دیا۔ اب کیا تھا شراب کا کافی ذخیرہ اکٹھا کر لیا گیا۔ اب وہ کسان اپنے دوستوں کی شراب سے تواضع کرنے لگا اور ان کا ساتھ دینے کے لئے خود بھی پینے لگا تھا۔

پھر شیطان کے دربار میں حاضر خدمت ہو کر شیطان زادے نے خودستائی کرتے ہوئے کہا کہ ''اس نے اپنی کدو کاوش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے اور اپنا فریضہ نہایت ایمانداری سے انجام دیا ہے لہٰذا اس پر عائد شاہد الزامات سے اسے بری کیا جائے۔''

اس پر شیطان نے کہا۔

''ایسے نہیں۔ میں خود نیچے جا کر تمہارے کام کا معائینہ کرونگا۔ تبھی کوئی فیصلہ صادر کرسکونگا۔''

آن کی آن میں شیطان متعلقہ کسان کے مکان میں ورود کر گیا۔ وہاں اُس نے دیکھا کہ کسان نے بستی کے معزز دوست احباب کو اپنے گھر میں مدعو کیا ہوا ہے جنہیں وہ اس کی بیوی شراب سے بھرے گلاس پیش کر رہے ہیں۔ اسی دوران میز سے ٹکرا جانے کی وجہ سے اس کی بیوی کے ہاتھ میں تھمے گلاس سے شراب کے چند قطرے چھلک کر زمین پر گر پڑے۔ اس پر وہ کسان غصے میں بھر کر آپے سے باہر ہو گیا اور بیوی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ کہنے لگا۔

''کتیا کی بچی! یہ تو کیا کر رہی ہے۔ کیا تیرے ہاتھوں کو فالج مار گیا ہے کہ ٹھیک سے گلاس بھی نہیں تھام سکتی۔ یہ تیرے میکے کی نالی کا گندا پانی نہیں یہ میرے گھر کی قیمتی شراب ہے شراب۔ اگر پٹائی سے بچنا ہے تو گلاس کو ٹھیک سے تھام ٹھیک سے۔''

شیطان زادے نے اپنے آقا شیطان کو کہنی کا ٹھوکا دے کر کہا۔

''دیکھا آقا! یہ وہی غریب کسان ہے جس نے روٹی کی چوری پر روٹی چور کو دعائیں دی تھیں۔''

بیوی پر غصہ کرنے والا وہ کسان گھر آئے مہمانوں کو مسکرا مسکرا شراب کے جام پیش کر رہا تھا کہ اسی دوران کھیتوں سے واپسی تھکا ہارا ایک کسان بھی بلا مدعو کئے وہاں چلا آیا۔ اُس نے آتے ہی وہاں موجود بستی والوں کو سلام کیا اور انہیں کے درمیان جا بیٹھا۔ سب کے آگے جام آتے دیکھ دیکھ کر اُس نے سوچا کہ اگر مجھے بھی شراب سے بھرا ایک گلاس مل جائے تو ساری جسمانی تھکن دور ہو جائے گی۔ اسی اُمید میں وہ دوسروں کو پیتا دیکھ کر شراب کے لئے ترستا رہا مگر اسے جام کی پیشکش سے محروم رکھا گیا۔ اسے دیکھتے ہی میزبان کی تیوری میں بل پڑ گئے تھے۔ وہ اُس پر حقارت کی نظر ڈال کر زور زور سے بڑبڑائے جا رہا تھا۔

''بے شرموں نے میرے گھر کو تو خالہ جی کا گھر سمجھ لیا ہے کہ منہ اُٹھایا اور چلے آئے کہ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ میرا مکان میرا مکان ہے یہ کوئی خواجہ جی کا لنگر خانہ نہیں ہے کہ ہر آنے والے کا خیال رکھا جائے۔ ایسے مفت خوروں کو پلاؤں اور منہ لگاؤں میں ان میں سے نہیں ہوں۔''

یہ منظر دیکھ کر شیطان کا چہرا خوشی سے شفق رنگ ہو گیا۔ اس پر شیطان زادے نے کہا۔

''ابھی کیا ہے آقا حضور! آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔''

مہمانوں کے ساتھ میزبان پر بھی شراب اثر انداز ہو چکی تھی۔ وہ سب کے سب نشے کے ترنگ میں میاں مٹھو بنے اپنی اپنی قصیدہ خوانی کرنے اور تعریفوں کے پُل باندھنے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے میں لگے تھے۔ لگتا تھا انہیں خود ستائی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ انہیں ایسا کرتے دیکھ اور سُن کر شیطان خوب لطف انداز ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی اسے اپنے ماتحت شیطان زادے کی اعلیٰ کارکردگی پر فخر بھی ہو رہا تھا کہ جو اُس نے کہا واقعی کر دکھایا ہے۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ جب شراب پی کر یہ لوگ اپنی تعریف میں جھوٹ پر جھوٹ بول سکتے ہیں، ایک دوسرے کو گمرہ کر سکتے ہیں تو ان کا ہماری جماعت میں شامل ہو جانا ذرا بھی مشکل نہ ہوگا۔

جب آقا حضور کو خوش دیکھا تو آقا زادے نے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی کیا ہے آقا حضور! ابھی تو اور بھی بہت کچھ دیکھنا باقی ہے۔ ان لوگوں کو ایک اور گلاس چڑھانے دیجئے پھر دیکھئے گا ان کا تماشہ۔ یہ لوگ جو لومڑی بنے ایک دوسرے کے آگے اپنی دمیں ہلا رہے ہیں یہی لوگ وحشی اور خونخوار بھیڑیوں میں تبدیل ہو جائینگے۔''

محفل میں موجود سبھی مہمانوں نے مع میزبان کے ایک ایک گلاس اور چڑھالیا کہ تبھی ان کے لہجوں میں تلخی اور آوازوں میں درشتی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے چیخنا چلانا اور مغلظات بکنا شروع کر دیا اور پھر دست بہ گریباں ہو کر باہم مکوں اور گھونسوں کا تبادلہ کرنے لگے۔ ان میں میزبان بھی تھا جس کے مہمانوں نے اُس کی پٹائی بڑی بے دردی سے کی تھی۔

''واہ! کیا خوب نظارہ ہے۔'' شیطان جوشِ مسرت سے باآواز بلند کہا۔ ''جی خوش ہو گیا۔ یہ تو واقعی آئٹم نمبر ون ہے۔''

''آقا حضور! جلد بازی سے کام نہ لیں۔'' شیطان زادے نے کہا۔ ''اوّل درجے کا آئٹم تو اس عالم ظہور میں آئیگا جب یہ لوگ بھیڑیوں کی طرح ایک دوسرے پر غُراتے اور چیخ وپکار مچاتے ہوئے ایکا ایکی خنزیروں اور سوروں میں تبدیل ہو جائینگے۔ یہ منظر دیکھنے کے لئے انہیں ایک اور گلاس چڑھا لینے دیجئے۔''

اور واقعی تیسرا گلاس پیتے ہی وہ لوگ خونخوار درندوں میں تبدیل ہو گئے۔ وہ سب کے سب بڑی دلخراش اور درندوں جیسی آوازوں میں چیخ چلا رہے تھے اور انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ اور کیوں کر رہے ہیں۔؟ وہ بڑی افسوسناک اور قابل ترس حالت میں تھے۔ یہ نازک صورتحال بذاتِ خود اس تقریب کے اختتام کا سبب بن گئی تھی۔ مہمان رخصت ہو رہے تھے کچھ تنہا کچھ جوڑی اور کچھ تکڈم کی شکل میں۔ گلی شرابیوں سے بھری تھی۔ شرابی لڑکھڑا رہے تھے۔ ڈگمگا رہے تھے۔ بار بار گر رہے تھے اور بار بار سنبھل رہے تھے۔ میزبان جو اپنے مہمانوں سے بری طرح پٹ چکا تھا۔ اپنے مہمانوں کو گلی میں دور تک کھدیڑنے کے خیال سے ان کے پیچھے دوڑ لگانے کی کوشش میں ٹانگوں کے ساتھ نہ دینے پر بار بار گر پڑتا تھا۔ پھر بھی بھیڑیے کی طرح غزاتے ہوئے جب اس نے شرابیوں کو بھگانیکے خیال سے ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے دوڑ لگانے کی کوشش کی تو وہ ایک گندے پانی اور کیچڑ سے بھرے گڑھے میں گر گیا اور پھر جب اسے اس گڑھے سے باہر نکالا گیا تو سرتاپا کیچڑ میں لتھڑے ہونے کے بعد وہ ہو بہو سور سا نظر آنے لگا اور اُس وقت اس کے منہ سے جو آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ بھی سور کی آواز سے مشابہ تھیں۔

یہ منظر دیکھ کر شیطان خوشی سے پھولے نہ سمایا اور س نے شیطان زادے کی تعریف میں کہا۔

''تمہاری ایجاد کردہ یہ شراب تو واقعی بڑی معرکتہ اُلآراشئے ہے جسے پی کر خدا کی یہ مخلوق خود بخود ہماری طرف کھنچی چلی آتی ہے۔ تمہارے اس کارنامے سے تمہاری پچھلی بھول کا خود بخود ازالہ ہو جاتا ہے۔ میری ناراضگی دور ہوئی اور اب میں تم سے بہت بہت خوش ہوں۔ مگر مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم نے شراب میں یہ صفت کیسے پیدا کی جو اچھے خاصے انسان کو جانور بنا دیتی ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ تم نے ان کے پہلے گلاس کی شراب میں لومڑی کے خون کے قطرے ٹپکا دیے ہونگے جس سے ان میں لومڑ کی صفات رُونما ہوئیں تھیں۔ دوسرے گلاس، میں تم نے بھیڑے کو خون کی آمیزش کی ہوگی جس سے وہ بھیڑیوں کی طرح

غرّانے لگے اور اسی طرح تم نے ان کے تیسرے گلاس میں ضروری خنزیر کا خون ملایا ہوگا بولو بولو! یہی کیا تھا نا تم نے۔؟"

"نہیں آقا حضور! میرا فارمولہ اس سے مختلف ہے۔ شراب میں درندوں کے خون کی آمیزش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ انسان بذات خود اپنے خون میں درندوں کا ملا خون لے کر پیدا ہوتا ہے۔ جب انسان کو اس کی ضرورت سے زیادہ ہی نہیں ملتا ہے تو انسانی خون میں شامل انسانی درندگی اپنا اثر نہیں دکھاتی ہے اور سوئی پڑی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روٹی کی چوری پر وہ کسان درندہ نہ بن سکا انسان ہی رہا اور اس نے روٹی چور کو دعائیں دی تھیں۔ اس کسان کو درندہ بنانے اس میں سوئے ہوئے درندگی کے خون کو جگانے کے لئے میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اُس کی ضرورت سے زیادہ اناج حاصل کرنے میں میں نے اُس کی ہر ممکن مدد کی اور دو سال تک میں نے یہی کیا اور پھر تیسرے سال میں نے یہ کیا کہ اسے شراب کشید کرنے کا ہنر سکھا دیا تاکہ وہ شراب کی مستی میں گم ہو جائے اور اس طرح جب اس نے خدا کی عطا کردہ نعمت عظمیٰ رزق کو شراب میں تبدیل کر دیا تو اس کا اپنا لہو تو مردہ ہو گیا مگر اس کی شریانوں میں جو لومڑی، بھیڑیے اور خنزیر کا لہو سویا پڑا تھا۔ وہ ایکا ایکی جاگ کر اور اُچھل کر باہر آ گیا۔ اب میرے کرنے لائق کچھ باقی نہیں بچا ہے۔ اب وہ جب تک کشید کر کے شراب پیتا رہے گا۔ اس میں عود کر آئی درندگی اسے کبھی دوبارہ انسان نہیں بننے دے گی اور وہ خدا سے دور اور ہمارے قریب رہنے میں ہی خوشی محسوس کریگا۔"

شیطان نے پشت ٹھونک کر اسے شاباسی دی اور نہ صرف اس کی پچھلی غلطی معاف کر دی بلکہ اسے ترقی دے کر ایک ممتاز عہدہ بھی سونپ دیا۔

............☆☆☆............

☆......انتون چیخوف
☆......رفیق شاہین

خارِ مغیلاں

گریگری سیمونووِچ سچگلوف کمر کے درد کی شدت سے مضطرب ہو کر اور ہڑ بڑا کر اچانک ہی نیند سے جاگ اُٹھا تھا۔ اُنے پہلو بدلا اور صدا لگائی۔

''ناستیا! ذرا اسپرٹ لے کر میری کمر کی مالش کر دو۔'' مگر دوسری طرف سے اُسے اپنی بات کا کوئی جواب نہ ملا۔ اُس نے تجسس زدہ ہو کر اندھیرے میں ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا۔ بستر پر دوسرا کوئی نہیں تھا۔ بس وہاں وہ خود ہی تھا یکہ وتنہا۔ ''کہاں جا کے مرگئی یہ''؟ بڑبڑاتے ہوئے اُس نے پھر سے آواز لگائی۔ ''ناستیا! ناستیا!''

اس بار بھی اُس کی آواز صدا بہ صحرا ہی ثابت ہوئی۔ اُسے کوئی جواب نہیں ملا۔ اُسے چوکیدار کی صرف وہی آواز سننے کو ملی جو شمع گل کرتے وقت پھونک مارنے سے پیدا ہوتی ہے۔ نحوست اور بدشگونی کے انجانے سے خوف کے ساتھ سچگلوف نے پیشانی سے سرد پسینہ پونچھا اور بستر سے نیچے اُتر آیا۔ صبح کے تین بجے تھے۔

''اس وقت تو ناستیا گہر نیند میں ہوتی تھی اور اُسے اپنے تن بدن کی بھی سُدھ بُدھ نہیں رہتی تھی'' سچگلوف نے سوچا اور جلدی سے بدن پر گاؤن لپیٹ کر صحن میں نکل آیا۔

آسمان پر چودھویں کا چاند اپنے شباب پر تھا۔ سیم تن چاندنی کی روپہلی کرنوں نے آسمان، زمین، حویلی، صحن اور باغ بغیچوں کو اپنی مرمریں باہوں کے حلقے میں سمیٹ رکھا تھا۔ موسم خزاں کے سائے تلے برگ وبار سے عاری وعریاں درخت اداسی بھری نیم غنودگی کے عالم میں مارچ کے اواخر میں آنے والے موسم بہار کے خواب زاروں میں کھوئے ہوئے تھے۔ سچگلوف نے صحن میں کھڑے ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دور تک کوئی بھی نہیں تھا ماسوا ایک الہڑ بچھڑے کے جو پاؤں میں رسی لپٹ جانے کے سبب مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے برابر اُچھل کود اور زور آزمائی کئے جا رہا تھا۔ سچگلوف باغ میں پہنچا تو وہاں بھی کوئی نہیں تھا اور ہر طرف خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔

''کہیں وہ اپنے گاؤں تو نہیں چلی گئی؟'' سچگلوف نے ذہن پر دباؤ ڈالا اور ایک انجانے سے خوف کی سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں تیرتی چلی گئی اُس نے سوچا۔ ''اب اگر وہ باغ کے وسط میں واقع صحت کدے (Summer House) میں بھی نہ ملی تو آدمی بھیج کر اُسے گاؤں سے بلانا پڑیگا۔ وہ ناستیا کا مزاج آشنا ہونے کے سبب جانتا تھا کہ وہ جب بھی حویلی کے ماحول سے اکتا جاتی تو بغیر کہے سنے وہ اپنے والدین کے پاس گاؤں پہنچ جاتی تھی۔ اُن نے اُداسی کے غلبے سے چھٹکارہ پانے کا ایک طریقہ یہ بھی دریافت کر رکھا تھا کہ وہ باغ کے سمر ہاؤس پہنچ جاتی اور وہاں تنہا بیٹھی اداس نغمے الاپتی رہتی تھی۔

''اب تو دن بہ دن میرے قویٰ مضمل ہوتے جارہے ہیں۔ ضعیفی نے حویلی میں قدم رکھ

دیئے ہیں ظاہر ہے میں ناستیا کے لئے شیریں چیریوں سے بھرا پیالہ تو ہونے سے رہا مگر اس میں کچھ میرا قصور بھی تو نہیں ہے'' وہ سوچتا رہا اور اُداس ہوتا رہا۔

اپنے ایسے ہی اُداس خیالوں میں گم جب وہ سمر ہاؤس کے نزدیک پہنچا اُسے ایک عورت کی آواز سنائی پڑی۔ وہ عورت اُس وقت کوئی اُداس نغمہ نہیں الاپ رہی تھی بلکہ وہ کسی سے کسی کا شکوہ بڑے تلخ لب و لہجے میں کر رہی تھی جسے سُن کر کسی مرد نے اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر تم اُس بوڑھے شیطان کو چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟ میرا کہا مانو تو اس کی صورت پر لعنت بھیج دو۔'' بغض و نفرت سے بھرے لہجے میں اُس مرد نے مزید کہا۔

''مخمل و کمخواب کے قیمتی ملبوس اور سونے چاندی کے برتنوں میں موجود لذیذ کھانوں سے شکم سیری ہی زندگی نہیں ہے۔ تم اگر ایسا سوچتی ہو تو بہت بڑی غلطی کر بیٹھی ہو اس لغزش پر تو تمہاری پٹائی ہونی چاہئے مگر نہ تو کوئی تمہیں روکنے والا ہے نہ کوئی ٹوکنے والا۔ اس سڑی ہوئی دلدل سے باہر نکل آؤ ناستیا! توڑ دو ظالم شکاری کے جال کو۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔''

''تریفون تم میرے ذاتی اور گھریلو خالات سے واقف نہیں ہو اسی لئے ایسا کہہ رہے ہو۔ اگر میں نے ایسا اپنے ذاتی عیش و آرام کے لئے کیا ہوتا تو میں اس متعفن ڈھانچے سے زیادہ نہیں تو سو میل دور ضرور چلی گئی ہوتی۔ مگر میں کچھ کر بھی تو نہیں سکتی میرے خانگی حالات انتہائی بدتر ہیں۔ میرے بے در و بے گھر باپ کو سر چھپانے کے لئے مکان بنوا تا ہے۔ ادھر میرا بھائی بھی فوج میں ٹریننگ لے رہا ہے اسے تمبا کو اور اس کی ضرورت کی دیگر اشیاء بھی مجھے ہی جٹانی پڑتی ہیں۔''

پھر کوئی مکالمہ فضا میں نہ گونجا اس کے برعکس ماحول نے بڑی حیرت انگیز اور تجسس خیز خاموشی سادھ لی جس کے آنچل سے چھن کر آنے والی نحیف صدائیں سرگوشیوں سسکیوں آہوں کراہوں اور ہونٹوں کے تصادم سے، اُبھرنے والے گرم بوسوں کی پُراسرار آوازیں تھیں۔

سچیگلوف کو لگا زبردست اور خوفناک دھماکے کے ساتھ اس پر آسمان سے بجلی گر پڑی ہے۔ انگنت خار مغیلاں اس کے دل کے نازک پردوں میں اچانک ہی اندر تک پیوست ہو گئے تھے۔ دفور حیرت اور اتھاہ صدمے سے اُس پر بے ہوشی سی طاری ہوئی جا رہی تھی۔ اُس نے مرد کی آواز صاف طور پر پہچان لی تھی وہ تریفون ہی تھا۔ اس کی حویلی کا مختار عام، اس کا اپنا خادم۔

''اس عورت کو میں غلاظتوں کے ڈھیر سے اُٹھا کر اپنی محل جیسی حویلی میں لایا تھا۔ اسے دنیا بھر کے عیش و آسائش سے نوازا۔ اس کی ہر خواہش کی تکمیل کی دوستانہ اور فیاضانہ سلوک روا رکھا۔ کیا میں اس کا محسن نہیں ہوں؟ کیا اپنے محسنوں سے ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔؟'' وہ ایک زخم خوردہ شکستہ دل اور مظلوم انسان کی طرح بڑی بیکسی و بےبسی کے عالم میں سوچ رہا تھا۔

''میں نے انتہائی فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس عورت کو وہ سبھی حقوق دیے تھے جو ایک منکوحہ بیوی کے ہوتے ہیں۔ اُف حقیقت کتنی تلخ اور شرمناک ہے آج کتنے گہرے صدمے سے دوچار ہوا ہوں۔ کیسے غم و افسوس کا مقام ہے کہ وہ میرے ہوتے ہوئے میری ہی حویلی میں میرے ہی نمک حرام اور کم اوقات خادم تریفون کی آغوش گرما رہی ہے اس کے ساتھ اپنا منہ کالا کر رہی ہے۔ اس گندے

چیتھڑوں میں لپٹی دغاباز عورت کو میں نے یتی یتی یمتی اور قیتی پوشاکیں سلوا کر دی تھیں۔ جب بھی جتنی بھی رقم اس نے طلب کی بلا عذر عطا کر دی۔ اُسے سونے چاندی کے برتنوں میں طعام کرایا۔ آزالوی اور خود مختاری کی دولت سے بھی نوازا اور سب کچھ وہی کیا جو ایک بیوی کے ساتھ کرنا چاہئے۔ کیا میرے احسانوں کا بدلہ اُسے اسی طرح چکانا چاہئے کہ وہ مجھے بوڑھا شیطان اور متعفن ڈھانچہ کہہ کر پکارے میرے خادم کے ساتھ منہ کالا کرے اور میری عزت و ناموس کا جنازہ ہی نکال کر رکھ دے۔؟"

سچیگلوف جو جامد سا ہو کر رہ گیا تھا وہیں کھڑا سمر ہاؤس سے اُبھرنے والی سرگوشیوں، سرسراہٹوں، سسکاریوں اور تیز رفتار سانسوں میں الجھی لذت انگیز آہ و کراہ کی بیہمانہ اور وحشیانہ آوازوں کے صوتی آہنگ اور ان کے زیر و بم کی مدد سے ان کے باہمی اختلاط کے ہیجان خیز منظر اپنے تصورات کی نگاہوں سے دیکھتا رہا اور اندر ہی اندر سلگتا رہا۔ اس کی کپنٹیاں دھڑک رہی تھیں انکھوں کے سامنے پتنگے ناچ رہے تھے۔ دل بھڑکتے شعلوں کا آتش کدہ بن چکا تھا اور اس کا سارا جسم بید کی مانند لرز رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کسی نادیدہ اور اذتیناک بیماری نے اچانک ہی اس پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ اسے شدید کمزوری اور غشی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہاں اب مزید رکنا اس کے بس سے باہر ہو چکا تھا وہ لٹا پٹا اور دلگیر سا اپنے کمرے میں چلا آیا اور کھڑے سے بستر پر گر پڑا۔

"وہ اب جہنم میں جائے۔" اُس نے سوچا۔ "غالباً وہ یہ سمجھ بیٹھی ہے کہ میں اُس کے بغیر نہیں رہ پاؤنگا...... نہیں...... یہ اُس کی غلط فہمی ہے...... میں کل ہی اُسے حویلی سے دفع کر دونگا...... اپنی اوقات کے مطابق اب وہ شوق سے اس گھٹیا آدمی کے ساتھ رہے...... لٹاتی رہے اپنی جوانی اس ذلیل تریفون پر مجھے اس سے کیا...... مجھے تو اب اُس غدار اور نمک حرام تریفون کی صورت تک دیکھنا گوارہ نہیں ہے...... صبح ہوتے ہی دھکے دے کر نکالوں گا اُس ناہنجار کو سویرے ہی......"

اُس نے خود کو کمبل میں چھپالیا۔ سوچ کا سلسلہ کسی طرح ٹوٹنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ اُس کی سوچ کربناک تھی۔ اذیتناک تھی، دل شکن تھی اور اس کی گرفت سے رہائی اُس کے لئے ناممکن ہو چکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد تھکی ہاری ناسیتا واپس آ کر اس کے پہلو میں لیٹ گئی۔ وہ پُرسکون تھی جیسے کہ وہ سمر ہاؤس گئی ہی نہ ہو۔ جیسے کہ وہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ یہ دیکھ کر سچیگلوف کے دل میں لگی آگ شعلوں میں ڈھل کر اسے اور بھی جلانے اور تڑپانے لگی "اس غدار تریفون کو تو دھکے دے کر باہر کا راستہ دکھاؤ نگا۔ مگر اس سے کیا ہوگا؟...... کچھ بھی تو نہیں...... وہ کہیں دوسری ملازمت حاصل کرے گا...... اسے تو احساس بھی نہ ہوگا کہ اُس نے بُرا کیا ہے...... اخلاق گناہ کیا ہے...... اپنے آقا کے پاؤں پر پاؤں رکھا ہے...... نمک حرامی اور غداری کی ہے...... رذالت و کمینگی کا مظاہرہ کیا ہے...... نہیں...... مجھے اُسے سزا تو دینی ہی ہوگی...... ایسی عبرتناک سزا کہ وہ تازندگی پچھتاوے کی جہنمی آگ میں جلتا اور تڑپتا رہے...... کاش! گیا وقت پلٹ آئے جس میں جاگیردار اور زمیندار اپنے نمک حرام غلاموں کو کوڑوں سے پیٹ پیٹ ہلاک کر دیا کرتے تھے...... میں اسے گھوڑوں کے اصطبل میں رسّی سے بندھوا کر اس کی ننگی پشت پر اس وقت تک کوڑے برساتا رہتا جب تک کہ وہ دم نہ توڑ دیتا...... کیا مزہ آتا جب وہ زار و قطار آنسو بہا کر رو رو کر اور گڑ گڑا گڑ گڑا کر مجھ سے رحم کی بھیک مانگتا اور میں جلاد کے ہاتھ میں کوڑا دیکر کہتا۔ میں تو تھک گیا ہوں

اب تو اس کی خبر لے ذرا ٹھیک سے مارا سے......زور لگا کے......اور طاقت سے...... یہ رحم کے لائق نہیں ہے......اس نے اپنے مالک کے اعتبار کا خون کیا ہے......اور اس سے بھی زیادہ مزہ تو اُس وقت آتا جب اُس کی محبوبہ دلنواز بھی اپنے اس عاشق زار کی کی خاطر داری کا یہ ہوش رُبا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتی تب میں مُسکرا کر اس سے پوچھتا کہو میری جان! کیا یہ منظر پر بہار آپ کو پسند آیا۔؟''

صبح کے وقت حسب معمول ناسیتا نے اُس کی پیالی میں چائے اُنڈیل دی۔ خاموشی سے نظر اُٹھا کر اُس نے اُس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اُس کے چہرے سے طمانیت ٹپک رہی تھی اور اس کی ساکت سی آنکھیں ہر جذبے سے عادی تھیں۔

''غالباً یہی بہتر ہوگا کہ رات کے حوالے سے میں اُس سے کسی قسم کی باز پرس نہ کروں'' اس نے سوچا۔ ''انسان کو اس کی غلطی محسوس کرانے کے لئے اسے موقع اور وقت دینا چاہئے بہتر طریقہ یہی ہوگا کہ میں اخلاق سلوک کی مار سے اسے ذہنی اذیت میں مبتلا کر دوں۔ وہ ایک دن خود ہی مان لے گی کہ اُس نے کتنا غلط کام کیا ہے۔ لیکن اس بات کی ضمانت کیا ہے کہ وہ تریفون کو چھوڑ دیگی۔ وہ اُس کے ساتھ فرار بھی تو ہو سکتی ہے۔'' یہ خیال دل میں آتے ہی اس کا چہرا خوف سے ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔ پھر اس نے خود پر قابو پا کر اور اپنے لہجے میں نرمی پیدا کر کے کہا۔

''ناستیا ڈرانگ چائے کے ساتھ یہ کریم رول بھی تو لو یہ میں نے خاص طور پر تمہارے لئے ہی تو منگوائے ہیں۔''

ٹھیک آٹھ بجے حویلی کے مختار تریفون نے اپنے مالک کے پاس آ کر اُسے کچھ ضروری کاغذات اور کچھ رسیدیں پیش کیں۔ سچیگلوف کو لگا وہ اُسے نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ کسی فاتح اعظم کی طرح اُس کی چھاتی افتخار و تکبر سے تنی ہوئی تھی۔ اُس کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے اُس نے سوچا اسے ملازمت سے برطرف کرنا تو ناکافی سزا ہوگی۔ باوقار طریقہ تو یہ ہے کہ اپنے اسلاف کی شاندار روایت کے مطابق پر تازیانوں کی برسات کی جائے۔

''یہ کیا ہے؟ لگتا ہے تمہیں کام میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' سچیگلوف نے کاغذات تریفون کے سامنے ٹپک کر اسے لتاڑا۔

''رسید پر کیا لکھا ہے تم نے اسے میں پندرہ پڑھوں یا پچھتر؟ کھوکھلی کھوپڑی کے کیا تم سات کا ہندسہ بھی نہیں بنا سکتے؟ سات کی شکل آگ کریدنے والے پوکر (Poker) سے مشابہہ ہوتی ہے جبکہ ایک کا ہندسہ کوڑے کے ہتھے کی طرح ہوتا ہے جس کے چمڑے کی دم سے تم جیسے لوگوں کی اصطبل میں کھالیں اُدھیڑی جاتی ہیں۔''

''ہوتا ہوگا، مجھے اس سے کیا۔'' تریفون نے چھت پر نگاہ مرتکز کرتے ہوئے ناگواری کا مظاہرہ کیا۔

سچیگلوف نے اُسے کنکھیوں سے دیکھا۔ تریفون کی جھلاہٹ اس کے بگڑے تیور سے نمایاں ہو رہی تھی۔ ذلت کے احساس سے اس کا چہرا لال بھبھوکا ہوا اُٹھا تھا۔ تریفوں کے باغیانہ اور متکبرانہ انداز کو سہنا اسے مشکل ہو گیا تو اُسے نے چیخ کر کہا۔ ''اب کھڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ واہیات آدمی جاؤ

یہاں سے۔ دفع ہو جاؤ۔"

سچیکوف کو صحن میں چہل قدمی کرتے ہوئے شام ہو چکی تھی۔ اس دوران اُس نے اپنے مجرموں کو سزایاب کرنے اور اُن سے انتقام لینے کے نجانے کتنے منصوبے تعمیر کر ڈالے تھے لیکن اس کا ہر منصوبہ تعزیرات روس میں موجود ہولناک دفعات سے متصادم ہو کر پاش پاش ہو چکا تھا۔ بالآخر غور و فکر کی ہر منزل سے گزرنے کے بعد وہ جس نتیجے پر پہنچا وہ اُسے بارود کے ڈھیر پر کھڑا کر کے اس کے جسم کے چیتھڑے ہوا میں بکھیر دینے کے مترادف تھا...... اب مسئلے کا حل ممکن نہ تھا۔ اپنے ضمیر کی آواز پر اُسے یہ اعتراف کرنا ہی پڑا کہ وہ مٹی کے ڈبے کی طرح بے مایہ بے بس اور لاچار ہے۔ اب اپنے دشمنوں سے انتقام لینے یا انہیں سزایاب کرنے کے لئے نہ اُس میں طاقت ہے نہ حوصلہ۔ اب نہ وہ تریفون کا کچھ بگاڑ سکتا ہے اور نہ ناستیا کا۔

اگلے دن صبح کا آغاز ہو چکا تھا۔ سویرے دو اور تین کے درمیانی وقفے میں وہ دیر سے سمر ہاؤس کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس نے اس دوران چھپ کر جوان دونوں کی گفتگو سنی وہ پچھلے دن سے بھی زیادہ اشتعال انگیز ہولناک اور صدمہ پہنچانے والی تھی۔ سمر ہاؤس کے بند کمرے میں موجود تریفون بلند بانگ قہقہوں کے درمیان کسی کو اپنے مالک کے بارے میں بڑے مضحکہ خیز انداز میں بتا رہا تھا۔

"اکڑ تو اس میں اتنی ہے مگر جانتی ہو اس سڑیل میں دم کتنا ہے؟ یو سمجھ" لو کہ اگر میں اُس بوڑھے ابلیس کا گریبان پکڑ کر اُسے ذرا بھی آگے پیچھے جھلا دوں تو یقین جانو اُس کھوسٹ کا کھڑے کھڑے ہی دم نکل جائے گا۔" یہ سرکشی اور گستاخی کی انتہا تھی جسے سچیگلوف برداشت نہ کر سکا اور غیر ارادی طور پر چلا اُٹھا۔

"بدمعاش! تو یہ کس کے لئے کہہ رہا ہے؟ کس کا گریبان؟ کس کا دم نکل جائے گا"

ناگاہ سمر ہاؤس میں گہرا سناٹا چھا گیا۔ پھر چند لمحوں کے بعد ہی تریفون نے کھکھار کر گلا صاف کیا اور دروازہ کھول کر دہلیز پر آن کھڑا ہوا اور درشت لہجے میں بولا۔ "کون چلا رہا ہے؟ کون کھڑا ہے وہاں؟" پھر مالک کو پہچان کر اس کے ہونٹوں پر تبسم کھل اٹھا۔

"اچھا تو یہ آپ ہیں۔" پھر ایک منٹ تک فضا میں گہری خاموشی رہی پھر تریفوں نے آسمان پر مسکراتے ہوئے روشن چاند سے مخاطب ہو کر بڑے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "سنا ہے اگلے زمانے میں ہمارے آقا لوگ ہمیں اصطبل میں دُرے لگوا کر شہید کر دیا کرتے تھے۔ خدا جانے اب ہم سے گنہگاروں کا نہ جانے کیا حشر ہونے والا ہے میں تو خوف و دہشت سے ہی مرا جا رہا ہوں۔ میرے تو گھٹنے بھی کانپ رہے ہیں۔ لگتا ہے میری تو ملازمت بھی ہاتھ سے گئی۔" اتنا کہہ کر اس نے دیوانہ وار کئی بیباک قہقہے فضا میں اُچھال دیے۔ پھر وہ باغ کی راہداری پر قدم رکھ کر تیزی سے اپنے کوارٹر والی عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ سچیگلوف نے لپک کر اُس کا تعاقب کیا اور جب وہ باغ کی آخری حد پر تھا سچیگلوف نے اُس کی استین مضبوطی سے تھام لی گڑگڑا کر کہا۔ "تریفون خدا کے لئے میری بات مان لو۔ بدمعاش میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں، میری ضعیفی پر ترس کھاؤ اور سُن تو لو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" تریفون نے اکھڑے لہجے میں کہا۔ "جو کہنا ہے جلدی کہو۔"

''مہربانی کر کے میری بات غور سے سنو میں تمہیں پچیس روبل دینے کے لئے تیار ہوں اور مزید کے لئے کہو تو میں تمہیں تیس روبل بھی دینے کو راضی ہوں اس کے بدلے میں بس تم مجھے اجازت دیدو، اس بات کی اجازت کہ میں تمہیں صرف ایک کوڑا رسید کر سکوں۔ صرف اور صرف ایک چابک میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اس سے تمہیں ذرا سی بھی گزند نہیں پہنچنے دونگا۔ کوڑا تمہیں بہت دھیرے سے لگاؤنگا بس یوں سمجھ لو کہ چھلاؤنگا۔ تم اسے میرے دل کی خوشی سمجھ کر میری بات کی عزت رکھ لو۔ تو بولو ہے نہ اجازت۔؟''

تریفون نے پھر سے چاند پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔ وہ کسی ماہر اداکار کی طرح تحیر و تجسس پیدا کرنے کی غرض سے یونہی دنیا و مافیہا سے بے نیاز خاموشی کھڑا چاند کو ٹکٹکی باندھ کر تکتا رہا اور پھر اچانک ہی بڑے ڈرامائی انداز میں اپنے آقا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر بڑے باوقار لہجے میں کہا۔

''مجھے یہ سودا منظور نہیں، ہے سمجھے؟''

..................☆☆☆..................

☆......او ہینری
☆......رفیق شاہین

جہانِ دگر

''پوسٹ'' کے ایک رپورٹر کی ہاؤسٹن کے نوجوان ڈاکٹر سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ پھر ایک دوپہر کی دوسری ملاقات میں وہ دونوں ہی آپس میں اتنے مانوس ہوگئے کہ جب رپورٹر نے ڈاکٹر کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ کیوں نہ کسی کیفے میں جاکر لیموں کی شکنجی کا لطف لیا جائے تو وہ فوراً ہی رضامند ہوگیا۔

دونوں قریب ہی واقع کیفے کے ایک پُرسکون گوشے میں چھوٹی سی میز کے اردگرد پنکھے کے نیچے بچھی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ لیموں کی شکنجی کے گلاس خالی ہوتے ہی ڈاکٹر نے بل چُکا دیا۔ رپورٹر جو گفتگو کے موڈ میں تھا اُس نے بات چیت کو طول دینے کے خیال سے گفتگو کا رُخ پیشہ طب کی سمت موڑتے ہوئے دریافت کیا کہ کیا عام مریضوں کے علاوہ ڈاکٹر کے پاس ایسے مریض نہیں آتے جن کے عجیب وغریب امراض اپنے معالج کو حیرت زدہ کردیں اور ان میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو جائے۔ ''آتے ہیں۔ بالکل آتے ہیں'' ڈاکٹر نے کہا مگر ڈاکٹر کے معزز پیشے کا تقاضہ جہاں مریضوں کا علاج کرنا ہے وہیں اُس کا اخلاقی فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مریضوں کے نجی معاملات کو صیغہ راز ہی میں رکھے۔ پھر بھی آپ نے پوچھا ہے تو مجھے یہ بتانے میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ بس ایک ہی ایسا کیس میرے پاس آیا ہے جسے عجیب وغریب مانا جاسکتا ہے۔ اُسے فرضی ناموں سے بیان کرنے میں مجھے کوئی تکلف نہ ہوگا۔''

''تو پھر دیر کیسی۔'' رپورٹر نے اشتیاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا داستان ٹھیک سے سننے کے لئے میں اپنے لئے ایک اور شربت کا گلاس منگوالوں۔؟''

ڈاکٹر نے اپنی جیت ٹٹولتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہ کوئی پُرانا قصہ نہیں محض ہفتے بھر پہلے کی ہی بات ہے۔''

ڈاکٹر نے کہانی کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''میں اپنے کلینک میں بیٹھا دیر سے مریضوں کی آمد کا منتظر تھا کہ تبھی مجھے کسی کے قدموں کے آہٹ سنائی دی۔ میں نے دیکھا وہ ایک حسین وجمیل دوشیزہ تھی جو میرے کمرے میں چلی آرہی تھی۔ سبک ودلکش خدوخال سے سجا سنورا ایسا کشش انگیز ودلآویز چہرا میں نے پہلی بار ہی دیکھا تھا۔ اُس کے قدم شرابیوں کی طرح ڈگمگا رہے تھے جو اُسے کبھی دائیں طرف ڈھکیل دیتے تو کبھی بائیں طرف بڑی جدوجہد او کدوکاوش سے وہ مجھ تک پہنچ پائی تھی۔ میں نے اُسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اُس کے حسین چہرے پر حزن وملال اور گھنی اُداسی کے نقوش نمایاں تھے۔ اس نے نہایت شیریں، سریلی اور رسیلی سی آواز میں کہا۔

''ڈاکٹر صاحب میں! خود سے متعلق اپنی غیر معمولی کیفیات آپ کے علم میں لانا چاہتی ہوں، اگر چہ عین ممکن ہے کہ یہ تفصیلات جس کا میرے آبائی، نسلی اور خاندانی معاملات سے براہِ راست تعلق

ہے۔ آپ کو شدید اُلجھن اور اکتاہٹ میں مبتلا کردیں مگر کیا کیا جائے کہ اس کے بغیر بات کو سمجھانا اور سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے۔''

''مادام! آپ مطمئن رہیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ میرے وقت کو اپنا ہی وقت سمجھیں اور ہر وہ بات جس کا آپ کی تکلیف سے دور کا ہی تعلق کیوں نہ ہو مجھے تفصیل سے بتائیں تاکہ اُس کی مدد سے مرض کی جڑ تک رسائی ممکن ہو سکے۔''

''بہت بہت شکریہ!'' اُس نے قرمزی لبوں پر بڑی دلنواز مسکراہٹ رقصاں ہوا ُٹھی جس سے خائف ہو کر اس کے چہرے پر چھائی اُداسی نے کوئی اور ہی ٹھکانہ ڈھونڈ لیا۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ نے مشرقی ٹیکساس کے آدم نامی خاندان کے بارے میں تو سنا ہی ہوگا۔؟''

''سنا تو ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر وہاں پر دوسرے خاندانوں کے لوگ بھی تو آباد ہیں۔''

''بات وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔'' لڑکی کا ہاتھ ہوا میں لہرا اُٹھا اور اُس نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ آج سے تقریباً پچاس سال پہلے کی بات ہے جب زمین جائداد کے کسی سنگین مسئلے کو لے کر آدم خاندان اور ریڈمنڈ خاندان کے مابین گھمسان کی جنگ چھڑ گئی۔ جس میں اعلیٰ انسانی قدروں کو پامال کرتے ہوئے وحشت و بربریت کا کھل کر مظاہرہ کیا گیا اور دونوں طرف کے افراد نے خون کے دریا بہا دیئے۔ ہر طرف خون میں تربتر انسانی لاشیں ہی لاشیں بکھیر دیں جس سے کینٹکی اور مغربی ورجینیا کے زمینداروں کے درمیان چھڑی تاریخی جنگ کے ہولناک وہیبت ناک مناظر پھر سے نگاہوں میں گردش کرنے لگے تھے۔ دونوں خاندانوں کے درمیان بعد میں بھی یہ سرد جنگ رہ رہ کر انگاروں کی طرح دہکتی ہی رہی۔ آدم والوں کو جب بھی کوئی ریڈمنڈ اپنے مکان کے صحن میں نظر آجاتا تو وہ باڑھ کے پیچھے سے تاک کر اسے گولی کا نشانہ بنا دیتے۔ اسی طرح ریڈمنڈ بھی، آدموں کو ڈھونڈ کر موت کے گھاٹ اتارتے رہتے تھے۔ خون کی ندیاں بہانے اور لاتعداد انسانوں کی جان لینے کے باوجود بھی ان کی دشمنی کا یہ جنم جس کے بنیادگزار بھی وہی تھے ابھی تک سرد نہیں ہوا تھا۔ وہ کنوؤں میں زہر گھولتے رہے ایک دوسرے کے مویشیوں اور پالتو جانوروں کو ہلاک کرتے رہے۔ وہ ایک دوسرے کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ مرنے والے مرتے مرتے بھی اپنے بچوں کے دلوں میں نفرت اور دشمنی کا زہر گھول کر انتقام کی اس سوغات کو نسل بہ نسل اور سینہ بہ سینہ منتقل کرنے کی کوشش میں کوئی کسر بقایا نہیں چھوڑی گئی۔ غرض کہ بغض و نفرت اور دشمنی وانتقام کی اس وحشیانہ اور تیس سالہ جنگ میں مسلسل مہلک رائفلوں اور جان لیوا ریوالوروں کے بے دریغ استعمال سے دونوں خاندانوں کی آبادی بتدریج کم سے کم ہوتی چلی گئی اور آج سے بیس سال پہلے وہ وقت بھی آگیا جب ان دونوں خاندانوں کے ایک ایک ہی وارث ہی زندہ بچ پائے۔ آدم خاندان کا جو وارث حیات رہا اس کا نام تھا لیموڈ آدم اور ریڈمنڈ خاندان سے جو لڑکی بچی اُس کا نام تھا لوئیسا ریڈمنڈ۔ وہ دونوں ہی جوان اور خوبصورت تھے وہ محبت کو نفرت پر ترجیح دے کر ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرنے لگے اور پھر شادی کے بندھن میں بندھ کر انہوں نے برسہا برس سے سینہ بہ سینہ چلی آئی،

نسلی اور خاندانی دشمنی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ یہاں میرے لئے یہ بات بتانا بھی بہت ضروری ہے کہ میں نے جن لیمیوڈ آدم اور لوئیسا ریڈمنڈ کا ذکر کیا ہے وہ میرے ماں باپ ہیں اور میں اُن ہی کی بیٹی ہوں۔ میرے والدین نے بھلے ہی پرانی دشمنی کا خاتمہ کر دیا ہے مگر چونکہ میرے جسم کی شریانوں میں بیگ وقت آدم اور ریڈمنڈ کا لہو گردش کر رہا ہے اس لئے اب ان دونوں نے میرے جسم کو اور مجھے ہی اپنی پرانی دشمنی اور جنگ کا میدان بنا لیا ہے۔ اس کے نتیجے میں میری زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے کہ میرے اندر لڑتے وہ لوگ ہیں اور بھگتنا پڑتا ہے مجھے۔ آدم اور ریڈمنڈ کی باہمی نفرتیں میرے والدین سے ملے دو طرح کے خون کو میرے اندر ایک نہیں ہونے دیتی ہیں جب میں نونہال تھی ویسی ہی تھی جیسے کہ عموماً بچے ہوتے ہیں۔ میرے چہرے میں اور مجھ میں بلا کی دلکشی تھی جو سبھی کا دل موہ لیتی تھی۔ لیکن بڑی ہونے پر مجھے بڑی عجیب و غریب کیفیات سے دوچار ہونا پڑا جس کا سلسلہ آج بھی قائم ہے اور میں آج بھی بڑے مشکل دور سے گزر رہی ہوں۔ کیا جاننا چاہینگے اس کی وجہ کیا ہے۔؟ وجہ ہے مرحوم حریفوں کی باہمی اور پرانی نفرت۔''

''سمجھ رہا ہوں...... میں نے کہا۔ ''میں آپ کی ہر بات کو بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔''

اُس نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی ویسے ویسے ہی متضاد کیفیتوں نے مجھے اپنے شکنجے میں جکڑنا شروع کر دیا۔ میں جب بھی کچھ سوچتی فوراً ہی کوئی متضاد خیال میرے پہلے خیال پر قابض ہو کر مجھے مغلوب کر لیتا۔ میں جب بھی کوئی حرکت کرتی ایک دوسرے انداز کی حرکت میری پہلی حرکت کو کچل کر اسے مفلوج کر کے رکھ دیتی۔ اس کے ذمے دار بھی آدم اور ریڈمنڈ ہیں۔ میرے جسم میں ان دونوں کا متخالف لہو رواں ہے یہ اُسی کی کرشمہ سازی کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کی عصبیت و مخاصمت سے میرا جسمانی وجود دو حصوں میں منقسم ہو کر رہ گیا ہے۔ اگر میرے جسم کے ایک حصے پر آدم کا قبضہ ہے تو دوسرے حصے پر ریڈمنڈ حکمرانی کر رہا ہے۔ جب میں کسی منظر کو دیکھنا چاہوں تو میری دوسری آنکھ مجھے کچھ اور ہی منظر دکھانا شروع کر دیتی ہے۔ اسی طرح جب میں آلو کی چاٹ پر چھڑکنے کے لئے نمک کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہوں تو میرا ہاتھ بہک کر بجائے نمکدان کے شگر پوٹ کو تھام لیتا ہے اور پیانو پر تو اکثر ہی یہ ہوتا ہے کہ بجانا تو چاہتی ہوں تیھووین کی من چاہی دھن مگر انگلیوں کی ہیرا پھیری سے سُر بدل جاتے ہیں اور دھن سنائی دینے لگتی ہے'' اور دی گارڈن وال'' (Over tha Garden wall) کی یا پھر ''اسکڈمور گارڈ'' (Skidmore Guard) کی اسی طرح جب میں کیفے میں وینیلا آئس کریم کا آرڈر دینا چاہوں تو خودکار طور پر منہ سے نکل جاتا ہے ''لیموں کی شکنجی'' میں جانتی ہوں ایسا میں خود نہیں کرتی ہوں اور میرے باطن میں جو آدم اور ریڈمنڈ گھسے بیٹھے ہیں وہی مجھے اپنا آلہ کار بنا کر اپنی ازلی مخاصمت نبھائے جا رہے ہیں۔ ان کے اڑیل خون باہمی مصالحت کے لئے راضی ہونا جانتے ہی نہیں ہیں۔ یہ ان ہی کی دخل اندازی کا نتیجہ ہے کہ میں شب خوابی کا لباس پہننے کی شدید خواہش کے باوجود بھی ایسا نہیں کر پاتی اور تن کا بہترین لباس پہنے ہوئے ہی بغیر جوتے اُتارے محو خواب ہو جاتی ہوں۔ اب آپ ہی بتایئے ڈاکٹر صاحب! کہنا کبھی میرے جیسا پیچیدہ کیس آیا ہے آپ کے پاس؟'' ''نہیں کبھی نہیں...... یہ تو واقعی بڑا غیر معمولی اور ورطہ حیرت میں ڈال دینے والا معاملہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر یہ تو بتایئے

کیا آپ نے ان عجیب وغریب کیفیتوں کو دور کرنے کے لئے خود بھی کوئی کوشش کی ہے یا نہیں؟ اور اگر کوشش کی ہے تو اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوا۔؟

''ہاں اپنی قوت ارادی سے کام لے کر میں نے جو ریاضت و مشقت کی ہے اس سے مجھے کافی فائدہ پہنچا ہے اپنی لگاتار کوشش اور مشق سے اب تک کی بتائی ہوئی اپنی سبھی پریشانیوں پر میں نے پوری طرح قابو پالیا ہے۔ البتہ ایک پریشانی ہے جو قابو میں نہ آسکی اور جو آج بھی میری زندگی اجیرن بنائے ہوئے ہے وہ پریشانی یہ ہے کہ میرے جسمانی اعضاء آپس میں موافقت ومطابقت نہیں رکھتے۔ مثال کے طور پر جب میں چلنے کی کوشش کرتی ہوں تو میرا پہلا قدم تو ضرور آگے بڑھ جاتا ہے مگر دوسرا قدم میرے پہلے قدم کی مخالفت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک دوسرا ہی رُخ اختیار کر لیتا ہے۔ لگتا ہے میرا ایک قدم آدم کے قبضے میں اور دوسرے قدم پر ریڈ منڈ نے قبضہ جما رکھا ہے اور قدم ہی کیا میری تو دونوں ٹانگیں ہی جیسے ان کی مرضی کی محتاج ہیں۔ وہ میرا نہیں اُنہیں کا کہا مانتی ہیں۔ البتہ جب میں سائیکل چلاتی ہوں اور اس وقت یہ دونوں حریف اپنا مخالفانہ رویہ ترک کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے مجھے سائیکل چلانے میں کوئی وقت پیش نہیں آتی ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے یہ انہیں میرا سائیکل چلانا اچھا لگتا ہے اور یہ مجھے پریشان کرنا نہیں چاہتے۔ یہ اپنی طرف سے مجھے سائیکل چلانے میں بھی پریشان کرنے کی برابر کوشش کرتے ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ سائیکل کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ ان کی دال گلنے نہیں دیتی۔ جب پیڈل دباؤ پڑنے پر نیچے جاتا ہے تو یہ دوسرے پیڈل کو مخالفت میں اوپر تو کر سکتے ہیں مگر سائیکل کو نہ تو آگے بڑھنے سے روک سکتے ہیں اور نہ ہی اسے گرا سکتے ہیں۔ ان کی اسی بے بسی کی وجہ سے مجھے سائیکل چلانے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی ہے۔ مگر جب میں پیدل چلتی ہوں تو ٹانگوں کی مخالفانہ حرکت سے میرے لئے سیدھا چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ تو خود بھی دیکھ چکے ہیں کہ کلینک میں آتے وقت میں کس قدر لڑکھڑا رہی تھی۔ میری اس پریشانی کو اگر آپ دور کر سکتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب! پلیز میرے لئے کچھ کیجئے۔''

''واقعی آپ کا کیس بڑا عجیب وغریب ہے۔'' میں نے کہا۔ اس معاملے میں غور وفکر کے لئے مجھے تھوڑا وقت درکار ہوگا۔ آپ کل دس بجے کلینک میں تشریف لے آیئے گا۔ میں کل ہی کوئی نسخہ تجویز کرونگا۔''

''تھینک یو'' کہہ کر وہ کھڑی ہوگی۔ میں بازو کے سہارے زینے سے اُتار کر اُسے نیچے لے گیا اور اُسے اس کا گاڑی میں سوار کرا دیا۔

اس رات اس کیس پر میں نے بڑے انہماک سے غور وخوض کیا اور رگ پٹھوں سے متعلق ساری لوکوموٹر ایٹکسیا (Locomotor Atexia) کھنگال ڈالی اور رگوں پٹھوں کی ساری بیماریوں کی علامات کا مطالعہ کر لیا مگر کوئی ایسی بات سجھائی نہ دی جو لڑکی کو اچھا کرنے میں مدد دے سکے میں نے مایوسی کے عالم میں جھلا کر کتابیں واپس الماری میں رکھ دیں۔ ناکام نوعیت کے اس مطالعے میں نصف سے زیادہ رات بیت چکی تھی۔ مطالعے سے بوجھل دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا اور آنکھوں سے نیند بھی اُچاٹ ہوگئی تھی۔ اس لئے تازہ ہوا اور کھلی فضا سے لطف اندوز ہونے کے لئے گھر سے باہر نکل کر ویران سنسان گلیوں میں آوارہ گردی کرنے لگا کہ ایکا ایکی میری نگاہ ایک مقفل اسٹور کے سائن بورڈ پر مرکوز ہوگئی۔ یہ

اسٹور میرے ایک واقف کار بوڑھے جرمن کا تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ ایک بار جب میں اُس سے ملنے اس کے گھر گیا تو وہاں مکان کے صحن میں مجھے دو پالتو ہرن دکھائی دیے جو بڑے دوستانہ انداز میں آپس میں اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ ان میں دلچسپی لیتے دیکھ کر مجھے بوڑھے جرمن نے بتایا کہ وہ پہلے ایسے نہیں تھے۔ اُن میں ازلی دشمنی تھی۔ وہ ہر دم آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے تھے پھر میں نے یہ کیا کہ ان کے رہن سہن کا انتظام دو الگ الگ ٹھاٹھروں میں کر دیا۔ پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد جب میں نے انہیں یکجا کیا تو وہ اپنی پرانی دشمنی بھول کر آپس میں دوست بن چکے تھے۔ بوڑھے جرمن کی کہی یہ بات یکا یک یاد آ جانے پر میرے آگے بڑھتے قدم یکلخت ہی رک گئے اور ایک نیا خیال میرے دماغ میں بجلی کی طرح کوند گیا۔

دوسرے دن جب ٹھیک دس بجے وہ حسین و جمیل دوشیزہ میرے کلینک میں داخل ہوئی تو اس کا نسخہ میرے پاس پہلے سے ہی تیار رکھا تھا۔

جیسے ہی وہ کرسی پر تشریف فرما ہوئی کچھ کہے سنے بغیر ہی نسخہ میں نے اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

نسخہ پڑھ کر لڑکی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمایاں ہوا اُٹھے اُس نے بڑی پُر احتجاج قسم کی بے اعتمادی کے ساتھ کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! کیا یہ نسخہ کام کریگا؟ کہیں آپ میرا مذاق اُڑا رہے ہیں۔؟''

''مادام! اس پر عمل کیجئے عمل۔'' میں نے بڑی پُر اعتماد سنجیدگی سے اپنی بات پر زور دیا۔ لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔

اور یہ کل کی ہی بات ہے وہ مجھے بازار میں نظر آ گئی اور یہ دیکھ کر میری حیرت اور خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا کہ وہ بڑی سدھی ہوئی باوقار چال چل رہی تھی۔''

''ارے واہ! ایسا کونسا جادوئی منتر لکھ کر دے دیا آپ نے اُسے۔'' رپورٹر نے بڑے پُر اشتیاق لہجے میں استفسار کیا۔ ''آخر کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو۔''

''بڑا حقیر سا نسخہ تھا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ میں نے اسے اُوپری ٹانگوں میں اور اسکرٹ کے نیچے موزے نما ٹو پیس بلومرس (Two piece Bloomers) پہننے کا مشورہ دیا تھا جس پر وہ عمل پیرا ہوئی اور اُس کی ساری پریشانی دور ہو گئی۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔؟'' رپورٹر نے کہا۔ ''کچھ کھل کر بتایئے۔''

''بتانا کیا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''لڑکی کی روئداد سن کر اتنا تو میں سمجھ ہی گیا تھا کہ لڑکی کی ددھیال اور ننھیال یعنی آدم اور ریڈمنڈ کی متخالف قوتوں کا باہم تصادم ہی لڑکی کی ٹانگوں پر اثر انداز ہوتا ہے جس سے اُس کی چال بگڑ کر مسئلہ کھڑا کر دیتی ہے۔ اب میرے سامنے یہ سوال آ کھڑا ہوا تھا کہ ان دو حریفانہ قوتوں کو باہم ٹکرانے سے روکا جائے تو کیسے روکا جائے کہ دفعتاً مجھے خیال آ گیا کہ جس طرح دو ہرنوں کو باہم جدا کر دینے سے ان کا آپس میں ٹکرانا بند ہو گیا تھا اسی طرح کا فارمولہ لڑکی پر بھی تو آزمایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا میرے مشورے پر جب لڑکی نے اپنی ٹانگوں پر ٹو پیس بلومرس (Two Piece Bloomers) پہن لئے تو آدم اور ریڈمنڈ آپس میں جدا ہو کر اور اپنی اپنی حدود میں سمٹ کر بے اثر ہو گئے اور جب انہوں نے متصادم ہونا ترک کر دیا تو ان کے اثر سے آزاد ہو جانے پر لڑکی کی چال خود بخود بحال ہو گئی اور وہ بھی

دوسری جوان لڑکیوں کی طرح بڑی پرکشش چال چلنے لگی اور ہاں یہ بات تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گیا کہ اس وقت شام کے ساڑھے سات بجنے والے ہیں اور آٹھ بجے یہ لڑکی مجھ سے ملنے گھر آنے والی ہے۔ ہمارے درمیان راز و نیاز کی باتیں رنگ لا چکی ہیں۔ وہ مجھ سے شادی کی حامی بھی بھر چکی ہے۔ جلدی ہم دونوں ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائینگے۔ لہٰذا آپ سے میری گذارش یہ ہے کہ آپ بھول کر بھی میری بتائی ان باتوں کا ذکر اس سے نہ کر بیٹھنا۔''

''نہیں بتاؤ نگا۔'' رپورٹر نے یقین دلایا۔ ''کبھی نہیں بتاؤ نگا..... تو کیا اس خوشی میں شکنجی کا ایک گلاس پلوائینگے۔؟''

''نہیں..... بالکل بھی نہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''دو گلاس تو تم پہلے ہی ڈکار چکے ہو۔ اب اور نہیں..... ویسے بھی آنے والے کی آمد کا وقت نزدیک ہے..... مجھے گھر جانا ہوگا۔''

اتنا کہہ کر ڈاکٹر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھی بات ہے..... چلتے ہیں۔'' اُس نے رپورٹر سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر ملینگے..... شام بخیر۔''

..................☆☆☆..................

☆......او ہینری
☆......رفیق شاہین

ماورا

آسٹن کے شمالی علاقے میں اسمدرس نام کا ایک معزز خاندان آباد تھا۔ اس خاندان میں کل تین افراد تھے، جان اسمدرس اُس کی بیوی اور ایک بیٹی جو پانچ سال کی تھی۔

ایک رات کھانا کھانے کے بعد بچی کے پیٹ میں اینٹھن اور مروڑ کے ساتھ شدید درد اُٹھا اور وہ تڑپنے لگی۔ یہ دیکھ اس کا باپ اسمدرس عطار سے دوا لینے کیلئے فوراً ہی گھر سے نکل پڑا۔

وہ پھر کبھی گھر لوٹ کر ہی نہیں آیا۔

بچی درد سے تڑپتی رہی۔ پھر خود ہی درد میں کمی ہوتی گئی اور وہ مکمل طور پر شفایاب ہوگئی۔

پھر وہ مسلسل گزرتے وقت کے ساتھ عنفوان شباب کو پہنچ کر بچی سے ایک جوان العمر لڑکی میں تبدیل ہوگئی۔

اُس کی ماں اپنے شوہر کی گمشدگی پر بہت روئی دھوئی، بہت مغموم وملول رہی اور بالآخر مایوس ہوکر اب سے تین ماہ پہلے اُس نے دوسری شادی کرلی اور "شان اینٹونیو" منتقل ہوکر اپنے شوہر کے ساتھ رہنے سہنے لگی۔

ادھر وہ چھوٹی بچی جو جوان ہوچکی تھی اس نے بھی شادی کرلی تھی اور اب اپنے باپ کے اُسی گھر میں اس کی بھی ایک پانچ سالہ بچی تھی۔

آج کا دن گمشدہ جان اسمدرس کی سالانہ برسی کا دن تھا کہ اتفاقاً پہلے جیسا واقعہ پھر سے ظہور میں آگیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد بچی کے پیٹ میں ایکا ایکی اینٹھن اور مروڑ کے ساتھ شدید درد اُٹھا اور وہ ناقابل برداشت تکلیف کے عالم میں بُری طرح تڑپنے لگی۔ اس پر جان اسمتھ نے اپنی بیوی سے کہا۔

"تم بچی کو دیکھو میں ابھی بازار سے دوا لے کر آتا ہوں۔" (اُس کے شوہر کا نام جان اسمتھ ہی تھا)

"نہیں جان نہیں۔" اس کی بیوی نے روتے سسکتے ہوئے کہا۔

"میں ہرگز ہرگز بھی تمہیں دوا لینے نہیں جانے دونگی ورنہ تم بھی میرے باپ کی طرح گھر کا پتہ بھول کر کہیں گُم ہوجاؤ گے اور پھر کبھی گھر لوٹ کر نہیں آؤ گے۔ میرے باپ کیساتھ بھی تو یہی ہوا تھا۔ تم یہیں رُک کر بچی کے لئے دعا کرو۔"

پھر جان اسمتھ نے دوا لانے کے لئے ضد نہیں کی۔ دونوں میاں بیوی بچی پر جھکے اس کی پیشانی سہلاتے رہے۔ مگر اس سے کچھ نہ ہوا اور بجائے افاقے کے بچی کی حالت بد سے بدتر ہونے لگی۔ اس پر جان اسمتھ نے اصرار کیا کہ اسے دوا لانے کی اجازت دی جائے۔ پنیسی کی حالات ٹھیک نہیں ہے۔ (بچی کا نام پنیسی ہی تھا)

مگر وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ اُس نے کہا۔

''خواہ کچھ بھی ہو میں اسے خدا کی مرضی تسلیم کرلونگی مگر بازار بھیج کر تمہیں ہمیشہ کے لئے گنوادینے کا خطرہ کبھی مول نہیں لونگی۔''

یہ بحث ابھی کسی نتیجے پر پہنچی بھی نہ تھی کہ ایکاایکی دھاڑ سے دروازہ کھلا اور ایک سفید بالوں والے گیسودراز بزرگ نمودار ہوئے۔ اُن کی کمر اور شانے قدرے جھکے ہوئے تھے۔ وہ بلا تکلف اندر کمرے میں چلے گئے۔ ان پر نظر پڑتے ہی پینسی رونا اور تڑپنا بھول کر زور سے چلائی۔

''ممی! نانا آگئے......نانا آگئے ہیں ممی!۔''

مقام حیرت ہے کہ اس نے پہلی ہی نظر میں نہ جانے کیسے اپنے نانا کو پہچان لیا تھا جب کہ اس نے کبھی انہیں دیکھا تک نہ تھا۔

قبل اس کے کہ وہ اسے بچی کی نادانی پر محمول کرے اس نے دیکھا کہ بزرگ نے کچھ کہے سنے بغیر اپنی جیب سے دوا کی شیشی نکال کر فوراً ہی دوا کی ایک خوراک پینسی کو پلادی اور دوا حلق سے نیچے اُترتے ہی وہ ایک دم بھلی چنگی ہوگئی۔

جان اسمدرس نے معذرت خواہ ہوتے ہوئے کہا۔''معاف کیجئے گا سواری گاڑی دیر سے ملنے کی وجہ سے واپسی میں تھوڑی تاخیر ہوگئی ہے۔''

..................☆☆☆..................

☆......الیکساندر پشکن

☆......رفیق شاہین

بعد از طوفان

مجھے فخر ہے کہ میں بیس برس کے عرصے میں تمام رُوسی راستوں پر سفر کر چکا ہوں اور سارے راستے میرے جانے پہچانے ہیں۔ راستوں میں پڑنے والے POST STATION یعنی گھوڑے مہیا کرنے والی سرایوں کے POST MASTERS یعنی منتظمین سے میری دوستی رہی ہے۔ ایک خاص عرصۂ وقت میں اُن میں سے ایک کے ساتھ میری خاصی دوستی ہوگئی تھی جسکی خوشگوار و ناخوشگوار یادیں میں آج تک فراموش نہیں کر سکا ہوں۔ اب انہیں منتشر یادوں خزانے کو سمیٹ کر اور ترتیب دیکر میں اپنے قارئین کو ایک بڑی موثر کہانی سنانے جا رہا ہوں۔

یہ ماہ مئی ۱۸۱۶ء کا ذکر ہے۔ مجھے ایکس صوبے پہنچنا تھا اس سفر کے لئے میں نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ اب مسدود ہو چکا ہے۔ بحثیت سرکاری افسر و دئم میرا کام ہی سفر پر رہنا تھا۔ مسافت طے کرنے کے لئے گاڑیاں اور گھوڑے ہی میرا خاص وسیلہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے گھوڑے مہیا کرنے میں پوسٹ ماسٹر لوگ ذرا بھی سستی یا آنا کانی سے کام نہیں لیتے تھے۔ ان سے گھوڑا حاصل کرنے کا میں ہر طرح حقدار تھا۔

آج گرمی کچھ زیادہ ہی تھی۔ ایکس پوسٹ ماسٹر آنے میں ابھی تین کوس کا فاصلہ باقی تھا کہ بادلوں سے پھوار برسنی شروع ہوگئی جس نے اگلے ہی منٹ موسلا دھار بارش کی شکل اختیار کر لی تھی۔ سارا لباس پانی میں شرابور ہو کر بدن سے چپک گیا تھا۔ اب وہاں پہنچنے پر میری پہلی ضرورت تھی لباس تبدیل کرنا اور دوسری ضرورت تھی گرما گرم چائے۔

''ہے دونیا!۔'' پوسٹ ماسٹر چلایا۔ ''چائے کا سماوار تیار کرو اور ہاں تھوڑا مکھن بھی لیتی آنا۔''

اس آواز کے ساتھ ہی کمرے کو منقسم کرنے والے پردے کے پیچھے سے ایک چودہ سالہ نازک اندام او رخوبصورت سی لڑکی نمودار ہو کر تیزی سے پورچ کی طرف دوڑتی نظر آئی۔ اُس کے حسن و جمال کی کشش سے میں مرعوب سا ہو گیا۔

''کیا یہ لڑکی آپ ہی کی بیٹی ہے؟۔'' میں نے پوسٹ ماسٹر سے دریافت کیا۔

''ہاں میری ہی بیٹی ہے۔'' پوسٹ ماسٹر نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''بڑی ہوشیار اور پھرتیلی ہے۔ ہو بہو اپنی ماں پر گئی ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ میرے بتائے کام میں مشغول ہو گیا۔ ااس دوران میں اس کے صاف ستھرے کمرے کی دیواروں پر آویزاں تصاویر کا جائزہ لینے لگا۔ ان تصاویر سے ایک فضول خرچ بیٹے کا دردناک انجام مترشح ہو رہا تھا۔ پہلی تصویر میں ایک باپ جو ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس تھا اور سر پر نائٹ کیپ پہنے ہوئے تھا اپنے بیٹے کو دولت سے بھرا تھیلا او

دعائیں دیتا نظر آرہا تھا۔

دوسری تصویر میں اُسی آوارہ واوباش نوجوان کو پیش کیا گیا تھا جو اپنے عیاش دوستوں اور عصمت فروش بدچلن عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھا شغل مے نوشی کر رہا تھا۔ اس سے اگلی تیسری تصویر بھی اسی نوجوان کی تھی جس میں اس کا کچھ اور ہی نقشہ پیش کیا گیا تھا۔ اس نوجوان کا لباس دھجیاں دھجیاں تھا اور وہ سوروں کے باڑے کی رکھوالی کرتے ہوئے انہیں خنزیروں کی گلی سڑی غذا سے اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کر رہا تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے برے اعمال و عادات کی وجہ سے اپنے باپ کی عطا کردہ دولت عیاشی میں پڑ کر گنوادی تھی اور نتیجتاً وہ اپنے کیفرکردار کو پہنچ ہی گیا تھا۔ ایک چوتھی تصویر اور بھی تھی جس میں ڈریسنگ گاؤں اور نائٹ کیپ والا وہی بزرگ باپ کرسی پر بیٹھا تھا مگر وہ اب ہر طرح سے تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ تصاویر کے مفاہیم کو واضح کرنے کے لئے جرمن زبان میں ہر تصویر کے نیچے دو منظوم مصرعے بھی درج کئے گئے تھے۔ وہ تصویریں وہ اشعار، وہ کمرہ، کمرے کے درمیان کھنچا پردہ، وہ بستر، وہ چائے، وہ کھانے کے برتن اور آس پاس کا سارا ماحول مجھے آج بھی اس طرح یاد ہے جیسے یہ کل کی ہی بات ہو۔ اس سرائے کا سربراہ جس کی عمر پچاس برس سے زائد نہ تھی اور جس کے لمبے سبز فراک کوٹ پر رنگ اُڑے فیتوں می تمغے لٹکے رہتے تھے۔ وہ اپنی تمام تر زندہ دلی اور خوش مزاجی کے ساتھ میری نگاہوں میں گردش کرتا رہتا ہے۔

ابھی پچھلے پوسٹ ماسٹر اسٹیشن سے ساتھ آئے کوچوان کو محنتانہ دے کر میں نے رخصت کیا ہی تھا کہ دودونیا سماوار لے کر آگئی۔ اس کم سن اور شوخ و شنگ نازنین نے میرے دل پر اپنی گہری چھاپ چھوڑ دی تھی اور اب وہ اپنی حیا بار پلکیں جھکائے میرے سامنے بیٹھی تھی۔ بات چیت کا آغاز میں نے ہی کیا تھا۔ وہ میری ہر بات کا جواب بغیر گھبرائے اور شرمائے مسکرا مسکرا کر دے رہی تھی۔ میں نے اس کے باپ کو سرکے کی شراب کا گلاس پیش کیا اور چائے کی پیالی دونیا کے ہاتھ میں تھما دی۔ پھر ہم تینوں ہی بے تکلفانہ گفتگو میں کچھ اس طرح گم ہو کر رہ گئے جیسے کہ ہم اجنبی نہ ہوں بلکہ ایک زمانے سے ایک دوسرے سے واقف رہے ہوں۔

گاڑی میں جتے گھوڑے میرے انتظار میں تیار کھڑے تھے۔ ان سے بچھڑنے کا خیال میرے لئے بہت پریشان کن اور اذیت رساں تھا۔ مگر مجبوری تھی لہٰذا مجھے ان سے رخصتی کی اجازت طلب کرنی ہی پڑی پوسٹ ماسٹر نے مجھے دعاؤں سے نوازا اور دونیا مجھے گاڑی تک پہنچانے کے لئے میرے ساتھ ہولی۔ پورچ میں آ کر میں نے اپنے قدم روک لئے اور اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''دونیا! کیا میں تمہیں بوسہ دے سکتا ہوں؟''

اس نے شرما اور مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے یہ کار خیر انجام دینے میں ذرا بھی تاخیر سے کام نہیں لیا۔ (تصور میں اب تک میں اسے لاکھوں بار چوم چکا ہوں) مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ اگر چہ عالم تصور میں اسے میں نے لاتعداد بار چوما ہے لیکن کیف و سرور اور مستی و سرشاری کا جو تجربہ مجھے اس وقت حاصل ہوا تھا وہ تصور میں حاصل نہ ہو سکا۔

پھر کتنے ہی سال کا عرصہ گزر گیا۔ اب موافق حالات نے پھر اپنا کرشمہ دکھایا اور مجھے اسی

راستے سے گزار کر پھر اُسی مقام پر پہنچا دیا۔ میں پوسٹ ماسٹر کی بیٹی دونیا کو بھولا نہیں تھا۔ میرے دل میں رہ رہ کر خوشی کنول سے کھل رہے تھے کہ پھر دونیا سے ملاقات ہوگی، باتیں ہونگی مگر کچھ خدشات بھی سر اٹھا رہے تھے کہ کہیں پوسٹ ماسٹر ملازمت سے سبکدوش نہ ہوگیا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اب اس دنیا میں موجود ہی نہ ہو۔ کیا پتہ شادی کر کے دونیا اپنی سسرال ہی چلی گئی ہو۔ سارے راستے اسی طرح کے وسوسے میرے دل پر کچوکے لگاتے رہے تھے۔

بالآخر صوبہ ایکس کے اُسی ویران وسنسان سے پوسٹ اسٹیشن پر میں دوبارہ پہنچ ہی گیا۔

میرے گھوڑے سڑک کے ایک جانب درختوں کے جھرمٹ کے قریب وقوع پذیر اسی پوسٹ اسٹیشن کی عمارت کے سامنے جا کر رکے۔

وہاں کمرے میں پہنچتے ہی میں نے دیواروں پر آویزاں ان تصویروں کو فوراً ہی پہچان لیا جو ایک بگڑے ہوئے نوجوان کی بربادی کی داستان بیان کرتی رہتی ہیں۔ وہاں فرنیچر اور بستر وغیرہ بھی اپنی جگہ لگے ہوئے تھے۔ البتہ کھڑکی کے پائدان پر پھولوں کے گلدان غائب تھے۔ علاوہ ازیں کمرے کی بے ترتیب اشیا پر دھول جمی ہونے کی وجہ سے مکان بدلا بدلا سا نظر آرہا تھا۔ ہر شئے جیسے زوال آمدہ ہو چکی تھی۔ پوسٹ ماسٹر جو بھیڑ کی کھال کا بنا کوٹ اپنے اوپر ڈالے سویا ہوا تھا میری آمد پر اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ تھا تو وہ سیمسن وائرن ہی لیکن اُسے پہچاننا بھی مشکل لگ رہا تھا کیونکہ اب اُس پر ضعیفی طاری ہو چکی تھی۔ جب وہ میرے لئے انتظامات میں مصروف تھا میں نے دیکھا کہ اُس کے سر کے بال بھی سفید ہو چکے تھے اور اس کے شیو سے عاری چہرے پر جھریاں قابض ہو چکی تھیں۔ اُس کے شانے بھی جھکے ہوئے تھے۔ اُس کو اس بدلی ہوئی حالت میں دیکھ کر میں ششدرہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ محض تین سالہ قلیل مدت میں ایک تندرست وتوانا شخص اس قدر لاغر اور نحیف ونزار کیسے ہوگیا؟

"لگتا ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم لوگ آپس میں دوست رہ چکے ہیں۔"

"ہوسکتا ہے۔" اس نے بڑی لاتعلقی اور سرد مہری برتتے ہوئے کہا۔

"یہ راستہ بڑا پر ہجوم ہوگیا ہے اور اب تو یہاں ہر وقت مسافروں کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔"

"دونیا کہاں ہے؟ کیسی ہے وہ؟ میں نے پوچھ ہی لیا۔ بوڑھے کے چہرے پر ناگوار قسم کے تاثرات اُبھر آئے۔ اس نے مجھے سے لہجے میں کہا۔

"دونیا کہاں ہے اور کیسی ہے یہ بات تو خدا ہی بہتر جانتا ہوگا۔"

"کیا اُس کی شادی ہوگئی ہے۔؟

"اس نے میرے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور کہا۔

"چھوڑیے اس بات کو۔ بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

فی الوقت اس موضوع کو التوا میں ڈال کر میں نے فرمائش کی کہ چائے کی کیتلی چولہے پر رکھ دے۔ مارے تجسس اور وسوسوں کی بہتات کے میرا سر درد سے بری طرح پھٹا جا رہا تھا۔ رہ رہ کر دل میں کانٹے سے چبھ رہے تھے مگر میں ناامید نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پنچ کا نشہ ہی وہ کامیاب وسیلہ ہے جس سے اُسے منہ کھولنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال صحیح نکلا اُس نے پنچ کے گلاس کو شکرانے کے ساتھ

بخوشی قبول کرلیا۔ میں نے دیکھا کہ پنچ کے چند گھونٹ حلق کے نیچے اُترتے ہی اس کے چہرے سے اُداسی کا غبار چھٹ گیا تھا اور پھر جب میں نے دوسرا گلاس بھی اس کے ہاتھ میں تھما دیا تو اس کے منہ میں زبان بھی، خود بخود متحرک ہو اُٹھی اور اُس نے مجھے پہچاننے کے بعد جو داستان مجھے سنائی وہ اس قدر افسوسناک اور متحیر و متعجب کردینے والی تھی کہ میں سکتے کے سے عالم میں انتہائی خاموشی کے ساتھ سے اول تا آخر سنتا ہی چلا گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"تو آپ میری دنیا دونیا کو جانتے ہیں...... اُسے کون نہیں جانتا...... آہ دونیا!...... کیا لڑکی تھی وہ بھی...... جو بھی یہاں آتا بس اُسی کے گن گان شروع کردیتا تھا...... کسی نے بھی کبھی اُس کی شکایت نہیں کی تھی...... خواتین اُسے تحائف پیش کیا کرتی تھیں، کبھی رومال...... کبھی انگوٹھی...... اور کبھی کانوں کی بالیاں جو مرد یہاں آتے وہ اُس کے حسن اخلاق کے کچھ ایسے گرویدہ ہوجاتے تھے کہ یہاں مزید رکنے کے بہانے ڈھونڈنے لگتے۔ ان کے فاضل سپر، ڈنر اور ناشتوں کا سلسلہ اس لئے جاری تھا کہ اس بہانے انہیں دونیا سے گفتگو کے مواقع میسر ہوجاتے تھے۔ یہاں آنے والے تحصیلدار جیسے جھگڑالو شخص بھی دونیا کو دیکھتے ہی تہذیب و شائستگی کا پیکر بننے پر مجبور ہوجاتے تھے۔

آپ شاید یقین نہ کریں ڈاک بہم پہنچانے والے سرکاری افسران اور صوبائی پیغام رساں قاصد بھی جب دونیا سے ہمکلام ہوتے تو انہیں تنگی وقت کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ یہ اسٹیشن اُسی کے دم سے چل رہا تھا۔ کمروں کی صفائی، برتنوں کی دھلائی اور خانہ داری کے سارے امور وہی انجام دیا کرتی تھی اور میں بوڑھا احمق تو بس اسی مطلب کا تھا کہ بس اس کا منہ ہی تکتا رہوں۔ میری زندگی کی وہ سب سے بڑی خوشی تھی۔ کیا میں نے اُس کی پرورش نہیں کی تھی؟ کیا میں اُس سے محبت نہیں کرتا تھا؟ کیا وہ یہاں خوش نہیں تھی؟ سبھی کچھ تو تھا مگر اسے کیا کیا جائے کہ جو حادثے ہونا ہوتے ہیں وہ ہوکر ہی رہتے ہیں۔ ہونی کو کون ٹال سکا ہے"۔ اس تمہید کے بعد مجھے اُس نے اپنی بدقسمتی کی مفصل کہانی کہہ سنائی۔ مگر بجائے اس کے کہ میں اس کی کہانی اسی کی زبانی پیش کروں اسے موثر انداز میں بیان کرنے کے لئے خود اپنی ہی زبان میں پیش کرنا پسند کرونگا۔

یہ آج سے تین سال پہلے کا واقعہ ہے۔ موسم سرما کے ایک ٹھٹھرتی شام میں جب کہ پوسٹ ماسٹر بھی کھاتے میں پنسل سے لائین کھینچنے میں مشغول تھا اور دونیا پردے کے پیچھے بیٹھی کپڑے سینے میں مصروف تھی کہ تبھی تین گھوڑوں والی گاڑی تردیکا (TROIKA) پوسٹ اسٹیشن کی عمارت کے سامنے آکر رکی اور اس میں سے ایک مسافر نمودار ہوا جو فوجی وردی زیب تن کئے ہوئے تھا اور اُس نے کا کیشین کیپ پہن رکھی تھی، اس کے گلے میں موٹا سا مفلر بھی لپٹا ہوا تھا۔ اُس نے اندر داخل ہوتے ہی اگلے پوسٹ اسٹیشن تک کے لئے گھوڑے سپلائی کرنے کا تقاضا کردیا۔ گھوڑے اس وقت مختلف سمتوں اور راہوں میں رواں دواں تھے اور ان کا اصطبل ایک دم خالی تھا۔ پوسٹ ماسٹر نے یہی بات اُسے بھی بتادی جسے سُن کر وہ بری طرح مشتعل ہو اٹھا اور اُس نے اپنا چابک بھی تھام لیا۔ بگڑی صورتحال کو سنبھالنے کے لئے دونیا لپک کر وہاں پہنچ گئی اور اُسے نہایت شائستہ لب و لہجے میں کھانا تناول کرنے کا مشورہ دیا۔ دونیا کی کشش انگیز اور دلآویز شخصیت کا اس شخص پر بڑا خوشگوار ردعمل ہوا اور اُس کا سارا غصہ صابن کے جھاگ

کی طرح بیٹھ گیا۔ اُس نے ہلکے پھلکے کھانے سپر کی تیاری کا آرڈر دے دیا۔ اُس نے جانور کی کھال کی بنی گندی بھیگی ٹوپی اُتار دی، مفلر ایک طرف ڈال دیا اور لمبے کوٹ والی وردی سے بھی آزاد ہو گیا۔ وہ گھوڑا سوار فوج کا ایک دبلا پتلا نوجوان تھا جس کی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کا رنگ سیاہ تھا وہ اس نئے ماحول سے جلد ہی مانوس ہو گیا۔ وہ پوسٹ ماسٹر اور اُس کی بیٹی سے خوب گھل مل کر باتیں کرنے لگا تھا۔ کھانا میز پر لگا دیا گیا تھا کہ تبھی گھوڑے آ گئے تھے۔ پوسٹ ماسٹر نے باہر نکل کر کوچوان کو حکم دیا کہ نوجوان کی گاڑی میں گھوڑے جوت کر گاڑی کو تیار کر دیا جائے۔ اس کام سے فارغ ہو کر جب وہ کمرے میں واپس پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ اس نے کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اور وہ نوجوان نیم بے ہوشی کے عالم میں بینچ پر لٹا ہوا تھا۔ اس کے سر میں شدید درد تھا اور اس پر بے ہوشی کی غفلت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ موجودہ صورتحال میں وہ سفر کرنے کے لائق نہ تھا۔ مجبوری تھی۔ پوسٹ ماسٹر نے اُسے اپنے بستر پر لٹا دیا اور اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر مسافر کی حالت کل تک بحال نہ ہوئی تو برائے علاج وہ اُسے صوبہ ''سی'' کے اسپتال میں داخل کرا دے گا۔

اگلے دن فوجی مسافر کی حالت اور بھی بدتر ہو گئی تھی۔ اُس نے پڑوس سے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے اپنے ایک آدمی کو دوڑا دیا تھا۔ دونیا نے رومال سرکے میں بھگو مریض کی پیشانی پر رکھ دیا تھا اور سلائی کے کام میں مشغول تھی۔ اگرچہ مسافر نے دو کپ چائے پی تھی اور کھانا بھی تناول کر لیا تھا مگر پوسٹ ماسٹر کے سامنے تو اس نے زبان ہی نہ کھولی۔ بس آنکھیں موندے دھیرے دھیرے کراہتا ہی رہا۔ دونیا اُس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہی۔ وہ بار بار پینے کو کچھ طلب کرتا اور دونیا ہر بار اُسے لیمن جوس پیش کر دیتی تھی اور وہ برائے اظہار تشکر دونیا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دھیرے دھیرے دباتا جاتا تھا۔ ڈاکٹر وہاں ڈنر کے وقت پہنچا۔ اُس نے مریض کی نبض ٹٹولتے ہوئے اُس سے جرمنی زبان میں بات کی اور پھر روسی زبان میں اعلان کر دیا کہ مریض کو آرام کی سخت ضرورت ہے اور سفر کے لائق صحتمند ہونے میں اُسے دو دن لگ جائیں گے۔ اس گھوڑا سوار مریض نے بطور فیس ڈاکٹر کو پچیس روبل عطا کر دیے اور ساتھ ہی اُسے اپنے ساتھ ڈنر پر مدعو کرنا بھی اپنا اخلاق فرض سمجھا۔ ڈاکٹر نے یہ پیشکش بخوبی قبول کر لی۔ دونوں نے سیر ہو کر کھانا تناول کیا۔ رہا شغل مئے نوشی تو اس میں بھی دونوں نے کوئی کسر بقایا نہ چھوڑی۔ وہ ایک بڑی بوتل خالی کر چکے تھے۔ اب دونوں ہی بڑے زندہ دل اور خوش مزاج نظر آ رہے تھے۔

ایک دن اور یونہی بیت گیا۔ اب فوجی جوان کلی طور پر صحتیاب ہو چکا تھا۔ اس کی پُر مزاح طبیعت اور زندہ دلی اب پوری طرح جولانی پر تھی۔ کبھی وہ بار بار سیٹی بجاتا، کبھی ٹھٹھے لگا کر ہنستا۔ وہ پوسٹ ماسٹر اور دونیا دونوں سے ہی ہنس ہنس کر بڑے جوش و خروش سے باتیں کر رہا تھا۔ غرض کہ اگلے دن رجسٹر میں رخصتی درج کراتے وقت تک وہ پوسٹ ماسٹر کے دل و دماغ پر اس حد تک چھا کر رہ گیا تھا کہ اُس کے جانے کے تصور سے ہی اُس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

آج اتوار تھا۔ دونیا کو عبادت کے لئے چرچ جانا تھا۔ فوجی نوجوان کی گھوڑا گاڑی کسی کسائی روانگی کے انتظار میں تیار کھڑی تھی۔ وہ رہائش اور خوراک کا معقول معاوضہ ادا کر چکا تھا۔ رخصت ہوتے وقت وہ پوسٹ ماسٹر کے آگے تعظیماً جھکا اور اُس نے دونیا کو الوداع بھی کہا پھر کچھ سوچ کر یہ پیشکش بھی

کردی وہ دونیا کو گاڑی سے چرچ پر چھوڑ دیگا۔اُس کی اس بات پر دونیا کشمکش میں مبتلا ہوگئی۔

''چلی جاؤ نا! اس میں پریشانی کیا ہے۔ حضور والا کوئی بھیڑیا تو ہیں نہیں کہ تمہیں کھا جائینگے۔''

باپ نے بیٹی سے کہا۔''وہ تمہیں چرچ چھوڑ دینے کے لئے ہی تو کہہ رہے ہیں''۔

دونیا لپک کر سلیج میں سوار ہوگئی اور فوجی کے پہلو میں بیٹھ گئی ملازم کوچوان نے بھی گاڑی میں اپنی نشست سنبھال لی اور پھر اُس کی سیٹی بجاتے ہی گھوڑے متحرک ہو اُٹھے اور اس کے ساتھ ہی گاڑی نے رفتار پکڑ لی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر بدنصیب پوسٹ ماسٹر کو کیا ہوگیا تھا؟ اس کی عقل گھاس چرنے کہاں چلی گئی تھی؟ وہ ایسا آنکھ کا اندھا اور دماغ سے پیدل کیسے ہوگیا کہ اس نے خود ہی اپنی جوان اور بھولی بھالی بیٹی کو ایک اجنبی وانجان نوجوان کی گاڑی میں سوار ہونے پر مجبور کیا تھا۔

ابھی دونیا کو گھر سے گئے ہوئے نصف گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ پوسٹ ماسٹر کے دل میں کانٹے سے چبھنے لگے اور اس کا جی گھبرانے لگا۔اُسے ایک انجانے سے خوف نے اپنے پنجے میں جکڑ لیا تھا۔اُس کا جی گھبرانے لگا۔اُس کے ذہن پر خلفشار وانتشار اور اضطرار واضطراب کچھ اس درجہ سوار ہوگیا کہ اُسے اپنے اوپر قابو ہی نہیں رہا، اس نے روبنا کی تلاش پیدل ہی شروع کر دی۔

جب وہ وہاں پہنچا تو چرچ سے لوگوں کی واپسی شروع ہوچکی تھی اِس نے دیکھا دونیا نہ تو چرچ کے احاطے میں موجود تھی اور نہ پورچ میں وہ گھبرایا ہوا چرچ کے ہال میں داخل ہوگیا۔

اس وقت تک پادری لوگ شہ نشین چھوڑ کر اپنے ٹھکانوں کی طرف چلے گئے تھے۔ چرچ کے ایک نیم تاریک گوشے میں دو خواتین ابھی تک بائبل پڑھنے میں مصروف تھیں۔ چرچ کا چوکیدار موم بتیاں بجھا رہا تھا۔ان کے علاوہ چرچ میں کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔دونیا کو وہاں نہ پا کر اُس کا چہرا فق پڑ گیا تھا اور اُس کا دل بری طرح بیٹھا جا رہا تھا۔اُس نے چرچ کے چوکیدار اسیکسٹن سے دریافت کیا کہ ''کیا دونیا یہاں آئی تھی؟''

اسے جواب ملا۔ ''نہیں وہ یہاں نہیں آئی تھی۔''

چرچ سے واپسی کے راستے میں پوسٹ ماسٹر تقریباً نیم مردہ ہوچکا تھا۔اب مبہم سی ایک آخری امید بچی تھی کہ جب وہ پوسٹ اسٹیشن میں قدم رکھے تو دونیا اسے اپنی نگاہوں کے سامنے مسکراتی ہوئی نظر آجائے ایک خیال یہ بھی تھا کہ گاؤں کی سرحد پر دونیا کی گاڈمدر رہتی تھیں ناممکن نہ تھا کہ وہ ان سے ملنے وہیں چلی گئی ہو۔ پوسٹ ماسٹر کو اب اپنے ملازم کوچوان کا بڑی شدت اور بے صبری سے انتظار تھا کیونکہ فوجی کو دیے ہوئے گھوڑے اسے اگلے پوسٹ اسٹیشن سے واپس لے کر یہیں آنا تھا۔اسی عالم انتظار میں سارا دن گزر گیا نہ تو دونیا ہی لوٹ کر گھر آئی اور نہ ہی کوچوان کی واپسی ممکن ہو پائی۔اس جانکاہ اور جان لیوا انتظار میں وہ انگاروں پر لوٹتا رہا۔آخر کار کوچوان گھوڑے واپس لے کر آ ہی گیا۔

وہ شراب کے نشے میں جھوم رہا تھا اور لڑکھڑا رہا تھا اور وہ تنہا ہی نظر آرہا تھا۔اُس کے ساتھ دونیا نہیں تھی۔

''دونیا کہاں ہے؟...... دونیا کہاں ہے؟'' اس کے تڑپتے ہوئے ماتمی اور نوحہ خواں سے

سوال کے جواب میں شرابی کوچوان نے بڑی آسانی سے وجواب کا پتھر یہ کہہ کر اس کے سر پر دے مارا کہ۔
"دونیا نہیں ہے.....وہ نہیں آئے گی.....وہ چلی گئی......اُسی فوجی کے ساتھ۔"

کوچوان کے یہ بے رحم جلا دجیسے الفاظ کسی دودھاری کٹار کی طرح اس کے دل میں پیوست ہوکر رہ گئے تھے۔ دردو کرب کی ناقابل برداشت اذیت سے اس نے اپنی آنکھیں موندلیں۔

پوسٹ ماسٹر کی بے وقوفی اس کی بدنصیبی بن کر اب پوری طرح گل کھلا چکی تھی۔ اس کی ٹانگوں کی جان نکل چکی تھی۔ وہ کھڑے سے ہی بستر پ گر کر ڈھیر ہوگیا۔ یہ وہی بستر تھا جس پر اس نے ایک دن پہلے تک اپنے دغاباز مہمان کولٹا کر اس کی تیمارداری کی تھی۔ اب ہرراز سے پردہ اُٹھ چکا تھا اور ساری حقیقت خود بخود واشگاف ہوچکی تھی۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اُس مکارو ریاکار فوجی مہمان کی بیماری فریب تھی۔ ایک ڈھکوسلہ تھی اور اس سارے ڈرامے میں اسکی بدنیتی کارفرما تھی۔ یہ ایک سازش اور سوچا سمجھا منصوبہ تھا جسے وہ سمجھ نہیں سکا تھا اور اب سمجھا بھی تو کب؟ جب چڑیا چگ گئیں کھیت یعنی اب اس سمجھ کا کوئی فائدہ ممکن ہی نہ تھا۔ یہ تمام باتیں اس کے دکھ درد میں اضافے کا ہی باعث ہوسکتی تھیں۔

شدید صدمے سے وہ بیمار ہوگیا۔ بخار کا درجہ حرارت بلندی پر پہنچ جانے کے سبب اُس کو قصبہ "س" کے ایک اسپتال میں داخل کردیا گیا۔ اُس کی جگہ ایک عارضی پوسٹ ماسٹر نے سنبھال لی تھی۔

اتفاقاً اس کا علاج بھی وہی ڈاکٹر کررہا تھا جس نے اُس غدار اور دغاباز فوجی مہمان کا علاج کیا تھا۔ اُس نے پوسٹ ماسٹر کو بتایا کہ وہ نوجوان تو سرے سے بیمار تھا ہی نہیں بلکہ ہر طرح سے تندرست و توانا تھا۔ وہ اُس کی بدنیتی اور ارادے کو بھانپ چکا تھا۔ اس کی حیثیت اور نقصان پہنچنے کے خوف سے وہ چاہ کر بھی زبان کھولنے کی جرات نہ کرسکا تھا۔ اب پتہ نہیں یہ باتیں جرمن ڈاکٹر صحیح کہہ رہا تھا یا محض جھوٹا دلاسہ دے رہا تھا۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ ضرور اٹل اور مستحکم ہے کہ جرمن ڈاکٹر کی ان باتوں سے اُس کا غم کم ہونے والا نہیں تھا۔ خدا خدا کر کے اس کی صحت بحال ہوئی۔ اس نے اسپتال سے ہی دو مہینے کی چھٹی کی درخواست بھجوادی تھی جو بلا عذر منظور کرلی گئی۔ چھٹی لینے والی بات کوراز کا درجہ دیتے ہوئے اُس نے یہ بات کسی کو بھی نہیں بتائی اور پیدل ہی بیٹی کو تلاش کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ بہی کھاتے کے اندراج سے اُسے سراغ ملا کہ کپتان منسکی نے اسمولینکس سے پیٹرس برگ تک کا سفر کہا تھا۔ کوچوان جو گاڑی ہانگ کرلے گیا تھا اُس نے شراب کا نشہ اُترنے کے بعد یہ انکشاف کیا کہ دونیا سارے راستے روتی رہی تھی۔ گڑگڑاتی رہی تھی کہ اسے گاڑی سے اُتار دیا جائے۔ مگر اس فوجی کی مرضی کے خلاف گاڑی روکنا یا دونیا کی مدد کرنا اس کے بس کا نہیں تھا۔

"اللہ مالک ہے۔" پوسٹ ماسٹر نے کہا۔ "میں اپنی راستہ بھٹک جانے والی بھولی بھیڑ کو تلاش کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑ ونگا۔"

اور بالآخر بیٹی کی تلاش کے جنون نے کسی نہ کسی طرح اُسے پیٹرسن برگ پہنچا ہی دیا وہاں اپنے پرانے زمانے کا مریڈ اسماعیلوف کی رجمنیٹ کی بیرک تک پہنچنے میں اُسے کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔ اُس نے یہیں سے بیٹی کی تلاش وجستجو کا آغاز کردیا۔ یہیں سے اُسے سراغ ملا کہ کپتان مینسکی پیٹرس برگ میں ہی دیموتوف کے میخانے میں رہائش پذیر تھا۔ اب اُس نے یہ بات دل میں اچھی طرح ٹھان لی تھی

کہ وہ اس کے اس ٹھکانے پر پہنچ کر ہی دم لے گا۔
علی الصبح ہی وہ اس فوجی کے مکان کے صدر دروازے کے سامنے جا پہنچا تھا۔ اُس نے دربان سے کہا۔ ''اپنے مالک سے کہو کہ ایک بوڑھا فوجی آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ دربان یا خادم وہ جو بھی ہو بہر کیف اس وقت وہ اپنے جوتوں پر پالش کرنے میں مصروف تھا۔ اُس نے بتایا کہ صاحب اس وقت سو رہے ہیں۔ گیارہ بجے کے قریب آئے گا''۔ پوسٹ ماسٹر لوٹ آیا اور پھر مقررہ وقت پر پھر سے وہاں جا پہنچا۔ یکا یک دروازہ کھلا اور اُس نے دیکھا کہ گاؤن زیب تن کیئے ہوئے اُس کے سامنے مینسکی کھڑا تھا۔
''کہیئے مہربان!۔'' اُس نے کہا۔ ''میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔؟'' اتنا سن کر اس کا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو امنڈ پڑے۔ بدقت اُس کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔
''حضور والا!.....خدا کے لئے حضور والا!۔'' اب مینسکی نے اسے بغور دیکھا اور پھر اچانک ہی اس کے چہرے کا رنگ لال ہوگیا۔ وہ اُس کا بازو تھام کر اپنے مطالعہ گاہ میں لے گیا اور اندر سے کمرہ مقفل کرلیا۔
''حضور والا!۔'' بوڑھے نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ ''موتی سے آب تو اُتر ہی گئی.....آپ نے اپنی تمنا تو پوری کر ہی لی......جو چاہا وہ کر کے ہی چھوڑا خدا کے لئے اب تو میری بچی کو......میرے کلیجے کے ٹکڑے کو مجھے لوٹا دو......ایک غریب بوڑھا باپ کے حال زار پر اب رحم کھاؤ۔''
''جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔'' مینسکی نے کہا۔ ''اس کا ازالہ تو اب ناممکن ہی ہے مجھے افسوس ہے کہ مجھ سے نازیبا حرکت سرزد ہو چکی ہے۔ اس کے لئے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں اور یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی بیٹی کی طرف سے مطمئن رہیں کہ اُسے مجھ سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی بلکہ میں اسے زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کرونگا۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ وہ بھی مجھے دل سے چاہنے لگی ہے اور پچھلی زندگی کے وہ سارے طور طریقے فراموش کرچکی ہے۔ اُسے یہاں سے لے جا کر اور دو محبت کرنے والوں کو آپس میں جدا کر کے آپ کے ہاتھ کچھ نہیں لگے گا۔ کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اگر آپ اُسے یہاں سے لے گئے تو نہ وہ آپ سے آنکھ ملا سکے گی اور نہ آپ اُس سے، بیٹی کے ماتھے لگا کلنک آپ دونوں میں سے کسی کو بھی خوش نہ رہنے دے گا۔ اس لئے مہربانی کر کے دو محبت کرنے والوں کو جدا کرنے کا خیال دل نکال ہی دیجئے۔''
اتنا کہہ کر اس نے بوڑھے کے ہاتھ میں چپ چاپ کچھ تھما دیا اور مقفل دروازے کو کھول کر اسے اپنے ساتھ باہر لے آیا۔ پھر اُسے خود بھی پتہ چلا کہ وہ کب اور کیسے سڑک پر پہنچ گیا تھا۔ اُس نے مٹھی کھول کر دیکھا تو دس دس اور پانچ پانچ کے بہت سے روبل تھے۔ اُس نے ان نوٹوں کو مٹھی میں دبا دبا کر اور ان کا ایک گولا سا بنا کر اسے بڑی حقارت سے سڑک پر پھینک کر جوتے سے کچلنا شروع کر دیا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ دس قدم آگے چل کر اور کچھ سوچ کر وہ پیچھے کی طرف پلٹا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سڑک سے وہ نوٹ غائب ہو چکے تھے۔ قریب ہی ایک شخص جو اچھے خاصے لباس میں ملبوس تھا لپک کر درو شکی میں سوار ہوتا نظر آیا۔ بوڑھا تاڑ گیا کہ اسی شخص نے مفت کے مال پر ہاتھ صاف کیا ہے مگر اُس نے اس کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اب اُس نے اپنے دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ بس ایک بار وہ اپنی آنکھوں کے نور

اور دل کے سرور دونیا کو دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ اپنے پوسٹ اسٹیشن پر واپس چلا جائے گا۔

دوسرے دن وہ پھر وہیں پہنچ گیا۔ اس بار اسے جو تجربہ ہوا وہ عجیب بھی تھا اور مختلف بھی۔ اسے دیکھتے ہی دربان نے ناک بھوں چڑھالی اور اُسے باہر ڈھکیل کر دروازہ اندر سے مقفل کر دیا۔ وہ متذبذب سا تھوڑی دیر تک وہیں کھڑا رہا اور پھر مایوس ہو کر واپس لوٹ گیا۔

اُسی شام وہ تسینا یا اسٹریٹ سے جب شہیدوں کے چرچ میں عبادت کی غرض سے پیدل گزر رہا تھا کہ تبھی ایک شاندار سی بگھی اُس کے قریب سے ہو کر گزر گئی۔ اُس نے پہلی ہی نظر میں مینسکی کو پہچان لیا تھا۔ وہ بگھی ایک سہ منزلہ عمارت کے سامنے جا کر رکی۔ مینسکی پورچ میں داخل ہو گیا تھا۔ ایک نئے خیال سے اُس نے کوچوان سے پوچھا۔

''کیا بتائیں گے یہ بگھی حضور والا مینسکی کی ہے؟'' اس نے کہا۔

''ہاں یہ گاڑی انہیں کی ہے مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟

''اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ انہوں نے دونیا کو دینے کے لئے مجھے ایک رقعہ دیا تھا۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''مگر میں بوڑھا بھلکڑ بھول گیا ہوں کہ وہ کہاں رہتی ہیں؟''

''مگر ہو تو یہیں رہتی ہیں۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

''دوسری منزل پر۔'' مگر بھائی! اب رقعہ کس کام کا اب تو وہ خود ہی دونیا جی کے پاس پہنچ چکے ہیں۔''

''اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔'' اُس نے کہا۔ ''مجھے تو اپنی ڈیوٹی انجام دینی ہی پڑے گی۔'' اُس نے کوچوان کا شکریہ ادا کیا اور اس عمارت کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔

''وہ دوسری منزل پر واقع ایک فلیٹ کے دروازے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

''دروازہ اندر سے بند تھا۔ اُس نے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ دروازہ کسی نوجوان خادمہ نے کھولا۔ اُس نے دریافت کیا۔

''کیا دنیا یہیں رہتی ہے؟''

''ہاں یہیں رہتی ہے۔ خادمہ نے کہا۔'' آپ کو ان سے کیا کام ہے اور کیوں ملنا چاہتے ہیں؟''

بوڑھے نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور اندر داخل ہونے لگا۔

''آپ ایسے اندر نہیں جا سکتے ہیں۔'' خادمہ نے تنبیہ کی۔

''دونیا سیمپونو ونا اس وقت اپنے دوستوں سے ملاقات میں مصروف ہیں۔'' اُس نے سُن کر بھی ان سنا کر دیا اور آگے بڑھ گیا۔ اُس نے دو کمرے اپنے پیچھے چھوڑ دیے تھے۔ پھر اس نے اپنے سامنے والے تیسرے کمرے کے کواڑ کھولے اور اندر داخل ہو گیا۔ اس نے ایک طائرانہ نظر ڈال کر آس پاس کا جائزہ لیا۔ یہ ایک قیمتی ساز و سامان سے آراستہ کمرہ تھا جہاں مینسکی ایک آرام کرسی میں دھنسا اپنے خیالوں کی دنیا میں گم نظر آ رہا تھا اور دنیا جو نہایت قیمتی اور فیشن ایبل لباس زیب تن کئے ہوئے تھی کرسی کے بازو پر بیٹھی ہوئی مینسکی کو بڑی محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی انگلیوں میں بھی قیمتی نگینے جڑی انگوٹھیاں پھنسی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی انگلیوں میں پیار سے مینسکی کے بالوں کی لٹ بھی لپیٹتی جا رہی تھی۔

بوڑھے باپ کو آج اپنی بیٹی اس قدر خوبصورت نظر آئی کی اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ اسے بڑی تعریفی اور پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''کون ہے وہاں؟ دونیا نے بنا سر گھماتے کہا مگر جواب نہ ملنے پر اُس نے گھوم کر دیکھا۔ یکا یک ہی اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ کرسی کے بازو سے پھسل کر فرش پر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ مینسکی چونک کر دونیا کو اُٹھانے کے لئے فرش پر جھکا تبھی دروازے کے قریب کھڑا پوسٹ ماسٹر اس کی نگاہوں میں آ گیا۔ اس نے دونیا کو تو چھوڑ دیا اور غصے سے بے قابو ہو کر بوڑھے پر چڑھ دوڑا۔

''کیا چاہتے ہیں آپ؟۔'' اُس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''آپ ہاتھ دھو کر آخر کیوں پڑھے ہیں میرے پیچھے...... کیا میں چور ہوں جو آپ میرے اتعاقب کئے جا رہے ہیں...... خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دیئے...... دفع ہو جایئے۔'' اُس نے پوسٹ ماسٹر کا گریبان مضبوطی سے تھام کر اُسے دروازے تک گھسیٹا اور پھر سیڑھیوں پر ڈھکیل دیا۔

واپسی پر اُس کے دوست نے مینسکی کے خلاف اُسے پولیس میں رپورٹ درج کرانے کا مشورہ دیا مگر اُس نے نامنظور کر دیا۔ اب اس معاملے کو وہ وقت اور قسمت کے سپرد کر چکا تھا۔

دو دن کے بعد اُس نے پیٹرس برگ کو الوداع کہا اور واپس پوسٹ اسٹیشن آ کر اپنی ڈیوٹی جوائن کر لی۔

وہ کہہ رہا تھا۔'' پورے تین سال ہو چکے ہیں دونیا کی شکل دیکھے ہوئے اُس کی کوئی خیر خبر نہیں ہے۔ خدا جانے وہ زندہ بھی ہے یا مر چکی ہے...... یہ من موجی لوگ کسی ایک پر تو قناعت کرتے نہیں ہیں...... یہ پُرانیوں کو برطرف کر کے نئی نئی جوانیوں سے اپنا گھر آباد کرتے رہتے ہیں...... پیٹرس برگ مَیں ایسی بے وقوف عورتوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو آج تو آپ کو مکمل و کمخواب اور قیمتی زیورات سے آراستہ نظر آئینگی اور پھر کل کو یہی ناداں جوانیاں سڑکوں اور چوراہوں پر جھاڑو لگاتی اور اپنی قسمتوں کو کوستی دکھائی دینگی۔

...... کبھی کبھی جب تصور کی نگاہ سے میں اس بدنصیب مخلوق کو قابل رحم حالت میں دیکھتا ہوں تو یقین کیجیئے میں دونیا کو موت کی دعا مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔''

تو دُونیا کی یہی وہ کہانی تھی جو آنسوؤں آہوں اور کراہوں کے دوران بوڑھے پوسٹ ماسٹر نے پنچ کے لگاتار پانچ گلاس چڑھا لینے کے بعد مجھے سنائی تھی۔

میری گاڑی تیار کھڑی تھی۔ آخر کار میں نے اُس بدقسمت بوڑھے پوسٹ ماسٹر کو الوداع کہا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اس کے بعد وقت گزرتا گیا اور شدہ شدہ دونیا پوسٹ ماسٹر دونوں ہی میرے ذہن سے محو ہو گئے۔

تیسری بار پھر مجھے صوبہ ایکس جانے کا اتفاق ہوا۔ پچھلے پوسٹ اسٹیشنوں پر مجھے بتایا گیا کہ اب وہ پوسٹ ماسٹر اسٹیشن ختم کیا چکا ہے۔ پوسٹ ماسٹر کے بارے میں دریافت کیا تو سبھی نے لاعلمی کا

اظہار کیا اور لہٰذا معلوم نہ ہوسکا کہ وہ زندہ ہے یہ مر گیا۔

پوسٹ ماسٹر کی خیریت معلوم کرنے کے شدید اشتیاق کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے گھوڑا گاڑی کرایے پر لی اور راستہ تبدیل ہو جانے کے باوجود بھی قصبہ این کی جانب روانہ ہو گیا۔ موسم خزاں اپنے شباب پر تھا۔ آسمان پر بھورے بھورے بادل اپنا قبضہ قائم کئے ہوئے تھے۔ ہوا کے کپکپا دینے والے سرد جھونکے فصلوں سے عاری ننگے کھیتوں اور جنگلوں میں دوڑ لگاتے پھر رہے تھے۔ زرد و سرخ پتوں میں راستے چھپ گئے تھے۔ گاڑی کو بڑی احتیاط سے ہانکا جا رہا تھا۔ رفتار بھی مدھم تھی اس لئے غروب آفتاب کے وقت ہی میری گاڑی پوسٹ اسٹیشن پر جا کر رکی۔

وہاں ایک فربہ اندام عورت پورچ میں اسی جگہ کھڑی تھی جہاں میں نے دونیا کو پہلی بار چوما تھا۔ میرے استفسار پر اس عورت نے بتایا کہ پوسٹ ماسٹر کو گزرے ہوئے ایک سال گزر چکا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ یہ عمارت فروخت ہو چکی ہے اور یہ اب ایک شراب کشید کرنے والے کلارکی رہائش گاہ ہے اور اس گھر کے مالک اُسی کلار کی بیوی ہے۔ اس خبر سے میرے دل کو بڑی ٹھیس لگی کہ چاہ کر بھی پوسٹ ماسٹر سے ملاقات ممکن نہ ہو سکی اور سات روبل کا خرچہ نیز سفر کی زحمت رائیگاں ہی چلی گئی۔ میں نے دریافت کیا۔

''اُن کی موت کی وجہ کیا تھی؟''

''وجہ تو وہ خود ہی تھے۔ شراب کی زیادتی سے انہوں نے خود کو ہی مار ڈالا تھا۔''

''کیا بتا سکیں گی کہ انہیں کہاں دفن کیا گیا تھا؟۔''

''جی ضرور۔ گاؤں کے پچھواڑے والے چھوٹے سے قبرستان میں وہ اپنی مرحوم بیوی کے پہلو میں دفن ہیں۔''

''کیا کوئی مجھے وہاں تک پہنچانا پسند کریگا؟۔''

''اے وانکا! بلی سے کھیلنا بند کرو۔'' کلار کی بیوی نے ایک بھدے سے لڑکے کو مخاطب کر کے کہا۔'' صاحب کو قبرستان لے جا کر انہیں پوسٹ ماسٹر کی قبر دکھا دو۔''

ایک سرخ بالوں والا پھٹے حال لڑکا مجھے ساتھ لئے قبرستان کے راستے پر چل پڑا

''کیا تم پوسٹ ماسٹر سے واقف ہو۔'' میں نے لڑکے سے دریافت کیا۔

''خوب اچھی طرح۔'' لڑکے نے فخریہ جواب دیا۔'' انہوں نے ہی مجھے سیٹی بجانا سکھایا تھا۔ جب وہ میخانے سے پی کر آتے تو ہم ان کے پیچھے لگ جاتے۔ ہم بچے لوگ اُن سے گٹھلیاں حاصل کر کے آپس میں خوب کھیلا کرتے تھے۔''

''کیا کسی مسافر نے کبھی کچھ اُن کے بارے میں پوچھا تھا؟۔''

''نہیں سرکار! ادھر زیادہ تر جج صاحبان گزرتے ہیں جنہیں مرنے والوں میں ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔ البتہ پچھلے موسم بہار میں ایک خاتون یہاں آئی تھیں اور ان کی کو خواہش پر ہم نے انہیں پوسٹ ماسٹر کی قبر پر پہنچا دیا تھا۔''

یکا یک میرے دل میں درد کی برق سی کوند گئی۔ متجسس ہو کر میں نے بڑے بے صبری سے

پوچھا۔" وہ خاتون کیسی تھیں؟"۔

"بے حد پیاری اور بے حد خوبصورت تھیں انکل!۔" لڑکا خوشی خوشی بتا رہا تھا

"وہ ایک شاندار سی کوچ میں سوار ہو کر آئی تھیں۔ کوچ میں سب ملا کر وہ چھ تھے۔ ایک تو وہ خود تھیں، تین ان کے بچے تھے، ایک ان کی نرس تھی، ان کے علاوہ نرم بالوں والا ایک خوبصورت سا کتا بھی ان کے ساتھ تھا۔ تو سب ملا کر وہ چھ ہی تو ہوئے۔ یہاں آ کر جیسے ہی انہیں معلوم ہوا کہ پوسٹ ماسٹر صاحب کا انتقال ہو گیا ہے تو وہ غم سے بیہوش ہو گئیں اور ہوش آنے پر بہت تڑپیں، بہت روئیں۔ انہوں نے اپنے بچوں سے کہا۔ تم لوگ یہیں ٹھہرو میں قبرستان جا رہی ہوں۔ میں نے کہا میں آپ کو وہاں پہنچا دوں؟ انہوں نے کہا ضرورت نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے قبرستان کہاں ہے۔ انہوں نے پانچ کوپک کا ایک چاندی کا سکہ بھی مجھ سے خوش ہو کر مجھے دیا تھا۔ ایسی ہی دریا دل اور نیک خاتون تھیں وہ۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میری خوشی اسی میں ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ جاؤں تو انہوں نے قبرستان جاتے ہوئے مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔"

اب ہم قبرستان میں داخل ہو چکے تھے۔ عجیب ہو کا عالم تھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چاروں اطراف میں پھیلی ہوئی قبروں پر ایستادہ صلیب مدفونوں کے لئے نوحہ خواں معلوم ہو رہے تھے۔ یہاں قبروں پر سایہ کرنے والے درخت بھی ناپید تھے۔ ایسا ویران وسنسان اور اُداسی میں لپٹا ہیبتناک قبرستان اپنی زندگی میں میں نے پہلی ہی بار دیکھا تھا۔

"یہی پوسٹ ماسٹر کی قبر ہے۔" لڑکے نے مٹی کے ایک ڈھیر کی طرف انگلی سے اشارا کیا۔

"قبر کے سرہانے ایستادہ صلیب پر پیتل کی مقدس مورت جڑی تھی اور قبر پر حسرت برس رہی تھی۔

"کیا وہ خاتون یہاں ہی آئی تھی؟" میں نے رقت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"ہاں وہ یہاں اسی قبر کی زیارت کرنے آئی تھیں۔" وانکا نے مزید بتایا۔

"وہ قبر کے پہلو میں لیٹ گئی تھیں۔ وہ آنکھیں موندے نجانے کب تک یونہی لیٹی رہی تھیں۔ پھر وہ گاؤں چلی گئیں اور انہوں نے چرچ کے پادری کو بہت سا پیسہ دیا تھا۔ پھر وہ جس طرح یہاں آئی تھیں اسی طرح اپنے شہر واپس چلی گئیں۔ جاتے وقت انہوں نے بخشش میں پانچ کوپک والا چاندی کا سکہ بھی مجھے دیا تھا۔"

اب میں نے بھی لڑکے کو پانچ کوپک دے دیے۔

اب مجھے سفر کی زحمت اور سات روبل کی فضول خرچی کا ذرا بھی ملال نہ تھا۔

☆......الیکسانڈر پشکن

☆......رفیق شاہین

انوکھی دعوت

تابوت ساز ''آدریان پرخوروف'' کے دولاغر گھوڑوں والی گاڑی میں لدے گھر کے ساز و سامان کو چھٹے پھیرے میں ''بسمانیا اسٹریٹ'' سے ''تکلتسکایا'' اسٹریٹ منتقل کردینے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اُس نے پُرانے میکانکی دروازے کو مقفل کر کے اس پر ایک چھوٹا سا بورڈ لٹکا دیا تھا جس پر لکھا تھا ''کرائے کے لئے خالی ہے اور بکاؤ بھی ہے۔'' پھر وہ پیدل ہی اپنے نئے مکان کی طرف چل پڑا۔ زرد رنگ سے پُتا یہ مکان نہی جانے کب سے اس کی زندگی کا واحد مقصد بنا ہوا تھا۔ بالآخر قسمت نے اُس کا ساتھ دیا اور سستے داموں میں سودا پٹ جانے پر یہ مکان اب اس کی ملکیت بن چکا تھا۔ نہ جانے کیوں نئے مکان کی اجنبی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے اسے خوشی کا ذرا بھی احساس نہ ہوا۔ پرانا مکان یاد آجانے پر اسکے منہ سے بیساختہ سرد آہ نکل گئی۔ اگر چہ مکان جیسی تو اس میں کوئی بات ہی نہ تھی وہ تو محض ایک تنگ و تاریک غار جیسا ہی تھا جہاں اس نے اپنی قیمتی زندگی کے اٹھارہ سال گذار دئے تھے۔ بکھرے پڑے سامان کو نئے گھر میں قرینے سے لگانے میں اُس کی دونوں جوان بیٹیاں اور گھریلو خادمہ جٹی پڑی تھیں۔ اس کام میں وہ خود بھی شامل ہو گیا اور کچھ دیر بعد ہی مکان گھر جیسا نظر آنے لگا۔ چینی الماریاں، میز، کوچ اور پلنگ سب کے سب عقبی کمرے میں سلیقے سے ٹھکانے لگ چکے تھے اور بوڑھے تابوت ساز کی اصل جائداد رنگین تابوت، ماتمی سیاہ لبادوں سے بھری الماری، دیگر ملبوسات اور ٹارچ وغیرہ پارلر اور رسوئی گھر کے اسٹور روم میں رکھ دئے گئے تھے۔ ساتھ ہی باہری دروازے پر ایک بورڈ بھی لٹکا دیا گیا تھا جس پر تحریر تھا۔

''یہاں سادہ اور رنگین تابوت فروخت کئے جاتے ہیں نیز پُرانے تابوتوں کی مرمت بھی ہوتی ہے۔''

کام سے فارغ ہو کر اور تھک کر اس کی دونوں بیٹیاں آرام کرنے چلی گئی تھیں گھر کا معائینہ کرنے کے بعد اب وہ بھی کھڑکی کے پاس آکر بیٹھ گیا اور ملازمہ کو حکم دیا کہ وہ چائے کا سماوار لگا دے۔

ہمارے ذہین قارئین اچھی طرح جانتے ہیں کہ شیکسپیرؔ اور سر والٹر اسکاٹ کے گورکن بڑے زندہ دل اور پُر مزاح شخصیت ہوا کرتے تھے جب کہ ہمارا تابوت ساز آدریان تو ان کے برعکس کچھ عجیب ہی مزاج کا انسان ہے جو اپنے بدنصیب پیشے سے گہری مطابقت رکھتا ہے۔ وہ بجھی بجھی سی افسردہ اُداس طبیعت کا مالک ہے اور اکثر خاموش ہی رہتا ہے۔ اس کا بولنا لڑکیوں کو جھڑکنے ملازمہ کو حکم دینے اور مرحومین کے مغموم متعلقین سے تابوت کی سودے بازی کے موقع پر حیل و حجت کرنے تک ہی محدود ہے۔

آدریان پرخوروف پر حسب معمول اُداسی آمیز غنودگی جیسی کیفیت طاری تھی اور کھڑکی سے لگ کر بیٹھے ہوئے یہ اُس کی چائے کا ساتواں کپ تھا۔ اس وقت رٹائرڈ بریگیڈیر کے ہفتے بھر پہلے اٹھائے گئے۔ جنازے کا اُداس منظر اس کی نگاہوں میں گردش کر رہا تھا۔ جنازہ ''ٹولگیٹ'' قبرستان پہنچا ہی تھا کہ

ایکا ایکی موسلا دھار بارش ہوگئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شرکائے جنازہ بارش میں بھیگ کر سردی سے بُری طرح کانپنے لگے اور ان کے دانت بجنے لگے تھے۔ پانی میں شرابور ہوکر ان کے بھیگے لباس ان کے جسموں سے چپک گئے تھے۔ ہیٹوں کی چوگردہ کناریاں بھیگ کر بل کھا گئی تھیں۔ پھر وہ منظر آپ ہی آپ نظروں کے سامنے سے اوجھل ہو گیا اور اس کا دماغ اُس برباد شدہ سرمائے کی طرف منتقل ہو گیا جو نہ بکنے والے قدیم وخستہ حال تابوتوں میں پھنسا ہوا تھا۔ اب اس خسارے کو پاٹنے کی آس کی آخری اُمید ایک تاجر کی بیوہ ''تریوخینا'' بنی ہوی تھی جو پچھلے ایک سال سے قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ لیکن تریوخینا کو ''رازگلیائی'' میں مرنا تھا جو یہاں سے فاصلے پہ تھا۔ اگر چہ موصوفہ کے ورثا اسے ہر طرح یقین دلا دیا تھا کہ اس موقعے پر اسی کی خدمات طلب کی جائینگی لیکن تابوت ساز کو اس بات کا خطرہ لاحق تھا کہ فاصلے کے سبب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ یہ خدمت اپنے کسی قریبی تابوت ساز کو سونپ دیں اور یہ نفع بخش سودا ہاتھ سے نکل جانے پر وہ ہاتھ ملتا ہی رہ جائے۔

اچانک دروازے پر لگاتار تین دستکیں ہوئیں اور اُس کے خیالات کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا ''دروازے پر کون ہے بھائی؟'' آدریان نے آواز لگائی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک شخص جو ہر لحاظ سے جرمن کاریگر دکھائی پڑتا تھا۔ پروخروف کے پاس آکر مسکرانے لگا۔ ''معاف کیجئے گا معزز پڑوسی!'' ٹوٹی پھوٹی نیاز اور واقفیت کا خواہاں ہوں۔ میں ایک جوتا ساز ہوں۔ میرا نام گوٹلیب شولز ہے۔ میں آپ کی گلی کے اُس پار رہتا ہوں۔ میرا مکان آپ کو اس کھڑکی سے بھی نظر آسکتا ہے۔ دراصل کل ہم اپنی شادی کی سالگرہ منانے جارہے ہیں۔ میں آپ کو مدعو کرتا ہوں کہ آپ اپنی بیٹیوں کے ہمراہ دوستانہ انداز میں ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوں۔''

یہ دعوت نامہ شکریے کیساتھ قبول کرلیا گیا اور تابوت ساز نے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے جوتے ساز کو بٹھا کر چائے نوش کرنے کیلئے کہا۔ اب اسے گوٹلیب شولز کے بے تکلفانہ مزاج کا کرشمہ ہی سمجھ لیجئے کہ لمحہ بھر پہلے کے دو اجنبی پُرانے دوستوں کی طرح بے تکلف گفتگو میں شریک ہو چکے تھے۔

''آپ کے کاروبار کی کیا حالت۔؟'' آدریان نے پوچھا۔ شُولز نے جواب دیا۔

''ہے ہو...... ہمارے کاروبار میں اُتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ شاکی نہیں ہوں البتہ یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اصلاً ہم دونوں کی صنعتیں جداگانہ مزاج کی حامل ہیں۔ ایک زندہ انسان بغیر جوتوں کے بھی گذر کرسکتا ہے۔ لیکنا یک مردہ تو بنا تابوت کے رہ ہی نہیں سکتا۔''

''آپ بجا فرماتے ہیں۔'' آدریان نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''ایک زندہ انسان جس کی جیب میں پیسے نہیں ہیں آپکی دُکان پر جا کر بوٹ کے لئے تقاضہ نہیں کریگا بلکہ یوں ہی کام چلا لیگا۔ جب کہ ایک قلاش اور خالی بھکاری بھی تابوت کا تقاضہ ضرور کریگا۔ بغیر تابوت کے زمین میں دفن ہونا اُسے گوارا ہی نہیں۔''

کچھ دیر اسی انداز میں گفتگو چلتی رہی پھر جوتہ ساز اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دعوت کی یاددہانی کرادینے کے بعد وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اگلے دن دوپہر کے وقت تابوت ساز اور اُس کی بیٹیوں نے نئے مکان کی دہلیز کو پار کر کے

قدم باہر نکالے اور اپنے میزبان پڑوسی کے یہاں پہنچ گئے۔ اس موقع پر تابوت ساز نے جو کفتان زیب تن کر رکھا تھا اسکا صحیح الفاظ میں اظہار آسان نہیں ہے۔ اسے کفتان کہنا بھی کفتان کی توہین ہوگا۔ اسی طرح اس کی بیٹیوں اکولیا اور دریا کو بھی انگریزی لبادہ کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ البتہ یہ کہنا ضرور آسان ہے کہ وہ دونوں لڑکیاں سروں پر سنہری ہیٹ اور پیروں میں لال رنگ کے سلیپر پہنے ہوئے تھیں اور انہیں بھی وہ خاص خاص موقعوں پر ہی پہنا کرتی تھیں۔

جوتا ساز کا تنگ کمرہ مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ان میں کثیر تعداد جرمن صنعت کاروں اور کاریگروں کی تھی جو وہاں اپنی بیویوں اور ہم پیشہ دوستوں کے ہمراہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان میں بس ایک ہی سرکاری ملازم پولیس کانسٹیبل ''پورکو'' تھا جو اپنے میزبان کی دلجوئی کی خاطر تقریب میں شامل ہوا تھا۔ وہ ''یوگورینسکی'' کے شہرت یافتہ ''پوسٹ مین'' کی طرح گذشتہ اکیس سال سے ان کی تقریبات میں برابر شامل ہوتا چلا آرہا تھا۔ ۱۸۱۶ء کے پر آشوب دور میں ''نپولین بونا پارٹ'' کے ذریعے بھڑکائے ہوئے آگ کے شعلوں نے روس کے قدیم دارالسلطنت پیٹرس برگ کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ اس خوفناک آگ کی لپٹوں سے پورکو کا ''زرد سنتری باکس'' بھی محفوظ نہ رہ سکا لیکن جیسے ہی روسی جیالے فرانسیسیوں کو سرحد سے باہر کھدیڑنے میں کامیاب ہوئے ایک نیا سنتری باکس معرض وجود میں آچکا تھا جسے زرد اور سفید رنگوں کے چوخانے بنا کر سجایا گیا تھا۔ پورا کو اکثر اسی کے سامنے چہل قدمی کرتا رہتا تھا۔ وہ ''نکتسکی گیٹ'' میں رہائش پذیر بیشتر جرمن حضرات سے واقف تھا جن میں سے کچھ لوگ اپنی اتوار کی راتیں اسی سنتری باکس میں گلستان کر دیا کرتے تھے۔ آدریان نے پورکو سے تعلقات استوار کرنے میں کچھ ایسی عجلت کا مظاہر کیا جیسے عنقریب اُس سے کوئی اہم کام بننے کی توقع ہو۔ جب مہمان لوگ اپنی اپنی نشستیں سنبھال رہے تھے ادریان نے قصداً اپنے لئے چور کو پہلو والی نشست کا انتخاب کیا۔ ''ہیراوُ شولز'' اور ان کی سترہ سالہ بیٹی ''لوٹ چن'' میزوں پر موجود مہمانوں کے آگے کھانے لگوانے کی دیکھ بھال میں مصروف تھیں۔ بیئر پلائی جارہی تھی۔ بہائی جارہی تھی۔ پورا کو اکیلے پیٹ چار آدمیوں کا کھانا پیٹ میں ڈھکیل چکا تھا۔ آدریان بھی اس مقابلے میں پیچھے نہیں تھا۔ البتہ اس کی بیٹیوں نے شائستگی کا بھرم آخیر تک قائم رکھا۔ کھانے کے ساتھ ہی جرمن زبان میں گفتگو بھی چل پڑی جو بعد میں شور شرابے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ دفعتاً میزبان نے بوتل کا ڈھکنا ہوا میں اُڑاتے ہوئے با آواز بلند روسی زبان میں اعلان کیا۔

''معزز مہمانو جام نوش کیجئے میری چہیتی بیوی لوئیزی کی صحت کے لئے''۔ سب کے پیالوں میں شیمپین انڈیل دی گئی۔ پھر دوسری بوتل کھولتے ہوئے میزبان نے مکرر اعلان کیا۔

''جام نوش فرمایئے معزز مہمانوں کی صحت کے لئے۔'' مہمانوں نے شکریہ کے ساتھ تازہ بھرے جام ہونٹوں سے لگانے شروع کر دیئے۔ اب جام صحت کے اعلانات کا سلسلہ رفتار پکڑ چکا تھا۔ مہمان اب ایک دوسرے کی صحت کے حوالے سے بھی جام سے جام ٹکرا رہے تھے۔ پھر ماسکو اور درجن بھر شہروں اور قصبوں کی صحت کی خاطر بھی جام سے جام ٹکرانے لگے۔ پھر جام صحت کا رشتہ مختلف صنعت کاروں اور شاگردوں سے بھی جوڑا جانے لگا۔ رشتے جوڑنے میں اور اپنی دقیانوسیت کا مظاہرہ کرنے میں آدریان بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ اب ایک اور مہمان جو قوی الجثہ نانبائی تھا۔ کھڑے ہو کر چلایا۔

''اُن سب کی صحت کے لئے جن کے کہ ہم لوگ کارندے ہیں۔'' یہ جام بھی متفقہ قبولیت کے ساتھ نوش کر لیا گیا۔ اب تعظیماً ایک دوسرے کے آگے جھکنے کی رسم کا آغاز ہوا۔ درزی جھکا جوتہ ساز کے آگے اور جوتہ ساز درزی کے آگے اور نانبائی جھکا ان دونوں کے آگے اور ساری محفل جھکی نانبائی کے آگے وغیرہ وغیرہ کہ ناگاہ اسی ادب و تعظیم کے دوران ہی یورکو آدریان کی طرف پلٹ پڑا اور گلے کے بل دہاڑا ''آؤ معزز پڑوسی آپکے دفنائے ہوئے مردوں کی صحت کے لئے جام نوش کرتے ہیں۔'' اس نرالے اور مضحکہ خیز اعلان پر محفل میں ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا جو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ تابوت ساز کو اس پر اہانت و حقارت کا شدت سے احساس ہوا۔ غصے سے اس کا چہرا تمتما اُٹھا جسے محفل میں کسی نے بھی محسوس نہیں کیا۔ سبھی مہمان شغل مئے نوشی اور آپسی گفتگو میں مشغول تھے۔ بہر کیف آدھی رات بیت چکی تھی اور محفل کو تو برخواست ہونا ہی تھا۔ مہمان اپنی اپنی نشستوں سے قوی اُلجثہ نانبائی اور جلد ساز نے جن کے لال دمکتے چہرے اہل مراقش کی یاد تازہ کئے ہوئے تھے انہوں نے یورکو کے بازو تھام کر جیسے تیسے اُسے اُس کے سنتری باکس میں پہنچایا تھا۔

اہل محفل سے ناراض اور افسردہ تابوت ساز جب گھر واپس پہنچا تو شدید طور پر ذہنی انتشار اور خلفشار میں مبتلا تھا۔ وہ جنونی سی کیفیت میں مبتلا باآواز بلند بڑبڑا رہا تھا۔ ''تابوت ساز کوئی بے رحم جلاد نہیں ہے نہ ہی یہ پیشہ کسی کے کم تر ہے۔ سب اپنے اپنے پیشوں کے ذریعے انسانی خدمت انجام دیتے ہیں۔ میں بھی دیتا ہوں پھر؟ ان لوگوں کو اپنے یہاں مدعو کرنے کے لئے بس دعوت کا اعلان کرنے ہی جا رہا تھا کہ ان کی اصلیت سامنے آگئی۔ نہیں...... ہرگز بھی نہیں...... اب کبھی نہیں بلاؤں گا میں انہیں اپنے یہاں ...... اب اپنے یہاں میں اُن کی مدعو کروں گا جو میرے پیشے کا حصہ ہیں اور جو میرے بنائے تابوتوں میں لیٹ کر نہایت خاموشی کے ساتھ قبرستان چلے گئے...... ہاں اب میں اپنے بھائی انہیں عیسائی مردوں کو اپنے یہاں بلاؤں گا......''

''مالک حضور! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟'' اس کی خادمہ عکسینا جو اُس کے جوتے اُتارنے میں مشغول تھی اُسے ٹوکنے پر مجبور ہوگئی۔

''آپ سینے پر صلیب کا نشان بنائیے۔ زندوں کے گھر میں مُردہ لاشوں کو بلانا کیسی منحوس اور ہولناک بات ہے۔''

''مجھے بھی قسم ہے بلاؤں گا......اور ضرور بلاؤں گا۔'' آدریان کے بڑابڑاہٹ زدہ لہجے میں ضد اور قوت ارادی کی جھلک موجود تھی۔

''اے میرے مقدس پیشے کے بنیاد گزارو! میری روزی روٹی کے سہارو! میرے رفیق ساتھیو! معزز محسنو! میں آپ حضرات کو دعوت دیتا ہوں آپ لوگ کل رات کے کھانے پر تشریف لا کر میری عزت و توقیر میں اضافہ کیجئے۔ امید ہے آپ میری التجا قبول فرمائینگے۔'' اس کے ساتھ وہ بستر پر لڑھک گیا اور فوراً ہی خراٹے بھرنے لگا۔

آندریان جب بیدار ہوا تو ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مرحوم تاجر کی بیوہ تریوخینا رات میں ہی چل بسی تھی۔ مرحوم کا زرخرید غلام بحثیت پیغام مبر گھوڑے پر سوار رات میں ہی آندریان کے پاس پہنچ

گیا اور اُسے بتایا کہ اُس کی خدمات مطلوب ہیں۔ آدریان کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اُس نے پیغام مبر کو دودھ پینے کے لئے اسی وقت دس ''کوپک'' انعام میں دیدیئے۔ پھر اسی نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور ''درد شکی'' نکال کر روانہ ہو گیا وہاں پہنچا تو دیکھا کہ باہر کچھ لوگ پہرا دینے والے تعینات تھے اور اندر تاجر لوگ ادھر سے ادھر یوں منڈلا رہے تھے۔ جیسے کوّوں کو سڑے گوشت کا سراغ مل گیا ہو۔ لاش کو ایک وسیع میز پر لٹا دیا گیا تھا۔ مرنے والی کا چہرا مرجھایا ہوا تو ضرور تھا لیکن ابھی چہرے کے نقوش مسخ نہیں ہوئے تھے۔ اعزہ پڑوسیوں اور گھریلو خدمتگاروں کی بھیڑ نے لاش کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ہال کی ساری کھڑکیاں کھول دی گئی تھیں ہر طرف موم بتیاں روشن تھیں اور چرچ کے پادری رسوم جنازہ کی ادائیگی میں مصروف تھے۔

آدریان مرحومہ کے بھتیجے کے پاس جا پہنچا جو ایک تاجر پیشہ نوجوان تھا اور اس وقت فیشن زدہ فراک کوٹ میں ملبوس تھا۔ اُس نے نوجوان کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''تابوت، موم جامہ، موم بتیاں، کیوڑہ اور میت کا جملہ سامان بہتر قسم کے بروقت پہنچا دیا جائے گا۔''

نوجوان کا دماغ جانے کہاں اٹکا ہوا تھا۔ اُس نے بے خیالی کے عالم میں آدریان سے کہا۔

''ٹھیک ہے ہمیں آپ کی ایمانداری پر یقین ہے۔ آپ اپنا کام کیجیئے جو بھی آپ کا بل ہو گا اس کا بھگتان کر دیا جائے گا۔''

میں بھی وہی پیسے لگاؤں گا جو جائز ہونگے۔'' آدریان نے کہا اور پیغامبر پر معنی خیز ڈالی جو اس بات کا اشارہ تھی کہ مزید انعام کیلئے وہ مطمئن رہے۔ اس کے بعد مال کی تیاری کے لئے وہ وہاں سے فوراً ہی گھر کے لئے رخصت ہو گیا۔

اُس کے مریل گھوڑوں والی ''دروشکی'' سارے دن ''راز گلیانی'' اور ''دنلتسکی گیٹ'' کے درمیان اِدھر اُدھر پھیرے لگاتی رہی اور شام تک میت کا ساز الازمی سامان مرحومہ کی حویلی میں منتقل ہو چکا تھا۔ اب وہ خوشی خوشی پیدل ہی گھر کی طرف چل پڑا۔ گاڑی اُس نے کوچوان کے ذریعے پہلے ہی واپس بھجوادی تھی۔ ہر طرف چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ آدریان نے ''دنلتسکی گیٹ'' تک کا پیدل سفر بآسانی طے کر لیا تھا اور اب جب کہ وہ چرچ کے سامنے سے گذر رہا تھا پور کو کی اُس پر نظر پڑ گئی۔ آدریان نے بھی اُسے دیکھ لیا تھا مگر جلدی ہی گھر پہنچنے کی دُھن میں اُس نے اُسے نظر انداز کر دیا اور آگے نکل گیا۔ آدریان کا گھر اب اُس کے سامنے تھا کہ یکا یک اُس کے قدم ٹھٹھک گئے۔ اُس نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ اس کے سامنے ہی کسی نے اس کے گھر کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ مبتلائے تجسس اور حیرت زدہ آدریان نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سوچا۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟ کسے میری ضرورت پڑ گئی۔ کیا مکان میں داخل ہونے والا کوئی چور ہے؟ یا پھر......اور اس نئے خیال پر تو اس کے رونگٹے ہی کھڑے ہو گئے اور دل ایک دم سینے میں دوبتا محسوس ہوا۔ اس نے سوچا کہیں اس حرکت میں اس کی احمق اور بے وقوف بیٹیاں تو ملوث نہیں ہیں کہ جوانی کا بوجھ برداشت نہ ہونے پر غیر مردوں کو رات کے اندھیرے میں چوری چھپے اپنے پاس بلانے لگی ہیں۔ کیا پور کو سے امداد طلب کی جائے؟ وہ ایسا کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور شخص اُس کے

دروازے پر پہنچا اور آدریان کے نظر آ جانے پر فوراً ہی رک گیا اور ادب سے اپنا ہیٹ اُتار دیا۔ تابوت ساز کو اس کی شکل جانی پہچانی سی معلوم ہوئی۔

کیا آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں؟ آدریان نے پوچھا۔ ''تکلف کی ضرورت بالکل نہیں ہے حضور والا!'' اجنبی نے شائستہ لہجے میں کہا۔ ''بطور میزبان پہلے آپ دروازے میں داخل ہوں پھر اپنے مہمان کو خوش آمدید کہیں۔''

آدریان گھبرایا ہوا سا آگے بڑھا اور دروازے کی چند سیڑھیاں طے کر کے مکان میں داخل ہو گیا۔ اس کی تقلید میں اجنبی بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔

کمرے کے قریب پہنچ کر اچانک ہی ادریان کو شدت سے گمان گذرا کہ کمرہ خالی نہیں ہے۔ اندر کی سرگرمیاں اور ہما ہمی اس خوفناک حقیقت کی غماز تھی کہ انسانوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کی حیرت و تجسس کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

وہ لپک کر دروازے کی طرف بڑھ گیا اور تبھی خوف دہشت کی ایک برقی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں تیرتی چلی گئی۔ اس کی ٹانگیں کپکپائیں اور دونوں گھٹنے آپس میں ٹکرانے لگے۔ اس کی حلقوں سے باہر نکل پڑنے والی آنکھیں معمول پر آنے کے لئے ذرا بھی تیار نہ تھیں۔ سانس بھی رُک رُک کر آ رہا تھا کیونکہ کمرے کے اندر کا منظر ہی عجیب وغریب تھا۔

کمرہ مردوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایسے مردوں سے جن میں زندگی کی حرارت عود کر چکی تھی۔ چاند کی نیلی پیلی کرنیں کھڑکیوں کے شیشوں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھیں۔ چاند کی اس مدھم روشنی میں ان کے پچکے منہ اور ادھ کھلی دھندلائی سی آنکھیں اور کھمبا سی کھڑی ناکیں صاف طور پر نظر آ رہی تھیں۔ اُن میں سے کئی کو پہچان کر آدریان ایک بار پھر دہشت سے لرز اُٹھا۔ یہ وہی تھے جنہیں اس نے قبرستان کے آخری سفر کے لئے اپنے ہاتھوں کے بنے تابوت مہیا کئے تھے اور وہ اجنبی جو اُس کے پیچھے پیچھے مکان میں داخل ہوا تھا۔ اب وہ بھی دائرہ شناخت میں آ چکا تھا۔ یہ ایک ہفتے پہلے والا وہی بریگیڈیر تھا جسے ''ٹول گیٹ'' قبرستان میں موسلا دھار بارش کے دوران دفن کیا گیا تھا۔ لاشوں کے اس گروہ نے جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے غول بیاباں کی طرح آدریان کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ وہ سب کے سب جھک جھک کر اس کی تعظیم کرتے ہوئے اپنی اپنی نیک خواہشات کا اظہار کر رہے تھے۔ البتہ ایک غریب مردہ جو مفت کے تابوت میں دفن ہوا تھا اور جسے دنیا سے رخصت ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے قریب نہیں آیا۔ وہ پھٹے حال ہونے کے سبب محجوب سا ایک کونے کھڑا دور سے ہی جھک جھک کر تعظیم بجالانے میں مشغول تھا۔ اس کے علاوہ باقی سبھی عورتیں اور مرد اپنی بہترین پوشاکیں زیب تن کئے ہوئے تھے۔ مردہ عورتوں کے ہیٹ رنگین ربنوں سے مزین تھے۔ اعلیٰ افسران کے شیو بڑھے ہوئے تھے اور وہ اپنی شاندار وردیوں میں ملبوس تھے۔ ان کے علاوہ جو تجارت پیشہ مردے تھے ان کے لمبے لمبے لباس اپنے قیمتی ہونے کا اعلان آپ تھے۔

''آپ کی پرخلوص دعوت میں شریک ہونے کے لئے ہم سب اپنی اپنی قبروں سے نکل پڑے ہیں لیکن ہم میں وہ بے چارے جن کے جسموں کا گوشت سڑنا شروع ہو چکا ہے۔ بحالت مجبوری ہماری پشت

پر کھڑے ہیں۔ آپ کی اس پُر خلوص اور فیاضانہ دعوت خصوصی نے اس میں شرکت کا ایسا مشتاق بنا ڈالا کہ ہم میں جو بدنصیب ہڈیوں کا محض ڈھانچہ ہی رہ گئے تھے وہ بھی دیوانہ وار یہاں کھنچے چلے آئے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی میانے قد کا ایک ڈھانچہ مردوں کی بھیڑ ڈھکیل کر اُن میں راہ بناتے ہوئے آدریان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی ہڈیوں پر یہاں وہاں گہری سبز اور سرخ رنگ کی دھجیاں لپٹی ہوئی تھیں اور وہ ڈھانچہ کھمبے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ شکاری جوتوں میں اُس کی سوکھی ہڈیاں ''چڑ چڑ'' بول رہی تھیں اُس نے آدریان سے کہا۔

''پروخوروف! کیا تم نے مجھے پہچانا؟ میں گارد کا رٹائرڈ سارجنٹ ''پیوتر پیتر ووِچ'' ہوں۔ شاید تمہیں یاد ہو یہ ۱۷۹۹ کی بات ہے کہ تم نے ''اوک'' (OAK) کی لکڑی کا بنا پہلا شاندار تابوت مجھے ہی فروخت کیا تھا۔''

اتنا کہہ کر ڈھانچے نے برائے معانقہ اپنے دونوں بازوؤں کو آگے کی جانب دراز کر دیا تاکہ اسے اپنے سینے سے لگا سکے اس پر آدریان پر خوف و دہشت کا زبردست غلبہ ہوا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ اس نے اپنے منتشر حواس کو مجتمع کر کے اور جسم کی ساری قوت صرف کر کے اسے پیچھے کی طرف ڈھکیل دیا جس کے نتیجے میں پیوتر پیتر ووچ ہوا میں لہرا کر زمین بوس ہو چکا تھا۔ زمین سے ٹکراتے ہی ڈھانچے کی ساری ہڈیاں مالا کے دانوں کی طرح جدا جدا ہو کر ہڈیوں کے ایک چھوٹے سے ڈھیر میں تبدیل ہو گئیں۔

آدریان کے اس عمل کا ردِ عمل لاشوں میں مکھیوں کے چھتے کی بھنبھناہٹ کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔ وہ اپنے مہمان ساتھی کے ساتھ ایسے اہانت آمیز اور گستاخانہ سلوک کو اپنی بے عزتی مان کر بُری طرح مشتعل ہو اُٹھے۔ اب وہ سب مل کر چیخ و پکار میں مصروف آدریان کو سخت سست اور برا بھلا کہہ رہے تھے۔ جس میں دشنام طرازی اور کوسے بھی شامل تھے پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید مشتعل ہو کر اُس پر ٹوٹ پڑتے آدریان کے ہوش و حواس نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ وہ لمحے بھر کے لئے ہوا میں لہرایا اور گارد کے رٹائرڈ سارجینٹ ''پیوتر پتیر ووِچ'' کی ہڈیوں کے ڈھیر پر خود بھی ڈھیر ہو گیا۔

سورج کی زرد کرنیں بستر پر محوِ خواب تابوت ساز آدریان کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھیں کہ اچانک ہی وہ نیند سے بیدار ہو گیا۔ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو پایا کہ خادمہ سماوار میں کوئلے دہکا رہی تھی ''پیوتر پتیر ووِچ'' اس کے دماغ میں تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ اب اُس نے اپنے دل میں یہی فیصلہ کیا کہ مصلحتاً خاموش رہ کر خادمہ کو لب کشائی کا موقع دے۔ ہو سکتا ہے اِسی سے رات کے ہولناک واقعات کا کوئی سُراغ ہاتھ آ جائے۔

''آپ ابھی تک پڑے سو رہے ہیں۔؟ عکسینا نے اُسے صبح کا گاؤن پہننے کے لئے دیتے ہوئے کہا۔

''ہمارا پڑوسی درزی اور پولیس کانسٹیبل بھی آپ سے ملنے آئے تھے مگر آپ کو سوتا پا کر میں نے انہیں واپس لوٹا دیا۔''

''کیا کوئی مرحومہ تریوخینا کے یہاں سے بھی آیا تھا؟ آدریان نے دریافت کیا۔

''کیا ہوا تریوخینا کو؟ آپ نے انہیں مرحومہ کہا ہے کیا وہ گذر چکی ہیں ۔؟''

''بڑی احمق ہو تم۔'' آدریان نے جھلا کر کہا۔ کل ان کی میت کا سامان تم نے میرے ساتھ تیار کیا تھا۔ تم جیسے بھلکڑوں سے تو اللہ بچائے۔''

''جناب والا! لگتا ہے آپ کا دماغ چل گیا ہے۔ شاید رات کی شراب کا خمار ابھی تک باقی ہے۔ جناب کل کوئی نہیں مرا۔ کوئی جنازہ نہیں اُٹھا۔ تریوخینا زندہ ہیں کل ساری رات آپ جرمن پڑوسی کی تقریب میں مشغول رہے۔ پھر آدھی رات کو شراب میں مدہوش گھر واپس آئے، بستر پکڑ لیا جب سے لے کر اب تک آپ بستر پر ہی موجود ہیں۔ نہ میں نے آپ کے ساتھ میت کا سامان اکٹھا کیا ہے اور نہ آپ گھر سے باہر نکلے ہیں۔''

''کیا تم سچ کہہ رہی ہو عکسینا؟ آدریان نے سکون کا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

''کیا واقعی دعوت سے واپسی کے بعد میں کہیں نہیں گیا۔؟''

''آپ کہیں نہیں گئے۔ دعوت کے بعد سے اب تک یہیں ہیں۔'' عکسینا نے مکرر کہا۔

''ہاں ٹھیک کہتی ہو تم مگر تم ابھی تک کوئلے ہی دہکا رہی ہو اور میں چائے کی طلب میں مرا جارہا ہوں۔ جلدی کرو۔ چائے رکھ کر لڑکیوں کو میرے پاس بھیج دینا۔ سمجھ گئیں؟۔''

............☆☆☆............

☆......لیوطالسطائی

☆......رفیق شاہین

خوش نصیب قاتل

فرانس اور اٹلی کی مشترکہ سرحد کے قریب اور بحرروم کے ساحل پر ''موناکو'' نام کی ایک چھوٹی سی حکومت قائم ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے شہر کی آبادی اس ننھے منے ملک کی آبادی سے کہیں زیادہ ہوگی۔ عام اندازے کے مطابق اس مملکت کی آبادی ساٹھ ہزار نفوس سے زائد نہیں ہے۔ اس کا رقبہ بھی اس قدر تنگ اور محدود ہے کہ اگر اس ملک کی زمین کو وہاں کے باشندوں میں یکساں تقسیم کیا جائے تو ہر باشندے کے حصے میں جو زمین آئے گی وہ ایک ایکڑ سے زیادہ نہ ہوگی۔ لیکن یہ سچائی اپنی جگہ اٹل ہے کہ اس کھلونا نما مملکت کا ایک باقاعدہ بادشاہ ہے جو بڑی آن بان اور شان سے حکمرانی کر رہا ہے۔ اس بادشاہ کا عالیشان محل ہے۔ باقاعدہ دربار لگتا ہے اور اس کے زیر تحت وزراء، جنرل اور بشپ سبھی لوگ ہیں۔ یہاں تک کہ اس ملک کی اپنی فوج بھی ہے۔ بھلے ہی اس کی تعداد صرف ساٹھ تک ہی محدود ہے۔ دیگر ممالک کی طرح وہاں بھی رعایا سے شراب، اسپرٹ اور تمباکو پر ٹیکس وصول کر کے شاہی خزانے کا پیٹ بھرا جاتا ہے۔ جس سے بادشاہ اور وزراء کی شان و شوکت قائم ہے۔ عیش و عشرت کی محفلیں سجتی ہیں اور ملک چل رہا ہے اُس آمدنی کا ذریعہ کچھ اور ہی ہے اور وہ ذریعہ ہے ملک میں قائم قمار خانے اور جوا گھر جن سے سرکار کو موٹی موٹی رقومات وصول ہوتی ہیں۔ جوا گھروں میں جوئے کے شائقین عموماً ''رولٹ'' کھیلتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ کوئی جیتے یا ہارے جوا گھر کے مالک کھلاڑیوں سے طے شدہ پر سنٹیج (Percentage) سے ہی اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔ یہ غیر معمولی اور بڑی کمائی ہوتی ہے اس میں سے ایک بڑی رقم الگ کر کے یہ لوگ بادشاہ کی تجوریاں بھرتے رہتے ہیں اور بالخصوص جوئے کی اسی رقم سے ''موناکو'' کی حکومت بڑی شان سے چل رہی ہے۔ یورپ کے کئی ممالک میں اور جرمنی میں بھی ایسے ہی قمار خانے حکومتوں کے استحکام میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے تھے۔ مگر چند سال پہلے وہاں کی حکومتوں نے ان جوا گھروں کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ کر جوا گھروں کی ممنوع قرار دے دیا تھا۔ کیونکہ یہ بات اچھی طرح ثابت ہوگئی تھی کہ معاشرے کی تباہی و بربادی میں سب سے بڑا ہاتھ انہی جوا گھروں کا تھا کہ لوگ اپنی قسمت آزمائی کے لئے جوا کھیلتے اور کچھ پانے کی لالچ میں گرہ کی رقم بھی گنوا بیٹھتے۔ پھر وہ گنوائی ہوئی رقم کو پھر سے حاصل کرنے کے جنون میں قرض کی رقم داؤ پر لگاتے اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے لہٰذا وہ عالم مایوسی میں یا تو خود کو گولی مار لیتے یا پھر ندی میں ڈوب کر مر جاتے۔ ایسے ہی واقعات سے متاثر ہو کر جرمن کے عوام نے وہاں کی حکومت کو جوا خانے ممنوع قرار دینے پر مجبور کر دیا ''موناکو'' سے عوام میں اتنی جرأت کسی میں بھی نہ تھی کہ بادشاہ کو ملک میں جوا گھر بند کرنے پر مجبور کر سکے۔ سارے یورپ میں جوا گھر بند ہو گئے تھے اس لئے اب ''موناکو'' ہی جواریوں کی جنت بنا ہوا تھا۔ جوئے کے شائقین دور دور سے یہاں کھینچے چلے آتے۔

اس طرح اس کھلونا نما حکومت کی جوئے میں مونا پلی یا ساکھ بن گئی تھی اور اب یہاں کا بادشاہ پہلے سے بھی زیادہ دولت مند ہو گیا تھا۔ اب اس کی شان و شوکت اور ٹھاٹھ باٹھ ہی نرالے تھے۔ قطع نظر اس کے کہ جواری جیتتے یا ہارتے مگر ان کی وجہ سے بادشاہ کی تجوریاں نوٹوں کی موٹی موٹی گڈیوں سے بھرتی ہی چلی جارہی تھیں۔ مگر ایسا بھی نہ تھا کہ بادشاہ جوئے کی برائیوں سے واقف ہی نہ ہو مگر وہ کرتا بھی کیا تخت و تاج اور حکومت کا بھرم قائم رکھنے کے لئے جو دولت درکار تھی وہ اسے جوئے گھر ہی فراہم کر سکتے تھے۔ شراب، اسپرٹ اور تمباکو کے محصول سے تو کوئی خاص رقم حاصل ہوئی نہیں تھی۔

بادشاہ شاہی تقریبات اور درباری اجلاس منعقد کر کے کسی کو انعام سے نوازتا، کسی کو سزا کا حکم سناتا تو کسی کا معافی نامہ بھی قبول کر لیتا تھا اُس نے محکمہ عدلیہ اور قانون ساز ادارے بھی اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔ علاوہ ازیں وہ مشاورتی جماعت کا بھی سرپرست بنا ہوا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پیمانے پر ہی سہی مگر اُس نے مطلق اُلعنان شہنشاہوں کے سارے دستور اور شاہی رسم و رواج اپنا رکھے تھے۔

چند ہی سال پہلے کی بات ہی کہ بادشاہ کی مملکت مونا کو میں ارتکاب قتل کا یک واقعہ ظہور پذیر ہو گیا۔ اس ملک کی رعایا عام طور پر امن و سکون کی زندگی جینا پسند کرتی ہے۔ اس سے قبل یہاں کبھی کوئی ایسا مجرمانہ فعل سرزد نہیں ہوا تھا۔ منصفین عدلیہ نے بہیمانہ قتل کے اس واقعے کو بڑی سنجیدگی سے لیا اور ایک ہنگامی اجتماع طلب کر کے متفقہ طور پر قاتل کے خلاف سزائے گردن زدنی کا حکم صادر کر دیا اور جب عدلیہ کا یہ فیصلہ بادشاہ کے سامنے رکھا گیا تو اس کی تائید میں موت کے پروانے پر شاہ نے بھی اپنے دستخط مرتسم فرما دیئے۔

اب سزائے قتل کو عملی جامہ پہنانے میں حکومت کو جس سنگین مسئلے کا سامنا کرنا پڑا وہ یہ تھا کہ اس ملک میں نہ تو آلہ قتل (Guillotine) موجود تھا اور نہ ہی کوئی پیشے ور جلاد جو قتل کے مجرم کا سر دھڑ سے الگ کر سکے۔ معاملے کی نزاکت پر غور کرتے ہوئے وزرائی کابینہ نے خیال ظاہر کیا کہ کیوں نہ ہم حکومت فرانس سے مراجعت کر کے دریافت کریں کہ کیا وہ ہمیں آلہ گردن زدنی (GUILLOTINE) اور ایک ماہر مشاق جلاد مہیا کرنا پسند کرینگے؟ اور یہ بھی کہ اس کے بدلے میں ہمیں کتنی رقم ادا کرنی ہوگی؟ بہر کیف درخواست آگے بڑھا دی گئی جس کا جواب فرانس کی طرف سے یہ دیا گیا کہ آلہ گردن زدنی اور سر تن سے جدا کرنے والا جلاد آپ کو برآمد کرا دیے جائینگے۔ بشرطیکہ بطور معاوضہ سولہ ہزار فرانک آپ ہمیں پیشگی بھجوا دیں۔

جب فرانس کا جوابی کتوب بادشاہ سلامت کے حضور میں پیش کیا گیا تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ''سولہ ہزار فرانک؟'' اس نے متحیرانہ لہجے میں چونک کر کہا۔ ''نہیں اس کام کے مقابلے میں یہ رقم بہت زیادہ ہے۔ اس کی ادائیگی ہمارے بس کی بات نہیں۔ اس سے ہماری رعایا کے ہر فرد پر دو فرانک سے بھی زائد رقم کی ادائیگی کا بوجھ پڑ جائے گا جس کی ادائیگی ممکن نہ ہو سکے گی۔ اس سے خطرہ یہ بھی ہے کہ کہیں ملک میں بغاوت کی آگ نہ بھڑک اُٹھے۔'' لٰہذا فوراً ہی معاملہ مشاورتی کاؤنسل میں پیش کر کے مسئلے کا حل تلاش کرنے پر زور دیا گیا کہ موجودہ نازک صورتحال میں کونسا اقدام بہتر ہوگا؟ اور ہمیں کیا کرنا چاہیے۔؟ اور پھر تا دیر غور و خوض کے بعد سارے مشاور اس بات پر ایک رائے ہو گئے کہ اگر یہ درخواست

اٹلی کے شہنشاہ سے کی جائے تو کامیابی یقینی ہے۔ فرانس سے ملی ناکامی کا سبب تو یہ تھا کہ وہاں جمہوری حکومت قائم ہے جو شاہ اور شہنشاہیت دونوں سے بیزار ہے جب کہ اٹلی کا معاملہ اس برعکس ہے وہ شاہوں اور حکمرانوں کی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے کیوں کہ وہ خود بھی اپنے ملک کا تاجدار شہنشاہ ہے۔ اس لئے قوی امید ہے کہ یہاں سے معاملہ سستے میں نپٹ جائے گا۔ لہٰذا فی الفور درخواست روانہ کر دی گئی اور ایک ہفتے کی مختصر عدت میں اٹلی سے جواب بھی آ گیا۔

اطالوی حکومت نے لکھا تھا کہ آپ کو بہترین آلہ قتل اور تجربے کار کارجلاد برآمد کرتے ہوئے ہمیں دلی خوشی حاصل ہوگی۔ امید ہے ہماری خدمات کے عوض آپ کو ہمیں بارہ ہزار فرانک اور سفر کا خرچ پیشگی عطا کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہوگا۔"

یہ خرچہ محض کہنے کی حد تک فرانس سے کم تھا جب کہ کچھ بھی کم نہ تھا اور اب بھی ملک کے ہر باشندے پر دو فرانک سے رائد رقم کے بھگتان کا بوجھ لد جاتا۔ چنانچہ مجلس مشاورت کو پھر سے معاملہ سستے میں نپٹانے کی سبیل ڈھونڈ نکالنے پر مجبور کیا گیا۔

آپس کے بحث و مباحثے کے بعد یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ مجرم کا سر کاٹنا کوئی بڑا کارنامہ تو ہے نہیں۔ یہ کام تو ہماری فوج کا کوئی بھی سپاہی بآسانی انجام دے سکتا ہے۔ لہٰذا فوراً ہی جنرل کو طلب کر کے اس سے کہا گیا۔

"جنگ کے میدان میں آپ کے فوجی خون خرابہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ نہ جانے کتنوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں۔ نہ جانے کتنوں کے سر تن سے جُدا کر دیتے ہیں لہٰذا یہ کام آپ ہی انجام دیجئے اور کسی سپاہی سے مجرم کا سر کٹوا دیجئے۔"

جنرل لاجواب ہو کر سیدھا سپاہوں کے بیرک میں پہنچا اور کہا "تم لوگ آپس میں طے کر لو کہ مجرم کا سر کون کاٹے گا۔؟ تم لوگ میدان جنگ میں بھی کام کرتے چلے آ رہے ہو۔ اس کام میں تو جوابی حملے کا خطرہ بھی نہیں ہے۔ اس لئے اس کام کو انجام دینا ذرا بھی مشکل نہ ہوگا۔" اس پر سپاہوں نے پُر احتجاج لہجے میں کہا "میدان جنگ میں اپنے تحفظ کی خاطر دشمن کو تہہ تیغ کرنا پڑتا ہے۔ جنگ جدل کی بات اور ہے اور عالم امن کی اور۔ یہ ہم جیسے نااہل اور ناتجربے کار فوجیوں کے بس کا نہیں ہے۔"

جنرل کے مصر ہونے پر بھی کسی بھی سپاہی نے یہ کام کرنے کی حامی نہیں بھری۔ جنرل کے منفی جواب پر وزاء پھر سے پریشان ہوا ٹھے کہ مسئلہ حل ہو تو کیسے ہو۔ جب اُن کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی تو انہوں نے اپنے سر آئی بلا کمیشن، کمیٹی کے ارکان کے سر منڈھ دی۔ بالآخر بہت سے دماغوں کی زور آزمائی کے نتیجے میں مسئلے کا حل نکل ہی آیا۔

وہ حل یہ تھا کہ مجرم کی مزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا جائے اور چونکہ مملکت کو فرمانروا کے لیے رحم کی بنیاد پر ایسا کرنا معمولی بات ہے اس لئے اس میں کوئی اڑچن بھی نظر نہیں آئی۔

جب یہ تجویز بادشاہ سلامت کے حضور میں پیش کی گئی تو انہوں نے اس پر عمل کرنے کی بخوشی منظوری دے دی۔

اب اگر کوئی مشکل تھی تو یہ تھی کہ اب تک یہاں کوئی ایسا قید خانہ تعمیر نہیں ہوا تھا جس میں عمر قید

کے سزا یافتہ مجرم کو قید کیا جا سکے۔ یہاں ایک معمولی درجے کی حوالات ضرور تھی جس میں معمولی درجے کے ملزمان عارضی طور پر آتے جاتے رہتے تھے۔ پھر بھی ایک مناسب سی جگہ تلاش کر کے پولیس والوں نے اس نوجوان مجرم کو ایک کال کوٹھری میں ڈھکیل دیا ساتھ ہی حکم شاہی کے مطابق دروازے پر ایک محافظ (GUARD) تعینات کر دیا گیا۔ محافظ کا کام مجرم پر نظر رکھنے کے علاوہ قیدی کے لئے شاہی محل سے کھانا لے کے آنا بھی تھا۔

قیدی کی اس کال کوٹھری میں تنہا زندگی بسر کرتے ہوئے ایک ایک دن ہفتہ اور مہینہ کر کے پورا ایک سال بیت چکا تھا۔ بادشاہ سلامت جب سال کے اواخر میں اپنی آمدنی اور خرچ کا حساب لگانے کے لئے کھاتہ کھول کر بیٹھے تو خرچے کی ایک نئی مد دیکھ کر چونک پڑے۔ خرچے کی اس نئی مد کا ذمے دار کوئی اور نہیں بلکہ وہی قیدی نوجوان تھا اور یہ اخراجات معمولی نہ تھے۔ قیدی کو بہترین کھانا شاہی محل سے پہنچایا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک سال کی مدت میں قیدی پر جو خرچہ ہوا تھا وہ چھ سو فرانک تھا اور پریشان کن بات تو یہ تھی کہ قیدی پہلے سے زیادہ جوان صحت مند اور خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ لگتا تھا پچاس سال سے پہلے تو وہ ہرگز بھی مرنے والا نہیں ہے۔

بادشاہ نے اپنے نورتنوں سے کہا۔

''اس بدمعاش پر بہت خرچہ ہو رہا ہے۔ آپ لوگ اس بے جا خرچے میں کمی کرنے کی کوشش کیجئے۔'' چنانچہ وزراء نے یکجا ہو کر اپنے دماغ کے گھوڑے ریس کے میدان میں اُتار دیئے۔ اسی درمیان ایک دانشور کو دور کی سوجھی تو اس نے فوراً ہی اپنا فارمولہ سب کے سامنے رکھ دیا۔ اُس نے کہا۔

''قیدی کے اخراجات میں تخفیف کا سب سے سہل طریقہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ کال کوٹھری کے پہرے سے گارڈ کو ہٹا دیا جائے۔'' اس پر دیگر وزراء نے اعتراض کیا اور کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔؟ پہرہ اُٹھ جانے پر کیا قیدی فرار نہ ہو جائے گا۔؟''

''یہ تو اور بھی اچھا ہے۔'' وزیر باتدبیر نے فخر یہ کہا۔ ''یہی تو میں چاہتا ہوں۔''

سارے وزیر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ پھر کچھ سوچ کر سب نے اس کی تائید میں سر ہلا دیا۔ وزیر باتدبیر کی تجویز کو بادشاہ سلامت کی منظوری بھی حاصل ہو گئی۔ شاہی فرمان کی تعمیل میں فی الفور قیدی پر سے گارڈ کو ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد سب کی نظر قیدی پر مرکوز ہو گئی کہ دیکھیں پہرہ ہٹ جانے کے بعد اُس کا رد عمل کیا ہو گا؟ اور پھر پردہ غیب سے جو منظر ظہور میں آیا وہ یہ تھا کہ جب قیدی نے ڈنر کے وقت گارڈ غائب پایا تو دروازہ کھول کر وہ شاہی محل جا پہنچا۔ وہاں اس نے شاہی باورچی خانے سے اپنا کھانا لیا اور پھر سے اپنی کال کوٹھری میں آ گیا۔ اندر آ کر اُس نے دروازہ بند کیا۔ پھر اطمینان سے کھانا کھانے کے بعد اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ دوسرے اور تیسرے دن بھی یہی ہوتا رہا کہ کھانے کے وقت وہ محل پہنچ جاتا اور وہاں سے اپنا کھانا لے کر اپنی کال کوٹھری میں آ کر اندر سے دروازہ بند کر لیتا۔ قید سے فرار کی سہولیت حاصل ہونے کے باوجود بھی راہ فرار اختیار کرنے میں اُس نے ذرا بھی دلچسپی نہیں دکھائی تھی اور پھر جب آگے بھی اس کا یہی معمول رہا تو اس پر نظر رکھنے والوں کا پیمانہ صبر آخر چھلک ہی گیا۔ انہوں نے یکجا ہو کر پھر سے مشورہ کرنا شروع کر دیا کہ قیدی کو مائل فرار کرنے کے لئے کیا حکمت عملی اختیار کی

جائے؟۔ چند منٹ کے غور و فکر کے بعد سب نے ایک ہی بات کہی کہ "قیدی کو واضح طور پر بتا دیا جائے کہ اب ہم نہیں چاہتے کہ وہ بطور قیدی کال کوٹھری میں قید رہے۔ ہماری طرف سے وہ آزاد ہے۔ اب وہ جہاں چاہے بلا روک ٹوک جا سکتا ہے۔"

دوسرے ہی دن عدلیہ کے وزیر کے حکم کی تعمیل میں اُسے عدالت میں جج کے روبرو پیش کر دیا گیا جج نے کہا۔

"اے نوجوان! اب تو گارڈ بھی تمہاری نگرانی نہیں کرتا ہے پھر بھی تم کال کوٹھری سے فرار نہیں ہوئے۔ آخر کیوں؟ تم اب آزاد ہو اور اپنی مرضی سے کہیں بھی آجا سکتے ہو۔ بادشاہ سلامت کو بھی تمہارے چلے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لہٰذا کہ تم کو جہاں اچھا لگے تم چلے جاؤ اور آزادی کو زندگی بسر کرو۔"

"حضور جج صاحب! قیدی نے کہا۔ 'مانا کہ میرے چلے جانے پر بادشاہ سلامت کو مجھ سے شکایت نہ ہوگی۔ مگر میں جاؤں تو کہاں جاؤں۔ باہر جا کر میں آخر کروں گا کیا۔ آپ نے میرے کردار کو داغدار کر ڈالا ہے۔ عدالت سے ملی یہ سزا میری پیشانی کا کلنک بن گئی ہے۔ اب میں جہاں بھی جاؤں گا زمانے والوں سے مجھے نفرت ہی ملے گی۔ لوگ حقارت سے میرے منہ پر تھوکیں گے۔ میں اب پیٹ پالنے کے لئے ہاتھ پاؤں ہلانے کے لائق بھی نہیں رہا ہوں۔ آپ لوگوں نے میرے ساتھ نہایت بُرا سلوک کیا ہے۔ جب آپ کی عدالت نے مجھے سزائے موت کا حکم سنا ہی دیا تھا تو پھر موت دی کیوں نہیں؟ ہر چند کہ یہ ظلم ہے مگر اس کے خلاف میں نے احتجاج تک نہیں کیا۔ پھر آپ نے مجھ پر مزید زیادتی یہ کی کہ سزائے موت کے فیصلے کو عمر قید میں تبدیل کر دیا اور میرے لئے کھانا لانے کے لئے ایک گارڈ مقرر کر دیا۔ پھر ایک خاص مدت گزر جانے کے بعد آپ نے اسے بھی میرے پاس سے ہٹا دیا۔ مجبوراً مجھے ہی کھانے کے لئے شاہی محل جانا پڑا اور آپ کی اس زیادتی کی آپ سے شکایت تک نہ کی اور آپ مجھ پر مزید ظلم یہ ڈھا رہے ہیں کہ مجھے یہاں سے بھگا دینا چاہتے ہیں۔ جج صاحب! اب آپ کچھ بھی کر لیجئے آ کا یہ ظلم تو میں ہرگز بھی برداشت نہیں کروں گا۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا! اب یہ کال کوٹھری ہی میرا گھر ہے۔"

اب پھر سے مجلس مشاورت طلب کر کے قیدی سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے مشورہ کئے جانے لگے اور بالآخر قیدی کو رضامند کرنے اور اس سے اپنی بات منوانے کا تیر بہدف نسخہ ہاتھ آ ہی گیا اور اس سے سب متفق بھی ہو گئے۔ وہ فُول پُروف نسخہ یہ تھا کہ شاہی خزانے سے اس کے لئے اگر پینشن مقرر کر دی جائے تو وہ ضد چھوڑ کر ہمارا کہا ماننے کے لئے بلا عذر تیار ہو جائے گا۔

بادشاہ نے بھی سمجھ لیا کہ قیدی ضدی ہے بلا کچھ لئے دیئے وہ ٹلنے والا نہیں ہے۔ اس لئے اس نے چھ سو فرانک سالانہ پینشن اس کے نام جاری کر دی۔ قیدی نے پینشن کے کاغذات کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد حکومت کو بھی جتا دیا کہ "پینشن میں رکاوٹ نہیں آنی چاہیے ورنہ وعدہ شکنی کو میں اپنا حق سمجھوں گا۔"

تو اس طرح سر درد بنا یہ سنگین مسئلہ بالآخر حل ہو ہی گیا۔ اُسے سالانہ پینشن کی ایک تہائی رقم اس کی موناکو سے روانگی کے وقت پیشگی ہی ادا کر دی گئی تھی۔

ریل کے سفر میں پندرہ منٹ گزرتے ہی وہ موناکو کی سرحد کو پار کر کے وہیں سرحد کے قریب

ہی جا کر بس گیا۔ وہاں اُس نے سستے داموں زمین خرید کر اس میں طرح طرح کے پھلوں کے باغات کھڑے کر لئے۔ باغبانی کا پیشہ اُسے راس آ گیا تھا۔ اُس کی پھلوں سے لدی گاڑیاں جب پھلوں کی منڈیوں میں خالی ہو کر واپس آتیں تو اس کی تجوری نوٹوں کی موٹی موٹی گڈیوں سے بھر جاتی تھی۔ آج کل وہ بڑی فارغ اُلبالی اور خوشحالی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ مقرر وقت پر ''موناکو'' جا کر بڑی پابندی سے اپنی پینشن وصول کرتا ہے ساتھ ہی اپنا شوق پورا کرنا بھی کبھی نہیں بھولتا۔ وہ چاہے ہارے یا جیتے وہ موناکو میں دو فرانک سے زیادہ کبھی نہیں کھیلتا۔ جوئے گھر سے نکل کہ وہ سیدھا اپنے گھر پہنچتا ہے۔ وہ بڑے امن و سکون کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

اور سچی بات تو یہ ہے قتل کا ارتکاب اُس نے کیا ہی نہیں تھا۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی اپنا دفاع نہ کرنے پر عدالت نے اسے سزائے موت کا حکم سنایا تھا۔ جو بعد میں سزائے عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا۔

☆......لیوطالسطائی

☆......رفیق شاہین

عرفان

شہر ولادیمیر میں ایوان دمتریچ عکسنیوف نام کا ایک نوجوان تاجر رہتا تھا۔ اُس کی دو دو کانیں اور ایک ذاتی مکان تھا

عکسنیوف ایک حسین وجمیل اور پُرکشش نوجوان تھا جس کے کھتئی رنگ کے بال گھنگھریالے تھے۔ وہ فطرتاً بڑا زندہ دل اور خوش مزاج انسان واقع ہوا تھا اور اُسے گانے نچانے کا بھی شوق تھا۔ اپنی نوخیز جوانی کے ابتدائی دنوں میں اُسے پینے پلانے کی لت لگ گئی تھی۔ زیادہ پی لینے پر وہ لڑنے پر بھی آمادہ ہو جاتا تھا مگر شادی ہو جانے کے بعد اُس نے مئے نوشی ترک کر دی تھی۔ تہوار وتقاریب کے موقع پر ضرور تھوڑی سی پی لیتا تھا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ عکسنیوف نے ''نزھی'' کے میلے میں شرکت کے لئے گھر سے روانگی کے وقت اہل خانہ کو ''گڈبائی'' کہا تو اُس کی بیوی نے اسے سفر سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''پلیز دمتریچ! میرا کہنا مانو اور آج کا سفر ترک کر دو میں نے تم سے متعلق بڑا بُرا خواب دیکھا ہے۔''

عکسنیوف نے بآواز بلند قہقہہ لگا کر کہا۔

''واہ! تمہارے خواب کا کیا کہنا۔ تم کیا مجھے بچہ سمجھتی ہو کہ میں میلے میں جاؤں گا تو وہاں گم ہو جاؤں گا؟''

''یہ سب تو میں جانتی نہیں۔'' اُس کی بیوی نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''میں تو بس اتنا ہی جانتی ہوں کہ جو خواب میں نے دیکھا ہے وہ اچھا نہیں ہے۔ میں نے دیکھا کہ میلے سے واپسی پر جب تم نے اپنا ہیٹ اُتارا تو تمہارے سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔''

''یہ تو کوئی برا خواب نہیں ہے۔ سفید بال تو بزرگی اور عظمت کی علامت ہوتے ہیں۔ میلے میں میرے سامان کا بکنا بھی تو بہت ضروری ہے اور پھر خرید کر تمہیں تحائف بھی تو پیش کرتے ہیں۔''

بہر حال اُس نے بیوی کو الوداع کہا اور فوراً ہی گھر سے نکل کر سفر پر روانہ ہو گیا۔

اور پھر جب وہ نصف راستہ طے کر چکا تھا کہ اتفاقاً اُس کی ملاقات ایک جان پہچان کے تاجر سے ہو گئی۔ پھر شب بسری کیلئے وہ دونوں ہی ایک قریبی سرائے میں داخل ہو گئے۔ وہاں انہوں نے مل بیٹھ کر چائے نوش کی اور پھر ایک دوسرے سے ملحق اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے چلے گئے۔

عکسنیوف کو اپنی منزل پر پہنچنے کے لئے شدید سردی میں علی الصبح ہی سفر پر نکلنا تھا اور پھر وہ ویسے بھی جلدی سونے اور جلدی اُٹھنے کا عادی تھا اس لئے بستر پر دراز ہوتے ہی نیند کی آغوش میں سما گیا۔

سویرے پو پھٹتے ہی اُس نے کوچوان کو گاڑی تیار رکھنے کی تاکید کی اور خود سرائے کے عقب میں واقع سرائے مالک کے کوٹیج میں جا پہنچا۔ وہاں اُس نے سرائے کا بل چکایا اور واپسی میں گاڑی پر سوار

ہوکر آگے کی منزل کے لئے روانہ ہوگیا۔

پھر تقریباً پچیس میل کا فاصلہ طے کرکے بھوکے گھوڑوں کو خوراک بہم پہنچانے اور اُنہیں سُستانے کا موقع فراہم کرنے کے خیال سے اُس نے گاڑی رکوالی۔ پھر اُس نے گھوڑوں کی گھاس ڈالنے کے لئے کوچوان کو اشارہ کیا اور خود اپنا سامان لیے کر سامنے نظر آنے والی ایک سرائے میں داخل ہو گیا۔ جہاں ایک کمرے میں اُس نے اپنا ساز و سامان رکھا اور پھر سرائے کے دروازے کے قریب ہی سرسبز لان میں تازہ دم ہونے کے لئے بیٹھ گیا۔ پھر اُس نے پورچ میں جا کر گرم جائے بھیجنے کا آرڈر دیا اور واپس لان میں آکر گٹار بجانے لگا۔

دفعتاً کھنٹیاں نجاتی ہوئی ایک تین گھوڑوں والی گاڑی ''ترویکا'' (TROIKA) سرائے کے دروازے پر آکر رُکی جس میں سے ایک پولیس آفیسر اور دو باوردی سپاہی نمودار ہوکر سیدھے عکسینوف کے پاس آکر رُکے اور آتے ہی اس پولس آفیسر نے اُس سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اُس نے اس کا نام دریافت کیا اور پوچھا کہ وہ کہاں سے آرہا ہے۔؟ عکسینوف نے جو سچ تھا سادگی سے بتا دیا اور پوچھا۔

''کیا آپ لوگ جائے نوش کرنا پسند کرینگے۔؟''

پولیس آفیسر نے اُس کی پیشکش کو نظر انداز کرتے ہوئے اُس پر پے در پے سوالوں کی جھڑی سی لگادی۔ اُس کے سوالات کچھ اس قسم کے تھے۔ ''رات تم نے کہاں بسر کی تھی؟ تم اکیلے تھے یا تمہارے ساتھ کوئی تاجر بھی تھا؟ کیا تم نے صبح سویرے اُس تاجر کو دیکھا تھا؟ تم نے تڑکے ہی سرائے کیوں چھوڑا تھا؟''

عکسنیوف یہ سوچ کر حیران و پریشان تھا کہ پولیس آفیسر کو کیا ہوگیا ہے جو مجھ سے غیر متعلق ایسے عجیب و غریب سوال پوچھنے چلا جا رہا ہے جیسے میں کوئی مجرم ہوں اُس نے سادگی و سچائی سے کام لے کر اس کے ہر سوال کا جواب دے تو دیا مگر پُر احتجاج لہجے میں یہ بھی کہہ دیا کہ ''آپ مجھ سے ایسے سوال پر سوال کئے جا رہے ہیں جیسے میں کوئی چور اُچکا یا لٹیرا ہوں۔ کیوں...... آخر کیوں۔؟''

''تمہارے اُس کیوں کا جواب میرے پاس یہ ہے کہ میں ایک ضلع پولس افیسر ہوں۔'' اُس نے کہا۔ ''تم نے جس تاجر کے ساتھ پچھلی سرائے میں شب بسر کی تھی صبح کے وقت اُس کا گلا کٹا ہوا تھا اور ہم نے اُس کے لاش برآمد کی ہے اور اب ہمیں آپ کے سامان کی تلاشی لینی ہوگی۔''

اس کے ساتھ ہی دو پولیس والے بڑے تیزی سے اُس کے کمرے میں داخل ہو گئے اور اس کا سارا سامان اُلٹ پلٹ کر تلاشی لینی شروع کر دی۔ اسی دوران پولیس آفیسر کو اُس کے بیگ سے ایک خون آلود چاقو برآمد ہوگیا۔ وہ وہیں سے چلایا۔

''یہ چاقو کس کا ہے۔؟''

عکسنیوف نے جیسے ہی اپنے بیگ سے برآمد ہونے والا خون سے رنگا چاقو پولیس آفیسر کے ہاتھ میں تھما دیکھا حیرت اور خوف کے ملے جلے احساس سے اُس کی آنکھوں کے حلقے وسیع ہو گئے اور اُس کے چہرے پر زردی چھا کر رہ گئی۔

''بتایئے! چاقو پر یہ کس کا خون لگا ہے۔؟''

پولیس آفیسر کا لہجہ کرخت تھا اور وہ بڑی چھبتی ہوئی نگاہوں سے اُسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔
علکسینوف بری طرح سٹپٹا کر رہ گیا۔ اُس کے ہونٹ جیسے سل کر رہ گے تھے۔ بمشکل اُس کے منہ سے مری مری سی آواز نکلی۔

''نہیں......نہیں جانتا میں...... مجھے نہیں معلوم...... کچھ بھی نہیں معلوم۔''

پولیس آفیسر نے لفظ چبا کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تمہیں سب کچھ معلوم ہے تم ہی نے اس چاقو سے اس تاجر کا گلا کاٹا ہے اور تم ہی اُس کی موت کے ذمے دار ہو۔ سرائے کا صدر دروازہ اندر سے مقفل تھا اور وہاں سوائے تمہارے کوئی بھی نہیں تھا اور اب مقتول کے خون میں رنگے چاقو کا تمہارے بیگ سے برآمد ہونا اور یہ قاتلوں جیسی تمہاری حرکات و سکنات اس بات کا پختہ ثبوت ہیں کہ تم تاجر کے قاتل ہو اور اب یہ ناٹک بند کرو مسٹر صاف صاف بتاؤ قتل کیوں کیا اور کتنی رقم لوٹی ہے۔؟''

علکسینوف قسموں پر قسمیں کھا کر اپنی صفائی دینے لگا کہ تاجر کے قتل سے اُس کا کیسا بھی اور کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ وہ معصوم اور بے گناہ ہے۔۔

تاجر کے ساتھ چائے پینے کے بعد اُس نے دوبارہ اُسے دیکھا تک نہیں تھا اور اب جو اسکے پاس آٹھ ہزار رُوبل کی رقم ہے وہ اُس کی اپنی ہے اور یہ چاقو بھی اُس کا اپنا نہیں ہے۔

وہ یہ سب کہہ تو رہا تھا مگر اُس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ زبان لڑکھڑا رہی تھی اور اس کے اُڑے رنگ اور فق چہرے کو دیکھ کر تو یہی لگ رہا تھا جیسے وہ جھوٹ بول رہا ہے اور وہی گنہگار ہے۔ مجرم ہے اور یہ قتل اُسی نے کیا ہے۔ پولیس آفیسر نے سپاہوں کو حکم دیا۔ ''دیکھتے کیا ہو اس شخص کی مشکیں کس کر اور اچھی طرح رسی سے جکڑ کر اسے گاڑی میں ڈال دو۔''

اپنے آفیسر کا حکم بجالانے میں سپاہوں نے ذرا بھی تاخیر نہیں کی اور اُس کے ہاتھ پاؤں باند کر فوراً گاڑی میں پٹک دیا۔ اپنی بے بسی و بے چارگی اُس سے سہی نہیں گئی تو اُس کا دل بھر آیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اُس کی رقم اور ساز و سامان ضبط کر لیا گیا اور اسے ایک قریبی شہر کی جیل میں قید کر دیا گیا۔

پھر جب اُس کے شہر ولادیمیر میں اس کے چال چلن کے بارے میں تحقیق کی گئی تو شہریوں نے بتایا کہ پہلے تو وہ آوارہ گردی ضرور کرتا تھا اور لڑائی جھگڑوں میں بھی ملوث ہو جاتا تھا مگر بعد میں سدھر کر وہ ایک بہت اچھا اور شریف انسان بن گیا تھا۔

اُس پر مقدمہ چلایا گیا کہ اُس نے ''ریاضان'' کے ایک تاجر کو قتل کر کے اُس کی بیس ہزار رُبل کی رقم لوٹی تھی۔

شوہر کی گرفتاری کی خبر جب اُس کی بیوی کو ملی تو وہ ٹوٹ کر رہ گئی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا جو اُس کی ڈھارس بندھا سکے۔ گود کا بچہ ابھی شیر خوار ہی تھا اور دوسرے بچے نے حال ہی میں اپنے پیروں پر چلنا سیکھا تھا۔ وہ یہ سوچ کر پاگل ہوئی جا رہی تھی کہ اگر اُس کے شوہر کو سزا ہو گئی تو وہ ان معصوم نونہالوں کی پرورش کیسے کریگی۔؟

شوہر کو مصیبت سے چھٹکارہ دلانے کی جب اُسے کوئی تدبیر سجھائی نہ دی تو اپنے دونوں بچوں

کو ساتھ لے کر وہ اس شہر میں جا پہنچی جہاں کی جیل میں اُس کا شوہر قید تھا۔
پہلے تو جیل والوں نے اسے شوہر سے ملنے کی اجازت دینے سے ہی انکار کر دیا۔ مگر وہ ان کے پیروں میں سر رکھ کر روئی دھوئی تو جیل کے آفیسر ون کا دل پسیج گیا اور انہوں نے ملاقات کی اجازت دے دی۔ اُسے اُس کے شوہر کے پاس لے جایا گیا۔ وہاں جب اُس نے اپنے شوہر کو قیدیوں کے لباس میں ملبوس اور آہنی طوق و سلاسل میں جکڑا ہوا دیکھا تو وہ پچھاڑ کھا کر زمیں پر ڈھیر ہو گئی۔ بڑی دیر بعد وہ ہوش میں آئی۔ ہوش میں آتے ہی پہلے تو اس نے اپنے نونہالوں کی سنبھالا پھر دروازے کی آہنی سلاخوں کو تھام کر شوہر سے دریافت کیا کہ ایسا کیونکر ہوا۔؟ شوہر نے خود پر گزری اپنی ساری آپ بیتی من و عن سُنا دی۔
پھر اس سے پوچھا کہ اس مصیبت سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے کونسی تدبیر کارگر ہو سکتی ہے۔؟
عکسینوف نے کہا کہ ایک ہی طریقہ ہے کہ شہنشاہ زار سے رحم کی درخواست کی جائے کہ ایک بے گناہ کو بربادی سے بچایا جائے۔'' اُس پر اُس کی بیوی نے آنسو بہاتے ہوئے اُسے بتایا کہ یہ کوشش تو وہ پہلے ہی کر چکی ہے مگر زار نے اُس کے پیٹیشن کو مسترد کر دیا ہے۔ یہ سُن کر قیدی نے بڑی بے بسی اور لاچاری۔ سے اپنا سر جھکا لیا۔ اُسے مایوسی دیکھ کر اس کی بیوی نے گلوگیر آواز میں کیا۔'' کاش! جب اپنے خواب کے حوالے سے میں نے آپ کو جانے سے روکا تھا اُس وقت اگر آپ نے میری بات مان لی ہوتی تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔'' پھر اس نے پیار سے اپنے شوہر کے بالوں میں اُنگلیاں پھراتے ہوئے کہا۔
''ڈیروانیا پلیز! مجھے بتاؤ کیا لالچ میں آ کر تم ہی تو کچھ ایسا نہیں کر بیٹھے ہو۔؟''
اس پر وہ اپنا چہرا اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا کر زور زور سے رونے لگا اُس نے روتے ہوئے کہا۔
''اس سے زیادہ بدنصیبی کی بات اور کیا ہوگی کہ غیر تو غیر میری بیوی تک مجھے شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔'' تبھی جیل کے حوالدار نے اعلان کر دیا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔'' آپ اپنے بچوں کو لے کر یہاں سے چلی جایئے۔''
قیدی نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے بیوی بچوں کی آخری بار الوداع کہا اور وہ روتی سسکتی اپنے بچوں کو سنبھالے اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔
عکسینوف نے سوچا میں اپنی بیوی تک کی نظروں میں مشکوک ہوں سوائے خدا کے سچائی کیا ہے کوئی نہیں جانتا۔ دنیا عدالت سے انصاف کی توقع فضول ہے۔ سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اُسی علیم الخبیر خدا سے رحم و کرم کی درخواست کی جائے۔ وہی انصاف کریگا۔ اس کے بعد اُس نے کوئی رحم کی درخواست نہیں پیش کی۔ اُس نے اب اپنا معاملہ پوری طرح خدا کو سونپ دیا تھا اور اُسی کے آسرے پر لو لگائے بیٹھا تھا۔ ادھر جیل کے حکام کو حکم صادر ہوا کہ سزا یافتہ مجرم عکسینوف کی کوڑے سے اس وقت تک پٹائی کی جایئے جب تک کہ اُس کا سارا جسم لہولہان نہ ہو جائے۔ لہٰذا چمڑے کی دھجیوں اور لوہے کی تاروں کو باہم بٹ کر بنائے گئے ایک خاص قسم کے دُرے (KNOUT) سے اُسے بڑی بے رحمی سے پیٹا گیا جس سے وہ بُری طرح زخمی اور لہولہان ہو گیا۔ پھر جب لمبے وقفے کے بعد اُس کے زخم مندمل ہو گئے تو اُسے کانوں اور کھدانوں میں محنت و مشقت کرنے کے لئے سائبیریا میں جلاوطن کر دیا گیا۔
اُسے سائبریا میں محنت و مشقت کرتے اور قید و بند کی دردناک زندگی گزارتے ہوئے چھبیس

سال جیسا طول طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ عکسینوف اب ایک دوسرا ہی عکسینوف نظر آنے لگا تھا۔ اُس کے سر کے بال اب تک سفید ہو گئے تھے۔ اس کے چہرے پر بھی ایک سفید رنگ کی داڑھی نے قبضہ جما لیا تھا اور وہ سُوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ اُس میں نہ اب وہ پہلے جیسی زندہ دلی باقی بچی تھی اور نہ وہ شوخی۔ پشت پر تھوڑا کُب اُبھر آنے پر اب وہ تن کر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ چال مدھم ہو گئی تھی اور اب وہ بولتا بھی کم کم ہی تھا قہقہہ لگانا تو وہ کبھی کا بھول چکا تھا۔ البتہ وہ خدا کی حمد اور مناجات کے معاملے میں بالکل بھی سُست اور لاپرواہ نہیں تھا۔

قید و بند کے دوران اس نے جوتا سازی کا جو ہنر سیکھ لیا تھا اُسی کی بدولت اُس کے پاس کچھ پیسے جمع ہو گئے تھے۔ اُن سے اُس نے کتاب ''اللہ والوں کا طرزِ حیات'' (The Lives of the Saints) خرید لی۔ جب بھی قید خانے میں مناسب روشنی ہوتی وہ اُس کے مطالعے میں غرق ہو جاتا تھا۔ وہ تشریح اور تفسیر بھی بیان کر دیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ قید خانے کے چرچ میں وہ بائبل کی تفسیر بیان کرنے لگا تھا۔ اُس کی آواز میں آج بھی جان تھی جب وہ حمد و مناجات کو لے اور ترنم سے پیش کرتا تو اس کی دلکش اور سریلی آواز سے سننے والے جھوم جھوم اُٹھتے تھے۔

اُس کے تہذیب و شائستگی اور عجز و انکسار کی ادا وہاں کے عہدیداران اور آفیسران کو دل سے پسند تھی۔ اُس کے ساتھی بھی اُس کی بہت عزت کرتے تھے اور انہوں نے اُسے ''راہب'' اور ''دادا'' کے القاب عطا کر رکھے تھے اور وہ انہیں القاب سے اُسے پکارا کرتے تھے۔ جب عہدیداران کو قیدیوں کو کوئی ہدایت دینی ہوتی تھی تو اپنی بات کو عکسینوف کی زبانی ہی وہ قیدیوں تک پہنچانا بہتر سمجھتے تھے۔ اسی طرح جب کبھی قیدی آپس میں بھی لڑ جھگڑ بیٹھتے تو وہ لڑائی کی وجہ اور قصوروار کا سُراغ لگانے کی ذمے داری بھی عکسینوف کو ہی سونپ دیتے تھے۔

جیل میں بیوی سے آخری ملاقات کے بعد اُسے اس کی کوئی خیر خبر نہیں مل پائی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس کے بیوی بچے زندہ بھی ہیں یا مر گئے۔

ایک دن سزا یافتہ مجرموں ایک نیا گروہ قید خانے میں داخل ہوا۔ شام کے وقت پُرانے قیدیوں نے نو وار قیدیوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور پوچھنے لگے کہ وہ کس علاقے اور کن کن شہروں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے جرائم کی نوعیت کیا ہے؟۔ سوال کرنے والوں کے جمگھٹ میں عکسینوف بھی ان کی باتوں پر کان لگائے خاموش بیٹھا تھا۔ اُن نو وار مجرموں میں ایک مجرم جو ساٹھ سال کا تو ضرور ہی ہوگا، خاصہ سرو قد تھا، چہرے پر خشخشی سفید داڑھی چپکی ہوئی تھی، وہ پُرانے قیدیوں کو اپنی گرفتاری اور قید کی وجوہات بیان کر رہا تھا۔

''تو سنو دوستو! واقعہ یہ ہے کہ کسی کام سے میرا جلدی گھر پہنچنا بے حد ضروری تھا لہٰذا میں نے اپنے ایک دوست کی سلیج (بلا پہیوں والی برف پر پھسل کر چلنے والی گاڑی) سے یہ سوچ کر گھوڑا کھول لیا کہ فوری واپسی پر اسے پھر سے سلیج میں جوت دونگا کہ اُسی وقت نہ جانے کہاں سے وہاں پولیس والے آدھمکے اور مجھے گرفتار کر لیا۔ میں نے لاکھ کہا کہ جس کا یہ گھوڑا ہے وہ میرا دوست ہے میرا چوری کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر اُنہوں نے میری ایک نہ مانی اور اپنی ہی کہتے رہے کہ میں نے چوری کی ہے اور میں چور ہوں اور حیرت در حیرت تو مجھے اس بات پر ہے کہ بلا کچھ کہے ہی انہوں نے میری پیشانی پر مجرم کا ٹھپہ لگا دیا اور

پچھلے دنوں جب کہ حقیقتاً میرے قدم لڑکھڑا گئے تھے اور میں کچھ غلط سلط کر بیٹھا تھا۔ تب انہوں نے مجھ سے بازپُرس تک ضروری نہ سمجھی ہا...... ہا...... ہا۔''

''آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں۔'' ایک نے پوچھا ''بھائی لوگو! میں شہر ولادیمیر کا رہنے والا ہوں۔ وہاں میرا خاندان آباد ہے۔ نام میرا امکر ہے اور لوگ مجھے سیمیونچ کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔

اپنے شہر ولادیمیر کا نام اُس کے منہ سے سُن کر عکسینوف بُری طرح چونک پڑا۔ اس کے دل میں ہلچل سی مچ گئی۔ اُس نے بڑے پُر اشتیاق لہجے میں اُس سے دریافت کیا۔

''بھائی سیمیونچ مہربانی فرما کر کیا مجھے بتانا پسند کرینگے کہ کیا اپنے شہر میں آپ کچھ عکسینوف خاندان کے بارے میں بھی جانتے ہیں۔؟''

''جانتا ہوں اور خوب جانتا ہوں دوست! عکسینوف کے بیٹے ثروت مند ہیں۔ عیش کر رہے ہیں اور اُن کا باپ ایک تاجر کے قتل کے جرم کی پاداش میں یہاں سائبیریا میں عمر قید کے دن گزار رہا ہے۔ مگر دادا جی! آپ بھی تو کچھ بتائیں کہ آپ کو یہاں کیوں آنا پڑا۔؟'' اُس نے پوچھا۔

عکسینوف کو اپنے بارے میں کچھ بتانا مناسب نہیں لگا اس لئے اُس نے اتنا ہی کہا۔

''میرے گناہوں نے مجھے اس انجام کو پہنچایا ہے کہ میں چھبیس برس سے یہاں قید و بند کی حالت میں زندگی کے دن گزار رہا ہوں۔''

''مگر کیسے گناہ؟ آخر اُن کے کچھ نام بھی تو ہونگے ؟''

''بُری باتوں کے ذکر سے بُری یادیں تازہ کرنا اچھا نہیں سمجھتا۔ اس لئے اتنا ہی کافی سمجھتا ہوں کہ اسی کا حقدار ہوں۔'' اتنا کہہ کر عکسینوف نے خاموشی اختیار کر لی۔ مگر اُس کے ایک ساتھی نے اسے بتایا دیا کہ کیسے کسی نے تاجر کو قتل کیا، کیسے خون آلود چاقو اُس کے بیگ میں رکھ دیا، کیسے اُسے غلط سزا دی گئی اور کیسے بے گناہ ہوتے ہوئے یہاں سائبیریا اُسے آنا پڑا۔

عکسینوف کے بارے میں یہ تمام باتیں جان کی سیمیونچ نے اُسے بڑے غور سے نظر بھر کر دیکھا اور زور سے اپنی ران پر ہاتھ مار کر بولا۔

''حیرت کی بات ہے حیرت کی۔'' اُس نے عکسینوف سے مخاطب ہو کر کہا۔

''دادا کم از کم یہی بتا دیجئے کہ اس وقت آپ کی عمر کیا ہے۔؟ بجائے اس کے کہ عکسینوف کچھ کہتا اس کے ایک ساتھی نے سیمیونچ سے دریافت کیا کہ کس بات پر اُس نے حیرت کا اظہار کیا ہے؟ کیا عکسینوف کو اُس نے پہلے بھی دیکھا تھا اور وہ اُس کی عمر کیوں جاننا چاہتا ہے۔؟

مگر سیمیونچ نے اُس کے کسی بھی سوال کا جواب نہ دے کر صرف اتنا ہی کہا۔

''وطن سے دور ہزار ہا میل کے فاصلے پر ہم سب کی ملاقات حیرت انگیز نہیں تو اور کیا ہے۔''

اُس کی باتوں سے عکسینوف کو شبہ ہونے لگا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ شخص تاجر کے قاتل کو جانتا ہو۔ اسی خیال سے اُس نے کہا۔

''مگر سیمیونچ! نہ جانے کیوں مجھے گمان ہو رہا ہے کہ تاجر کے قتل کے بارے میں تم ضرور کچھ

جانتے ہو اور آج سے پہلے بھی تم نے مجھے کہیں دیکھا تھا۔''

''دنیا تو افواہوں کی ہے آماجگاہ۔'' سیمیونچ نے کہا۔

''ہوسکتا ہے اس واقعے کی بھنک میرے کانوں میں بھی پڑی ہو مگر ایک مدّت کے بعد تک اُسے ذہن میں محفوظ رکھنا کم از کم میرے بس کی بات تو ہے نہیں۔''

''غور کرو۔'' عکسینوف نے کہا۔ ''غالباً تم جانتے ہو کہ تاجر کا اصلی قاتل کون تھا۔''

''اصلی قاتل۔؟ مکر سیمیونچ نے فضا میں قہقہہ بُلند کر کے کہا۔

''جس کے بیگ سے مقتول کے خون میں تر بتر چاقو برآمد ہوا اس کے علاوہ اور کوئی قاتل ہو ہی نہیں سکتا۔ سمجھے دادا! وہی اصلی قاتل ہے۔ وہی جس کے بیگ سے آلہ قتل برآمد ہوا تھا اور ہاں یہ ضرب المثل تو آپ نے بھی سنی ہوگی کہ پکڑا جائے تو چور اور نہ پکڑا جائے تو شاہ! کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے بیگ میں اگر کوئی خون آلود چاقو رکھنا چاہے تو آپ کیوں رکھنے دینگے؟ نہیں رکھنے دینگے! اسی لئے تو میں نے کہا ہے کہ جس کے بیگ سے چاقو برآمد ہوا ہے وہی اصلی قاتل ہے۔

مکر کے منہ سے یہ پُر مکر جملے سُن کر عکسینوف کا شک یقین میں بدل گیا کہ ہو نہ ہو اسی نے تاجر کا قتل کیا تھا اور میرے بیگ میں خون آلودہ چاقو رکھنے والا بھی یہی سیمیونچ ہے۔ وہ وہاں سے اُٹھ کر دوسری طرف چلا گیا۔

ساری رات اُس نے جاگ کر گذار دی۔ اُس کا سکون چین درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ عجیب عجیب خیال اُس کے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ میلے میں جاتے وقت اسے اپنی بیوی کا روکنا یاد آرہا تھا، جیل کی ملاقاتِ میں اسکا پچھاڑ کھا کر زمین پر گرنے کا کا منظر بھی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ سرتاپا مجسم رُوپ میں اُس کے سامنے کھڑی اُس کے حالِ زار پر آنسو بہا رہی تھی اور اُسے اس کی سسکیوں کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ اُس نے گھر میں جس حال میں اپنے نونہالوں کو دیکھا تھا وہ اسی حالت میں بھاگتا دوڑتا نظر آرہا تھا اور دوسرا شیر خوار اپنی ماں کی چھاتی سے چپکا ہوا تھا۔ اُس کے تصور میں وہ دن بھی روشن ہوا اُٹھے جب وہ جوان تھا، خوبصورت تھا، زندہ دل تھا، خوش مزاج تھا۔ اس کی نظروں میں وہ منظر بھی نمایاں ہوا اُٹھا جب گرفتاری سے قبل وہ سرائے کے لان میں بیٹھا گٹار بجا رہا تھا۔ اُسے مقام بھی واضح طور پر نظر آرہا تھا جہاں طوق وسلاسل میں جکڑے سزا یافتہ مجرموں کے حصار وامصار میں چمڑے اور لوہے کے تاروں کو باہم بٹ کر بنائے ہوئے گوڑے KNOUT سے بے رحم جلاد نے اس کے سارے جسم کی کھال ادھیڑ کر اسے لہولہان کر دیا تھا۔ عمر کے چھبیس سال ضائع گزر جانے اور ضعیف ہو جانے کے باوجود بھی قید و بند کا سلسلہ تا ہنوز جاری و ساری تھا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ اس عتاب وعذاب کے عقوبت خانے سے رہائی حاصل کرنے کے لئے وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا آپ ہی گھونٹ کر دکھ درد کی اس المناک زندگی سے نجات حاصل کر لے۔

ناگاہ اُس کا ذہن مکر سیمیونچ کی سمت منتقل ہو گیا۔

''تو یہی ہے وہ شخص جس کی بدولت میں اس حال کو پہنچا ہوں۔'' غصے کے شدید دباؤ سے اس دانت اور مُٹھیاں بھینچ گئیں۔ ایکا ایکی جذبات اُمنڈ نے اور دل میں انتقام کے شعلے بھڑک اٹھنے پر اس کا ضمیر بآواز بلند کہہ رہا تھا کہ جس شخص نے اُسے اس مصیبت میں ڈالا ہے اُس کے خاندان کو تباہ برباد کیا ہے

وہ کیوں نہ اُسے موت کے گھاٹ اتار دے بھلے ہی اُسے اس کے لئے اپنی جان گنوانی بڑے۔ وہ اس ذہنی انتشار و خلفشار کے بھنور سے باہر نکلنے اور پُرسکون ہونے کے لئے ساری رات جاگ کر عبادتِ الٰہی ہی میں مشغول رہا۔ مگر کسی پہلو اُسے چین نصیب نہ ہوا اور وہ بے سکون ہی رہا۔

وہ مکر سیمیونچ کی صورت تک دیکھنا نہیں چاہتا تھا اس۔ لئے اُس نے سارے دن نہ اُس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا اور نہ ہی اُس سے ہمکلام ہونے کی کوشش کی۔

اسی ذہنی اضطراب و خلفشار کے عالم میں دو ہفتے گزر گئے تھے عکسینوف سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے۔؟

ایک رات جب وہ شدید بے چینی کے عالم میں قید خانے کے آس پاس چہل قدمی میں مصروف تھا کہ تبھی اُسے لگا کہ جہاں کبوتروں کی کابک نما شیلف کی الماریوں میں قیدی سوتے اور آرام کرتے ہیں اُدھر سے غبار اُڑ اُڑ کر ادھر آ رہا ہے۔ وہ ایکا ایکی رُک کر اسی طرف دیکھنے لگا کہ تبھی شیلف کے عقب سے سیمیونچ نمودار ہوا اور اُس نے دیکھ لیا کہ عکسینوف اُسی کو گھور کر دیکھ رہا ہے اور اُس نے اُسے اچھی طرح پہنچان لیا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کا چہرا خوف سے زرد ہو گیا۔ پھر ما قبل اس کے کہ اُسے نظر انداز کر کے عکسینوف اپنا قدم آگے بڑھائے کہ سیمیونچ نے لپک کر اس کا بازو تھام لیا اور بڑی روزدارانہ سرگوشی میں کہا ''قید سے فرار ہونے کے لئے میں چند روز سے دیوار میں سُرنگ کھود رہا ہوں۔ سویرے جب قیدی اپنے کام پر نکل جاتے ہیں میں برآمد شدہ مٹی کو اپنے بوٹوں میں بھر بھر کر سڑک پر پھینک آتا ہوں۔ یہ بات بڑے میاں! میں نے تمہیں بتا تو دی ہے مگر تم اپنا منہ بند ہی رکھنا اس سے تمہیں بھی فرار ہونے کا موقع مل جائے گا اور اگر تم نے منہ گھولنے کی حماقت کی تو میں تمہیں بھی اس میں ملوث کر لوں گا اور مرے ساتھ تمہیں بھی کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ مگر اس کی نوبت آئے گی ہی نہیں اس سے پہلے میں خود ہی تمہیں ہلاک کر دونگا۔

دشمن کے یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھمکی دینے پر عکسینوف کا شدید نفرت غصے سے خون کھول اُٹھا اور وہ کانپ کر رہ گیا۔ اُس نے جھٹک کر اپنا بازو اُس کی گرفت سے چھڑا لیا اور کہا۔

''میری قید خانے سے فرار ہونے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور تم مجھے کیا مارو گے تم تو جیتے جی مجھے پہلے ہی مار چکے ہو اور ہاں مکر! مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے۔''

اگلے دن سویرے جب محنت کش قیدی کانوں کھدانوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب پہر یدار سپاہوں کو شک گزرا کہ ایک قیدی بار بار سڑک کی طرف کیوں جاتا ہے اس پر اُنہوں نے قید خانے کا باریکی سے معائینہ شروع کر دیا اور بالآخر دیوار میں سُرنگ برآمد ہو گئی۔

قید خانے کے حکام نے یہ جاننے کیلئے کہ یہ سنگین جرم کس نے کیا ہے؟ سارے قیدیوں سے بازپُرس کی مگر سبھی قیدیوں کا جواب ایک ہی تھا کہ اس بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے ہیں۔ اُن میں جو راز سے واقف تھے انہوں نے اس لئے نہیں بتایا کہ اُن کے ساتھی کو کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ بالآخر ناظم قید خانہ نے عکسینوف کو ایک سیدھا سچا انسان سمجھ کر اُس سے کہا۔

عکسینوف! تم ایک خدا پرست، نیک اور سچے انسان ہو، تم خدا کو حاضر ناظر جان کر بتاؤ کہ سُرنگ کھودنے کا یہ انتہائی سنگین جرم کس نے کیا ہے؟''

عکسینوف کچھ اس طرح بے حس و حرکت اور خاموش کھڑا رہا جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ ناظم قید خانہ عکسینوف کا اور عکسینوف ناظم کا چہرا تکے جا رہا تھا۔ عکسینوف کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں اور اُس کے دست و لب مسلسل لرز رہے تھے۔ ایک بار اُس نے سوچا بھی کہ وہ کیوں ایک ایسے شخص کی پردہ داری کر رہا ہے جس نے اسے لامحدود اور جان لیوا اذیتوں اور صعوبتوں میں مبتلا کیا ہے، اُس کے خاندان کو برباد کیا ہے، اُسے اُس کے کیفر کردار پہنچانے کے لئے وہ اُس کا نام بتا کیوں نہیں دیتا مگر فوراً ہی ایک دوسرے خیال نے اُسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اُس نے سوچا ہو سکتا ہے کہ اُس کا شبہ بے بنیاد ہو کہ وہی تاجر کا قاتل ہے اور اُسی نے مجھے پھنسایا ہے اور پھر ایسا کر کے مجھے حاصل کیا ہوگا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ جو کچھ میں کھو چکا ہوں وہ مجھے دوبارہ کبھی نہ مل سکے گا۔

''ہاں بڑے میاں! بتایئے نا! دیوار میں سُرنگ کس نے کھودی ہے۔؟''

عکسینوف نے ایک نگاہ مکر سیمیونچ کے چہرے پر ڈال کر کہا۔

''حضور والا! اس معاملے میں اپنی زبان کھولنے سے میں عاجز ہوں خدا کی رضا بھی یہی ہے کہ میں لب کشائی سے گریز ہوں۔ میں آپ کی تحویل میں ہوں اس کے لئے آپ جو چاہیں مجھے سزا دے سکتے ہیں۔

ناظم قید خانہ نے اُس سے سچ اُگلوانے کیلئے اُس پر ہر ممکن دباؤ ڈالا مگر وہ ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ لہٰذا معاملہ آگے کے لئے ملتوی ہو گیا۔

یہ اُسی رات کا واقعہ ہے۔ عکسینوف اپنے بستر پر آنکھیں موندے لیٹا تھا کہ یکبارگی اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے بستر پر کوئی اور بھی ہے جو وہاں خاموشی سے آکر بیٹھ گیا ہے۔ اُس نے آنکھیں کھول کر اُسے اندھیرے میں غور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ وہ مکر سیمیونچ ہی تھا۔ اُس نے اُسے حیرت سے دیکھ کر پوچھا۔

تم یہاں کیوں آئے تو؟ اور مجھ سے اب اور کیا چاہتے ہو۔؟''

وہ کچھ نہ بولا تو عکسینوف اُٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر پوچھا۔

''تم نے بتایا نہیں کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔؟ اُس سے پہلے کہ میں گارڈ کی مدد لینے پر مجبور ہو جاؤں پلیز! مجھے پریشان مت کرو اور خود ہی یہاں سے چلے جاؤ'' اُس کی بات کو سُنا ان سُنا کر کے سیمیونچ نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

''ایوان دمتریچ عکسینوف! پلیز! مجھے معاف کر دو۔''

''بھلے آدمی تم مجھ سے کس بات کی معافی طلب کر رہے ہو۔؟''

''میں ہی تھا۔'' سیمیونچ نے کہا۔ ''ہاں وہ میں ہی تھا جس نے تاجر کا گلا کاٹ کر لہو میں رنگا چاقو تمہارے بیگ میں رکھ دیا تھا۔ میرا ارادہ تو یہی تھا کہ میں تمہیں بھی قتل کر دوں اور تمہاری ساری نقدی لوٹ کر اپنی کر لوں مگر عین وقت پر جب میں تمہارا گلا کاٹنے ہی والا تھا کہ باہر سے آنے والی شور و غل کی آواز سن کر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور چاقو تمہارے بیگ میں چھپا کر کھڑکی کے راستے وہاں سے فرار

ہو گیا۔"

عکسینوف پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ تادیر وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ یہ بات سُن کر وہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ سیمونچ شیلف سے اُتر کر زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور گڑگڑا کر کہا۔

"ایوان دمتریچ! آپ میرا گناہ معاف کر دیجئے۔ خدا اور اس کے حبیب یسوع کے صدقے میں اپنے گناہگار کو معاف کر دیجئے۔ میں اقبال جرم کرتا ہوں کہ ہاں میں نے ہی اس نوجوان تاجر کا قتل کیا تھا۔ مگر اب آپ فکر نہ کیجئے۔ آپ کو قید سے رہائی بھی ملے گی اور آپ پھر سے اپنے گھر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ سکون سے رہنا۔"

"تم نے کس آسانی سے کہہ دیا کہ بیوی بچوں میں سکون سے رہنا۔" عکسینوف نے بڑے ملول و افسرہ لہجے میں کہا۔ "تمہاری بدولت اب جب کہ میں چھبیس برس قید بند کی اذیتیں جھیل کر نوجوان سے ایک بوڑھا کھوسٹ ہو گیا ہوں، میری بیوی مر چکی ہے اور میرے بیٹے جو یہ بھی نہیں جانتے کہ میں اُن کا کون ہوں اور کہاں کس حال میں ہوں، باہر کی دنیا میں اب میرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں وہاں گیا تو کہاں پناہ ملے گی مجھے؟"

سیمونچ ندامت اور پچھتاوے کے شدید احساس سے زمین سے سر ٹکرانے لگا۔

اُس نے ہاتھ جوڑ کر عاجزانہ انداز میں روتے ہوئے کہا۔

"میں مانتا ہوں کہ مجھ بدبخت ملعون نے آپ پر بہت ظلم ڈھائے ہیں اور میں آپ کا گنہگار ہوں پھر بھی ایوان دمتریچ اپنے اس گناہگار کو معاف کر دیجئے۔ جب خطرناک اور مہلک کوڑے سے جلاد میرے جسم کی کھال اُدھیڑ رہا تھا مجھے آج مصیبت سے بچایا ہے۔ مجھ پر رحم کیا ہے۔ تم واقع عظیم ہو۔ خدا کے لئے مزید ترس دکھا کر مجھ نمرود مجھ مردود کو دل سے معاف کر دو۔" اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اُسے روتا دیکھ کر عکسینوف کا بھی دل بھر آیا وہ بھی رونے میں اُس کا ساتھ دینے لگا۔ پھر بدقت اُس نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"اگرچہ تمہارے مقابلے میں کئی گنا زیادہ تکلیفیں اور اذیتیں میں نے جھیلی ہیں مگر میں نے اور میرے خدا نے تمہیں معاف کیا۔ اب تمہیں رونے دھونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جاؤ اور اپنے بستر پر جا کر آرام کرو۔"

اُسے لگا ایسا کرنے سے اُس کا دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ مگر گھر واپس جانے کی تمنا اُس کے دل میں کبھی کی دم توڑ چکی تھی۔ اُس نے اب قید خانے کو ہی اپنا گھر اور اپنی کائنات مان لیا تھا۔ اُسے اگر انتظار تھا تو بس اس بات کا تھا کہ موت آئے اور پیار سے اُسے اپنے گلے لگا لے۔

عکسینوف کے منفی خیالات جان کر بھی مگر سیمونچ نے تاجر کے قتل کے سلسلے میں اقبال جرم کر لیا تھا۔

لیکن جس دن عکسینوف کی رہائی کا پروانہ قید خانے کے حکام کو موصول ہوا اُس سے چند ہی گھنٹے پہلے اُس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی اور وہ قید حیات سے رہا ہو چکا تھا۔

..................☆☆☆..................

☆......نگوئین کانگ ہوآن

☆......رفیق شاہین

باؤلی بلا

گاؤں کے پردھان نگوونگ کو ضلع حفاظتی شعبہ پولیس کے ایک سپاہی نے سرکاری حکم نامہ پیش کیا جس کا مضمون اس طرح تھا۔

گاؤں ''نگولوونگ'' کے ذمے داران کو ضلع مجسٹریٹ کی جانب سے یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ بحکم صوبائی سرکار ضلع اسٹیڈیم میں صف اوّل کی ٹیموں کے درمیان مورخہ ۱۹ر مارچ کو فٹبال میچ ہونے جا رہا ہے۔ جس کے لئے ذیل میں دی گئیں ہدایات پر عمل ناگزیر ہوگا۔

گاؤں کے ذمے داران کو اپنے گاؤں سے گاؤں والے بطور تماشبین لے کر اسٹیڈیم پہنچنا ہوگا۔ جن گاؤں والوں نے پچھلے ماہ اسٹیڈیم کی افتتاحی تقریب میں شرکت کی تھی وہ میچ میں شرکت سے مستثنیٰ قرار دیئے جاتے ہیں۔

میچ میں شرکت کرنے والوں کے لئے صاف ستھرا اور چست لباس پہن کر آنا ضروری ہے۔ سبھی شرکا نظم وضبط کو بروئے کار لا کر اسٹیڈیم کے ماحول کو خوشگوار بنائے رکھنے میں اپنی اپنی ذمے داریاں نبھائینگے۔ اسٹیڈیم میں عمائدین شہر اور معزز مہمان حضرات بھی موجود ہونگے۔ تماشائیوں کو میچ کے اوقات میں وقفے وقفے سے تالیاں بجا کر کھلاڑیوں کو داد سے نوازنا بھی اُن کی ذمے داری ہوگی۔

''نگولوونگ'' گاؤں کے ذمے داران کو اپنے سو آدمی پانچ جھنڈوں تلے قطار اندر قطار لے کر صبح دس بجے تک اسٹیڈیم میں پہنچ جانا ہوگا۔ جو لوگ سرکاری حکم کے خلاف ورزی کے مرتکب پائے جائینگے۔ ان کے خلاف ضلع انتظامیہ کارروائی کریگی۔ انہیں ان کی موجودہ عہدوں سے برطرف بھی کیا جاسکتا ہے۔

''لیتھا نگ'' (ضلع مجسٹریٹ)

میچ نے قابل رحم صورت بنا کر گڑ گڑاتے ہوئے پردھان سے کہا۔

''حضور!......سرکار!......رحم کیجئے۔ مجھے اس جھنجھٹ میں نہ ڈالئے......کل مجھے ڈپٹی صاحب کے حضور میں پیشی دینی ہے...... میں اُن کا مقروض ہوں...... نہ گیا تو وہ مجھے پیٹ پیٹ کر میرا کچومر بنا دینگے......میرا دم ہی نکال دینگے۔''

پردھان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ انہوں نے اپنی ٹوٹی چھڑی اس طرف تانتے ہوئے اسے گھور کر دیکھا اور گھڑک کر بولے۔

''اچھا تو یہ پاجی تو ہے۔ میچ میں نہ جانے کے بہانے بناتا ہے۔ کیوں مرنے کے کام کرتا ہے؟ کہتا ہے مجھے جھنجھٹ میں مت ڈالو۔ کیا تجھے معلوم نہیں یہ میرا حکم نہیں، سرکار کا ہے۔ سرکار کا آدیش ملا ہے مجھے۔''

''میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں۔ رحم کرو مالک! میری مجبوری کو سمجھو، اس بار تو مجھے چھوڑ ہی دو

ورنہ میں ڈپٹی صاحب کی نظر میں آجاؤنگا۔ وہ غضب میں آجائینگے تو غضب ہو جائے گا۔ وہ میری اور میرے گھر والوں کی مٹی خراب کر کے رکھ دینگے۔

''کچھ نہیں ہوگا۔ تو ڈپٹی صاحب کا کام دوسرے دن بھی تو کر سکتا ہے۔''

''سرکار میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں۔ میں تو اُن کے زرخرید غلاموں جیسا ہوں۔ مائی باپ! میں انہیں ناراض کرنے کا خطرہ کیسے مول لے سکتا ہوں۔ میرے بیوی بچوں کو روٹی وہی تو دیتے ہیں۔ ہماری زندگی کے مالک تو وہی ہیں۔''

''تم بھوکوں مرجاؤ یا پیٹ بھری حالت میں مرو مجھے اس سے کیا۔ یہ تمہارا درد سر ہے تم ہی جانو مجھے حکم اُوپر سے ملا ہے۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ بے چوں چرا بات مان لو ورنہ میرا کیا ہے تمہارے خلاف رپورٹ لکھ کر آگے بڑھا دونگا پھر روتے پھرنا۔ جیل میں سڑو گے تو نانی یاد آجائے گی۔ تب سمجھو گے حکم عدولی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔''

''میں تو بس بھیک مانگ رہا ہوں، رحم کی بھیک مانگ رہا ہوں حضور! آپ کے پاؤں پڑتا ہوں۔ میرے بچوں کی زندگی اُن کا دانہ پانی سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ رحم کرو، خدا کے لئے ترس کھائیے مجھ مجبور ولاچار پر۔''

''مانگتے رہو بھیک، اس در سے تمہیں کچھ ملنے والا نہیں ہے۔ میں تم پر رحم کرونگا تو مجھ پر رحم کون کریگا؟ مجھے بھی تو اپنی جان بچانی ہے۔ تم خود ہی تیار ہو جاؤ تمہارے حق میں اچھا رہے گا ورنہ سمجھ لو میرے کارندے تمہیں رسیوں میں جکڑ کر اسٹیڈیم میں لے جائینگے۔

شریمتی مائی نے حویلی میں آتے ہی اپنے ساتھ لائے چھالی کے تازہ ٹوٹے گچھے کو احتیاط سے میز پر رکھا اور دروازے کے پاس ہی اکڑوں بیٹھ کر کہنے لگی۔

''مائی باپ! میرا گھر والا بیمار ہے، بہت زیادہ بیمار ہے چلنے پھرنے کے بھی قابل نہیں ہے۔ وہ آپ کی ڈانٹ سے بہت ڈرتا ہے اس لئے خود نہیں آیا اور پھر وہ بیمار بھی تو ہے کیسے آتا اس لئے مجھے بھیجا ہے۔ حضور! آپ گاؤں کے بااثر پردھان ہیں اس پر رحم کریں، اُسے شہر جانے سے بچالیں۔ معاف کر دیں اُسے۔''

''دیکھ یہ حکومت کا معاملہ ہے میرا نہیں ہے۔ اُسے بتا دینا کہ اُسے جانا ہی پڑیگا۔''

''آپ اُس کے بدلے میں گاؤں کا کوئی دوسرا آدمی بھی تو لے سکتے ہیں۔ اس کے بجائے کسی دوسرے کو بھیج دینا۔ یقین کرو وہ سچ مچ بیمار ہے۔ وہ اگلی بار چلا جائے گا، بس اس بار اُسے بخش دو۔''

''جانا تو خیر اُسے ہی پڑیگا بھلے ہی وہ راستے میں دم توڑ دے۔ آخر ضلع کے حاکم کا حکم ہے۔ اگر سبھی اسی طرح بہانے بنانے لگیں تو میچ کیا کتے اور بلیاں دیکھیں گی؟''

''وہ تو اگر تندرست ہوتا تو چلا بھی جاتا۔ شہر بھی یہاں سے نو میل کے فاصلے پر ہے پھر چلچلاتی دھوپ بھی تو ایسی پڑتی ہے کہ چیل، انڈہ چھوڑ دے۔ ایسے میں وہ کیا زندہ بچے گا، مر ہی جائے گا حضور!''

''مرجائے تو مرجائے۔ میں اس میں کچھ نہیں کر سکتا، بہت ہو گیا، اب اور دماغ مت چاٹو۔''

''کیا باز ارنہ جا کر اس کے بدلے میں میچ دیکھنے جا سکتی ہوں۔؟''

''کیا کہا تم میچ دیکھو گی؟ بالکل نہیں، تم عورتوں کی جگہ فٹ بال کا اسٹیڈیم نہیں گھر کا رسوئی گھر ہے۔

''ہائے اللہ! کیا قیامت ہے۔ یہ بلائے ناگہانی دیوانی کہاں سے آ گئی۔ اب نہ بچ پائے گا میرا گھر والا، اب تو وہ مر ہی جائے گا۔''

وہ سسک سسک کر رونے لگتی ہے۔

چمکیلی آنکھوں والی مادام بنھ حویلی میں آ کر اپنی لمبی لمبی پلکیں جھپکاتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''ہماری طرف سے یہ تحفہ قبول فرمائے پردھان جی۔ میں یہ دکھنے کے لئے یہاں آئی ہوں کہ میرے بیٹے کو اگر ایک دعوت میں شرکت نہ کرنی ہوتی تو وہ میچ دیکھنے ضرور جاتا۔ وہ اپنے عوض سانگ کو بھیجنا چاہتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں اس میں تو آپ کو عذر ہونا ہی نہیں چاہیے، آپ کو ایک آدمی مل تو رہا ہے۔

''اور اگر یہ بات ضلع افسران کو معلوم ہوگئی تو میرا حشر کیا ہوگا؟ میں تو بے موت ہی مارا جاؤں گا۔''

''آپ فکر نہ کریں، آپ کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ ضلع افسران آپ کے آدمیوں کی گنتی کرینگے۔ وہ آپ سے یہ نہیں کہینگے کہ میرے بیٹے کو کیوں نہیں لائے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر معاملہ سرکار کا ہے، مجھے آپ کا تحفہ خوف ردہ کر رہا ہے۔ سرکار سرکاری ہوتی ہے اور حاکم، حاکم، آپ میری بات سمجھ رہی ہونگی۔''

''سمجھ گئی ہوں، خوب سمجھ گئی ہوں تبھی تو کہتی ہوں آپ کا کچھ نہیں ہوگا۔ آپ فکر نہ کریں اور یہ تحفہ قبول فرمالیں پلیز!۔''

''لیکن یہ تو بتائیں سانگ تو پھٹے حال ہے وہ صاف ستھرا لباس کہاں سے لائے گا۔؟''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ فکر مند نہ ہوں، اس نے قاعدے کا لباس کرائے پر حاصل لیا ہے۔ دراصل سودے بازی طے کرتے وقت ہم نے اُس سے لباس کی شرط منظور کرالی تھی۔''

''میری سمجھ میں تو خاک نہیں آ رہا ہے۔ لگتا ہے آپ لوگ مجھے مروا کے ہی دم لینگے۔''

''حیرت ہے آپ اتنی معمولی سی بات بھی نہیں سمجھتے میرا بیٹا نہیں جا رہا تو نہ سہی اُس کے بدلے میں سانگ تو جا رہا ہے۔ وہ لوگ آدمیوں کی گنتی ہی تو کرینگے، وہ آپ سے یہ تو نہیں پوچھنگے کہ میرا بیٹا کیوں نہیں آیا؟ بتائے اس میں غلط کیا ہے؟۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، سانگ سے کہہ دینا وہ علی الصبح ۱۹ر تاریخ کو ایوان عام میں حاضر ہو جائے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن شہر کے لئے روانگی سے قبل کم از کم اُسے ناشتے کی مہلت تو دیجئے۔ میچ تین بجے سے پہلے تو شروع ہوگا نہیں۔ اس کام کے لئے ہم اُسے پورے دن کی مزدوری دے رہے ہیں۔ کیا ہمارا حق نہیں بنتا کہ ہم دو پہر تک اُس سے اپنے بغیچوں کی بیگاری بھی کرالیں۔''

''اس کی گنجائش نہیں ہے، یہ نہیں ہوسکتا، ضلع مجسٹریٹ کا حکم ہے کہ دو پہر تک ہم لوگ ہر حال میں وہاں پہنچ جائیں تا کہ وہ خود دیکھ لیں کہ وہاں کتنے آدمی پہنچے ہیں اور کتنے نہیں پہنچے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم لوگوں کو گیارہ بجے تک ہر حال میں پہنچ جانا ہوگا، جھنڈوں کیساتھ، اس کے لئے سورج نکلنے سے پہلے تڑکے ہی ہمارے آدمیوں کی ایوان عام میں پہنچنا ہوگا تا کہ ٹھیک سویرے پانچ بجے ہمارا یہ قافلہ کوچ کر جائے۔''

''لیکن اتنی جلدی تو......''

رفیق شاہین

''بس بہت ہو گیا، اب آپ میرا دماغ نہ چاٹیں ورنہ یاد رکھیں میچ سانگ نہیں آپ کا بیٹا دیکھے گا''
مادام بنھ کے چہرے پر خوف کی زردی چھا گئی، لہجہ بدل کر بولی۔

''حضور والا خفا نہ ہوں، سب کچھ آپ کے حکم کے مطابق ہی ہوگا۔ میں تو بس یونہی کہہ رہی تھی کہ مزدور سے گھریلو کام لے لیتے تو گھاٹے میں نہ رہتے۔''

''میں پھر کہتا ہوں کہ معاملہ نہ میرا ہے نہ آپ کا، سرکار کا ہے۔ حاکم اعلیٰ سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے نہ آپ نہ میں آپ سانگ کو بتا دینا کہ وہ ناشتہ رات میں تیار کر لے کیونکہ اُسے تڑکے ہی حاضری دینی ہوگی، صبح ناشتے کی تیاری کا اُسے وقت نہ مل سکے گا۔

''اطمینان رکھیں سب کچھ آپ ہی کے حکم کے مطابق ہوگا۔ وہ تڑکے ہی حاضر ہو جائے گا۔''

۱۹ر مارچ پو پھٹنے سے پہلے گاؤں کے بڑے عوامی حال میں پردھان کی غضبناک آواز کی گونج رہ رہ کر سنائی دے رہی تھی۔ وہ ماتھا پیٹ پیٹ کر دہاڑ رہا تھا۔

''ایک نہ دو پورے اٹھارہ آدمی غائب ہیں۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ جانے کا عدہ کر لیا اور غائب بھی ہو گئے۔ تم لوگ کھڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو، ارے جاؤ ڈھونڈو اُنہیں اور گدھے کے بچوں کو رسی سے باندھ کر انہیں یہاں گھسیٹتے ہوئے لے کر آؤ۔''

''جاتے ہیں حضور! جاتے ہیں۔ پردھان کے وفادار پٹھے جوش سے بھر اُٹھے اور مشعلیں روشن کر کے ہال سے باہر نکل پڑے۔ پیچھے سے پردھان کی دہاڑ سنائی دی۔

''بدمعاشوں کے ساتھ کوئی دورعایت مت کرنا۔ پیٹ پیٹ کر سالوں کی کھال اُدھیڑ دو۔ اُن کو تو میں بتا ؤنگا کہ سرکار کی حکم عدولی کرنا کیا ہوتا ہے۔ باندھ کے لاؤ اُن دھوکے باز کتوں کو اور پٹک دو میرے آگے۔ اُن کی مزاج پرسی تو اب میں کرونگا۔''

پردھان کے دو پٹھے مشعلیں تھامے دندناتے ہوئے گاؤں کے ایک مکان میں گھس پڑے دونوں نے ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے ہاتھ میں ڈنڈے تھام رکھے تھے۔ کمروں میں دیکھا تو وہاں انہیں کوئی نہیں ملا۔ رسوئی گھر بھی خالی پڑا تھا۔ انہوں نے وہاں پڑے بھوسی کی بوریوں اور راکھ کے ڈھیر تک کو اپنے نوکیلے ڈنڈوں کی مدد سے اچھی طرح کُرید، کُرید کر دیکھا۔ مکان کے پچھواڑے واقع گھر میں بھی تلاش جاری رکھی۔ وہ مایوس ہو کر وہاں سے پلٹنے ہی والے تھے کہ تبھی کسی بچے کے رونے کی آواز سُن کر چونک اُٹھے۔ انہوں نے آواز کی طرف نظر مرکوز کی تو انہیں محسوس ہوا کہ گھاس کے ڈھیر کے اندر کوئی چھپا ہوا ہے۔ انہوں نے پوال ادھر ہٹائی تو گھاس میں چھپا آدمی جس نے اپنے بچے کو اپنی چھاتی سے لگا رکھا تھا۔ اُسے جھٹ دبوچ لیا ''چھوڑ دو مجھے''۔ وہ گڑگڑایا۔ ''خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو میں بے حد غریب آدمی ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میں اگر مزدوری پر نہ گیا تو یہ بھوک سے مر جائینگے۔ میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں، میری حالت پر رحم کھاؤ، مجھے چھوڑ دو۔''

''ہم کچھ نہیں کر سکتے تم نے پردھان سے غداری کی ہے اب تو تمہیں دہی دیکھیں گے۔ اب جو کیا ہے اس کی سزا تو بھگتنی ہی پڑیگی۔''

''مگر میرے پاس تو اچھے کپڑے بھی نہیں ہیں، مجھے تو کوئی اُدھار بھی نہیں دیتا ہے۔''

رفیق شاہین

''ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اب جو کرینگے پردھان ہی کرینگے۔ اُن ہی کو اپنی رام کہانی سنانا۔ وہ عوامی ہال میں بیٹھے تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ کھوکا کا بچہ گگھیا کر گونگا ہو چکا تھا۔ انہوں نے بچے کو کھو سے چھین کر ایک طرف پٹک دیا اور اُسے رسی سے باندھ کر گھسیٹتے ہوئے گھر سے باہر لے گئے۔

گھر گھر ولبش ڈالتے اور کھیتوں کھلیانوں اور باغوں میں تلاش و جستجو کے باوجود سو آدمی اکٹھے نہ ہو سکے۔ اُن میں سے چھ سیانے قسم کے بھگوڑوں نے تو اس قیامت کی رات میں دوسرے گاؤں میں جا کر جائے پناہ حاصل کر لی تھی۔ کچھ گھنے جنگل میں جا کر گھنی جھاڑیوں میں روپوش ہو گئے تھے اور جو کیڑوں مکوڑوں اور جنگلی جانوروں سے خائف تھے انہوں نے درختوں کے موٹے گڈھوں پر اپنا آسن جمالیا تھا۔ گویا کہ وہ کھیل نہ تھا کوئی عفریت تھا، آفت تھی بلائے ناگہانی تھی جس سے جان بچانا ان کے لئے ضروری ہو گیا تھا۔

دیر پہ دیر ہوئی جا رہی تھی۔ پردھان کا پارہ چڑھا ہوا تھا اسے لگ رہا تھا پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں پھنسا ہی چلا جا رہا ہے۔

اضطرار و اضطراب کے عالم میں دو دانت پیس رہا تھا۔ منہ سے رال ٹپک رہی تھی، چہرا فق پڑا تھا۔ پھر وہ اچانک ہی دہاڑنے لگا۔

''دیکھا ان احمق بدمعاشوں کو، کھیل کو کھیل تک نہیں سمجھتے، اسے بھوت چڑیل سمجھے بیٹھے ہیں، گویا یہ میچ نہیں کوئی آفت ہے، مصیبت ہے، بلائے بے درماں ہے۔ ان بھگوڑوں نے منہ چھپا کر اپنا تو بُرا کیا ہی ہے۔ ساتھ میں میری جان بھی آفت میں ڈال دی ہے۔ اب جب حکام کو پتہ چلے گا کہ سو میں چھ آدمی کم ہے تو میں تو گیا کام سے۔ میری تو پردھانی بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ لگتا ہے یہ لوگ عدالت میں میری پیشی کرا کے ہی مانیں گے۔''

اب آپ سبھی چورانوے (۹۴) لوگ لوگ پانچ پانچ کی قطاریں بنالیں اور قطار کا ایک آدمی جھنڈا ہاتھ میں تھامے رکھے۔ اب آپ اپنے قدم آگے بڑھائیں اور وہاں یہ بات کان کھول کر سن لیں کہ آپ میں سے کوئی بھی اگر بھاگنے کو کوشش کریگا تو اُسے جیل میں سڑنا پڑیگا۔ میں اُس کے خلاف رپورٹ لکھنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑنگا، باقی تم جانو اور تمہارا کام۔''

وہ لوگ آگے آگے اور پردھان اُن کے پیچھے چل پڑا۔ بجائے اس کے کہ یہ فٹ بال کے شائقین کا مجمع معلوم ہوتا۔ وہ لوگ مفرور جنگی قیدی جیسے نظر آرہے تھے جیسے فوجی کیمپ میں لے جا کر انہیں موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔ ان کے چہرے فق تھے اور آنکھوں سے آنسوؤں ٹپک رہے تھے۔

ان کے حال زار پر پردھان زیرلب بڑبڑا رہا تھا۔

''کیسے بد بخت لوگ ہیں، بڑے جاہل اور احمق، سرکار انہیں فٹ بال کا میچ دکھا کر انہیں خوشیوں سے لطف اندوز کرانا چاہتی ہے اور یہ اسے بھیانک سزا سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ کوڑھ مغز تو بس بھوک ہی بھوک اور روٹی ہی روٹی چلاتے رہتے ہیں، ایسے لوگوں کا تو پردھان ہونا بھی کسی سزا سے کم نہیں ہے۔ لعنت ہو کم بختوں پر۔''

☆...... مسیمو بوٹیم پیلی
☆...... رفیق شاہین

وحشتِ دل

پتہ نہیں مجھے دنیا میں لاتے وقت خالق کائنات نے میرے سینے میں ایک غیر معمولی حساس دل (SUPER SENSITIVE HEART) کیوں نصب کرنا ضروری خیال کیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج میرا اشمار اطالیہ کے ارب پتی لوگوں میں ہوتا اور اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ چند روز دولت مجھ پر خوب مہربان رہی تھی۔ مگر جس شے کی بدولت یہ میرے قدموں میں آئی تھی اسی شے کے سبب ہاتھ سے نکل بھی گئی اور مجھے اس سے محروم ہوتا پڑا۔ دراصل میری فلم ''مقتول کا انتقام'' کی باکس آفس پر حیرت انگیز اور غیر معمولی کامیابی نے اچانک ہی مجھ پر دولت کے دروازے کھول دیئے تھے۔ میرے اوقات سے بڑھ کر دولت میرے ہاتھ لگی تھی اور میں راتوں رات امیر وکبیر بن گیا۔ یہ محض اتفاق ہی تھا ''اولمپس آف مووی لینڈ'' کے بینر تلے بننے والی اس ایک ہی فلم کے ذریعہ میں ایک ہی چھلانگ میں کامیابی کی سب سے بلند چوٹی پر پہنچ گیا۔ اب قسمت ہی آڑے آجائے تو انسان کیا کرسکتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا اور اپنی بدنصیبی کے سبب پھر سے وہیں جا پہنچا جہاں سے کہ میں نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔

یہ بات تب کی ہے جب میں اطالیہ کے معروف قصبے ''کلابریا'' میں مقیم تھا۔ ایک دن کی بات ہے میں قصبے کے ایک کیفے میں کسی بے ادب ویٹر کو ڈانٹ پلا رہا تھا کہ تبھی میز پر بیٹھا ایک اجنبی میرے قریب آکر مجھ سے مخاطب ہوگیا۔ اُس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے خالص امریکی لب و لہجے میں کہا۔

''میں ''ڈمب پلے'' کلیسٹیل فلم کمپنی کا ڈائریکٹر ہوں۔ میں نے آپ کو ویٹر کو ڈانٹتے بغور سنا اور دیکھا ہے۔ آپ کی آواز کی خوش آہنگی اور چہرے کے قوی تاثرات سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ ایک سُپر اسٹار فلمی ہیرو ثابت ہوسکتے ہیں۔'' اس نے مزید کہا۔ ''اپنی فلم ''مقتول کا انتظام'' کیلئے مجھے ہیرو میں جن صلاحیتوں کی تلاش تھی وہ سب کی سب آپ میں بدرجہ اُتم موجود ہیں'' اس نے کہا وہ موزوں مناظر (LOCATION) کی تلاش میں یہاں آیا ہوا ہے۔ اسکے ساتھ ہی اُس نے مجھے فلم کا کلیدی اور مرکزی کردار ادا کرنے کی پیشکش کی اور معقول معاوضہ پیش کرنے کا وعدہ بھی کیا تو بنا کسی پس وپیش کے میں نے فلم میں کام کرنا قبول کرلیا۔

پھر کچھ ہی دن کے بعد جب کام شروع کرنے کی غرض سے ہم لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوئے اور کہانی مجھے پڑھنے کے لئے پیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ مجھے کہانی کے ہیرو مسٹر ''کوریڈو'' کا رول پلے کرنا ہوگا۔ کاریڈو جزیرہ ''سسلی'' سے تعلق رکھنے والا مصور تو تھا ہی وہ بڑا وجیہہ اور جاذب نظر نوجوان بھی تھا جس میں موجود اس کے دل کا ہر جذبہ اور ہر طرح کا جذبہ اپنے اندر ایک انتہا لئے ہوئے تھا۔ محبوب سے رومان کے موقعے پر وہ جوش وجنوں سے بھڑکتا ہوا خوفناک پاگل اور ایک جنسی وحشی جیسا بن جاتا تھا اور

محبوبہ کے بھائی کی مخالفت میں آتش انتقام میں جلتا سلگتا ہوا ایک خونخوار درندہ اور ایک بے درد قاتل جیسا نظر آنے لگتا تھا۔ کارڈیو کے مزاج کی یہی انتہا پسندی یہی آتش غضب یہی وحشت یہی درندگی اور یہی سنگ دلی میں اپنے وجود میں اپنی ذات میں اور رگ رگ میں پوری طرح پیوست کر چکا تھا اور اب میں، میں نہیں رہا تھا۔ اب میں صرف اور صرف کوریڈو تھا۔ ناول اور کہانی کا وہ کوریڈو جو فرضی کردار تھا مگر میرے اندر اُتر کر ایک جیتی جاگتی حقیقت میں ڈھل چکا تھا۔

کہانی میں کوریڈو متضاد تجربات واحساسات سے گذرتا ہے۔ کبھی محبت کبھی نفرت کبھی قتل کبھی قید کبھی قید سے فرار کبھی ازدواجی زندگی کی اُلجھنیں تو کبھی والدین کا غم اور آخر میں دماغی انتشار وخلفشار کے ناقابل برداشت حالات میں اقدام خودکشی اور نتیجتاً حاصل ہونے والی اذیت ناک موت۔

افتتاحی مہورت کے بعد فلم کی شوٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ فلم کے سین فلم بند ہوتے وقت مجھے شدت سے محسوس ہوتا تھا کہ میں ہی حقیقی کوریڈو ہوں۔ یہ کہانی کے ہیرو کے نہیں بلکہ میرے اپنے حقیقی جذبات ہیں اور میں یہ سب کچھ فلم کے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے کر رہا ہوں۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ فرضی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

فلم کا ایک منظر فلم بند ہو جانے کے بعد بھی میں اپنے جذبات کے طوفان سے آزاد نہ ہو پاتا تھا جس سے اگلا سین کرنا میرے لئے ناممکن ہو جاتا لہٰذا میرے اعصاب سے پہلے سین کے تاثرات صاف ہونے کے انتظار میں شوٹنگ رد کردی جاتی تھی۔ اس طرح کام میں حائل ہونے والے وقفوں کے سبب کام میں تاخیر تو ضرور ہوتی تھی لیکن کام کا معیار اپنی بلندی پر نظر آتا تھا۔ کوریڈو کے لئے کی گئی میری اداکاری پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ میری شاندار اور معیاری اداکاری کا کمال دیکھ کر نہ صرف ہدایت کار اور کیمرہ مین نے میری تعریف کی بلکہ اسٹاف میں موجود ایک ایک شخص نے میری طرز اداکاری کو دل کھول کر سراہا۔

اب تک کوریڈو کا ایزل پر منظر پینٹ کرنا اور اُس کی محبوبہ "روزالی" سے اُس کی پہلی ملاقات کے منظر ہی عکس بند کئے گئے تھے۔

اگلا منظر روزالی کے بھائی کا تھا جو ہیرو ہیروئن کی آپسی محبت کے حوالے سے کارڈیو کا مخالف بن کر سامنے آتا ہے۔ جیسے ہی مجھے اس کے مخالفانہ رویے کا علم ہوا قہر وغضب اور شدید غصے کی آگ میں جل کر اور ایک خونخوار وحشی درندے میں ڈھل کر میں اس کردار پر بری طرح ٹوٹ پڑا جو روزالی کے بھائی کا کردار نبھا رہا تھا۔ میرا قہر وغضب اور کھولتا ہوا غصہ دکھاوٹی اور فرضی نہیں بلکہ حقیقی تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ سین مکمل ہو گیا اور کوئی ناخوشگوار واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔

اگلا منظر روزالی کے اغوا کا تھا جسے مجھے انجام دینا تھا۔ "اسٹارٹ" کی آواز کانوں میں پڑتے ہی میں نے روزالی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹا اور اُسے اُٹھائے ہوئے کیمرے کے لینس کے سامنے سے گذرا اور بھاگنے لگا۔ مجھ میں عجیب سا جوش بھرا ہوا تھا۔ طبیعت میں ہیجان تھا اور جذبات پوری طرح برانگیختہ ہو چکے تھے۔ کیمرے کی نظر کے حصا کو توڑ کر میں بہت دور نکل آیا تھا اور اب بھی دیوانہ وار بھاگے ہی چلا جا رہا تھا۔ میرے پیچھے اب فلم کا اسٹاف بھی دوڑ لگا رہا تھا۔ میری گرفت میں بے بس اداکارہ جو روزالی کا رول کر رہی تھی خوفزدہ ہو کر اب بُری طرح چیخ چلا رہی تھی۔ میں نے اس کی چیخوں اور تعاقب میں لگے

اسٹاف کی ہائے توبہ پر ذرا بھی دھیان نہ دیا۔ میں ہیروئن کو گود میں اُٹھائے ایک بلند ٹیلے پر چڑھ گیا اور وہاں موجود اُسے ایک جھاڑی میں پٹک دیا۔ اب وہاں اسٹاف والے بھی پہنچ گئے جنہوں نے مجھے تہذیب وشائستگی کے اصولوں کی یاد دہانی کرا کے معاملے کو رفع دفع کر دیا۔

اگلے منظر میں مجھے روزالِہی کے بھائی کا خون کرنا تھا۔ یہ بڑا وقت طلب منظر تھا۔ میرے اندر شدید نفرت اور بے لگام غصے کا جہنم بھڑکا ہوا تھا۔ میری آنکھوں سے چنگاریاں اور منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ میرے سر پر پوری طرح خون سوار تھا۔ میں اپنی محبت کے دشمن کو فنا کے گھاٹ اُتار دینے پر تلا ہوا تھا۔ اس کے قتل ہی جیسے میری زندگی کا اصل مقصد بن چکا تھا۔ شیشم کی تیل پی ہوئی موٹی لمبی لاٹھی جس کے سرے پر لوہے کا منہ جڑا ہوا تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں تنی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ لاٹھی کی ضرب سے میں اسکے کھوپڑی کے ٹکڑے بکھیر دوں اسٹاف کے لوگوں نے مجھے چاروں طرف سے گھر لیا اور وہ مجھ پر قابو حاصل کرنے میں بڑی مشکل سے کامیاب ہوئے۔

انہوں نے مجھے ایک نرسنگ ہوم میں داخل کر دیا۔ وہاں بستر پر دراز غصے اور نفرت کے بھڑکتے شعلوں میں گھرا میں ہفتوں جلتا رہا۔ ایسا بھی نہیں کہ میں واقعی پاگل ہو گیا ہوں۔ میں اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ وہ ادا کار جو عزالی کے بھائی کا کردار نبھا رہا تھا۔ وہ 'مالا دی ایالا' (وہ ہیروئن جو روزالی کا کردار نبھار ہی تھی) کا حقیقی بھائی نہیں تھا اور اگر میں ''مالا دی ایالا'' سے دن میں دوبارہ بھی شادی کرتا تو اس کی صحت میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس کے باوجود بھی کوریڈو کی اس سے نفرت اور شدید غصہ میرے دل ودماغ اور رگ وپے میں بُری طرح سرائیت کئے ہوئے تھا میں کوریڈو نہیں ہوں یہ بات کسی طرح بھی میرے دماغ میں نہیں بیٹھ پا رہی تھی۔

بہر کیف نرسنگ ہوم سے شفایاب ہو کر میں پھر شوٹنگ پر پہنچ گیا۔ وہاں روزالی کے بھائی کا خون کرنے والا منظر اب مجھے نہیں کرنا پڑا۔ جتنا سین میں کر چکا تھا اس سے اگلا سین لاٹھی کا ولن کے سر کو چھوتا، سر سے خون بہنا، ولن کا چکرا کر اور لہرا کر فرش پے گرنا، تڑپنا اور مر جانے جیسے سین انہوں نے فلمی تکنیک اور کیمرے کی ٹرک کی مدد سے خود ہی عکس بند کر لئے تھے۔ اب اگلا سین فلمایا جانا تھا۔ سین تھا پولیس کا مجھے گھیر کر گرفت میں لینا۔ ڈنڈوں سے پیٹنا اور جیل میں لے جا کر مجھے کال کوٹھری میں ڈھکیل دینا وغیرہ۔ یہ سارے منظر میں نے باحسن وخوبی عکس بند کرا دیئے تھے۔

کوریڈو کی قید بامشقت کی سزا کا تیرہ سالہ طویل عرصہ ہفتے کے دن کی ایک صبح میں ہی فلم میں پورا کر کے دکھا دیا گیا تھا۔

اب لمبے آرام اور خوب کھائے پیئے ہونے کے سبب میں جسم میں بڑی فرحت اور تر وتازگی محسوس کر رہا تھا۔ اب مجھے قید سے فرار ہونے والا منظر عکس بند کرانا تھا۔ میں چوکنا ہو کر بڑے پُراسرار ڈھنگ سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے قید خانے کے ایک پرانے ٹاور پر چڑھ گیا۔ وہاں میں نے ایک بُک میں بل کھائی ہوئی چادر کا گانٹھ باندھی اور بٹی ہوئی چادر کو دیوار کی دوسری جانب اچھال دیا اور پھر خود بھی اسی چادر پر پھسلتا ہوا قید خانے کے باہر پہنچ گیا۔ وہاں زمین پر قدم پڑتے ہی میرا دل خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگا۔ جوشِ مسرت کے عالم میں میں نے اپنے دونوں بازو کیمرے کے سامنے پھیلا دیئے پھر زور زور

سے سانسیں لے کر پھیپھڑوں میں تازہ ہوا بھری۔ آسمان پر نظریں جمائیں اور آزادی کے خوشگوار احساس سے جھومتا ہوا صحرائے بے کنار کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

رُک جاؤ۔" میرے ہدایت کار نے چلا کر کہا۔

"اب اپنے اوپر تھکن طاری کرنے کی کوشش کرو۔"

اتنا سنتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے دھوپ میں تپتے صحرا کا نہ جانے کتنا لمبا سفر طے کر چکا ہوں۔ مُس تھکن سے بڑی طرح نڈھال تھا۔ بے جان اعضاء میرا ساتھ نہ دے سکے۔ یکا یک بے جان ہو رہی ٹانگیں بری طرح لڑکھڑا گئیں اور میں وہیں زمین بوس ہو گیا۔

"بہت خوب! قابل تعریف اور شاندار۔" تعریف کرنے کے بعد ہدایت کار نے مجھے پھر ہدایت کی۔

"فاقہ زدگی کی حالت میں آجاؤ۔"

ایکا ایکی میں کسی فاقہ زدہ انسان کی طرح بھوک سے تڑپنے لگا۔ میری آنتیں میرے پیٹ میں بری طرح اینٹھ رہی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں کوئی سوراخ زدہ غبارہ ہوں۔ اندر سے اک دم خالی اور میرے ہاتھ پیروں سے جان نکل رہی ہے۔ میں نے اپنا پیٹ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور منہ کے بل زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس پر کوئی بھاگا بھاگا میرے نزدیک آیا اور میرے بازو رتھام کر مجھے اٹھانے کی کوشش کی مگر اپنے پیروں پر مجھ سے کھڑا نہ ہوا گیا میں نحیف سی بے جان آواز میں بڑبڑایا۔

"کھانا لاؤ۔ جلدی لاؤ۔ میں بھوک سے مرنے والا ہوں۔"

وہ لوگ بھاگے بھاگے کینٹین پہنچے اور بہت سارا کھانا میرے آگے چُن دیا میں کھانے پر پاگلوں کی طرح جھپٹ پڑا۔ کھانے پر میرے ہاتھ مشین کی طرح چل رہے تھے اور کھانے پر میں جلدی جلدی منہ مار رہا تھا۔ میں کھا تو کم ہی رہا تھا کھانا نانگل زیادہ رہا تھا۔ اخرش جیسے تیسے میری بھوک مٹی۔

دراصل قید سے رہا ہونے کے بعد تپتے صحرا میں میری زبوں حالی اور فاقہ کشی کے منظر فلمائے جائے رہے تھے۔ میرے ڈائریکٹر نے میری اداکاری کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "یہ جو تم نے فاقہ کشی اور بھوک کے تاثرات پیش کئے بڑے حقیقی تھے۔ میں اس منظر سے تمہارے چہرے کے کچھ کلوز اپ لینا چاہتا ہوں کیا تم دوبارہ یہ سین کرنا پسند کرو گے۔؟"

میں نے جلدی سے آخری لقمہ حلق کے نیچے اُتارا اور کیمرے کے سامنے تین فٹ کی دوری پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ اب میرے چہرے سے کچھ نیچے دو گلیزنگ شیٹس (GLAZING SHEETS) لگا دی گئیں جس کے چمک سے میرا چہرہ اک دم دمک اٹھا۔

ناگاہ مجھ پر پھر سے بھوک طاری ہو گئی۔ پیٹ میں آنتیں بل کھانے اور اینٹھنے لگیں اور میری وہی حالت ہو گئی جو اس سے پہلے ہوئی تھی۔

"بہت اچھے...... بہت اچھے۔" ڈائریکٹر نے تعریف کی۔ "اچھے ایفیکٹس (Effects) دیئے ہیں۔"

مجھے ڈائریکٹر کی تعریف سنائی نہیں پڑی۔ میرے لئے اپنے پیروں پر کھڑے رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ بھوک سے میرا جسم قطعاً بے جان ہو چکا تھا۔ میں زمین پر پڑا اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا پیٹ تھامے بری طرح تڑپ رہا تھا۔

''کھانا...... کھانا'' بدقت میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔ انہوں نے اس بار پھر کھانا میرے آگے رکھ دیا اور میں پھر فاقہ زدوں کی طرح اُس پر بُری طرح ٹوٹ پڑا اور وحشی کتوں کی طرح کھانے کو بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔

اب میں کوریڈو کی مصیبتوں کے مزید واقعات بیان کر کے آپ کو بور نہیں کرونگا۔ اُس کا زہریلی گولیاں نگل کر خودکشی کرنا اور تڑپ تڑپ کر کرب انگیز اور اذیتناک موت مرنا ایسا بھیانک منظر پیش کرتے ہیں جن کو تصور میں لا کر مجھے خود بھی اپنی حالت تباہ کرنا گوارا نہیں ہے کیونکہ یہ سین کرتے وقت مجھے خود بھی کوریڈو کی اذیت ناک موت کا دردناک عذاب جھیلنا پڑا اور میں جانکنی کی ناقابل بیان تکلیف سے دوچار رہا تھا۔ اس کے برعکس اب میں ان حیرت انگیز واقعات کو بیان کرنا زیادہ پسند کرونگا۔ جو فلم بن چکنے اور خاص طور پر فلم ریلیز ہونے کے بعد ظہور پذیر ہوئے۔ یہ ایسے حیرت انگیز اور ناقابل یقین واقعات ہیں کہ یہ عجیب وغریب واقعات اگر کسی دوسرے نے مجھے سنائے ہوئے تو غالباً ان پر میں کبھی یقین نہ کرتا مگر اب اس لئے یقین کرنے پر مجبور ہوں کہ ان واقعات کا میں خود بھی ایک حصہ ہوں اور یہ واقعات میری آپ بیتی میں شامل ہیں۔

فلم بن چکنے کے بعد تھکن تو مجھ پر مطلق بھی طاری نہیں ہوئی البتہ میں ڈپریشن (DEPRESSION) میں مبتلا ہو گیا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے کہ میں اندر سے اک دم خالی خالی سا ہو گیا ہوں۔ میرے اندر خلا ہی خلا ہے۔

فلم تکمیل کو پہنچتے ہی جس طرح فنکار لوگ یہاں آئے تھے اُسی طرح رخصت بھی ہو گئے۔ امریکن ڈائریکٹر بھی اپنے ساز وسامان کے ساتھ چلا گیا تھا لیکن جاتے وقت وہ مجھے ایک بڑی رقم کی تھیلی دینا نہیں بھولا تھا اس نے وعدہ کیا تھا کی پہلی کاپی کے حقوق فروخت ہونے پر وہ مجھے اور بھی بہت کچھ پیش کریگا۔ اُس نے اس فلم سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔

وقت گذرتا رہا اور میں بھی کچھ بھول گیا مگر میرے اندر کا خالی خالی پن ہنوز برقرار تھا۔ نہ مجھ میں اب کوئی احساس تھا اور نہ ہی کوئی خواہش۔ ادھر کچھ دنوں سے میرے اعصاب میں اینٹھن سی ہونے لگی تھی اور لگتا تھا بس مجھے دورہ پڑنے والا ہے۔ پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد جیسے سب کچھ ٹھیک ہو جاتا تھا۔ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ یہ جاننا میری عقل وفہم سے بالاتر تھا۔

پھر ماہ ستمبر کے پہلے ہفتے میں مجھے ڈاک سے امریکی ڈائریکٹر کا نامہ خلوص موصول ہوا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس وقت وہ اٹلی کے شہر ''روم'' میں ہے۔ اس فلم کے متعلق بھی لکھا تھا کہ ایڈٹ ہونے کے بعد یہ توقع سے بھی بڑھ چڑھ کر شاندار اور جاندار فلم ثابت ہوئی ہے اور اب اس کا صرف تماشبینوں تک پہنچنا ہی باقی رہ گیا ہے۔

آخر میں اس نے یہ بھی مطلع کیا تھا کہ اسی مہینے کی پندرہ تاریخ کو ڈسٹری بیوٹرس کو فلم کا ٹرائل شو دکھایا جائے گا چنانچہ میں بھی وہاں پہنچ کر اس تقریب میں شامل ہو جاؤں تاکہ فلم کی کامیابی کا خوشگوار منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔''

خط پڑھ کر نہ مجھے خوشی محسوس ہوئی اور نہ غم کیونکہ میرے اندر کے خالی پن نے مجھے ہر طرح

کے احساس سے محروم کیا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں کسی کی پیدائش یا موت کی خبر بھی میرے لئے ایک ہی جیسی تھی۔ چند دن کے بعد خط لکھ کر میں نے وہاں پہنچنے سے معذرت کر لی کہ میں بامر مجبوری اس تقریب میں شرکت نہ کر سکونگا۔ لیکن اپنے خط کے برعکس میں چودہ تاریخ کو ٹرین میں سوار ہو گیا اور پانچ سو میل کا فاصلہ طئے کر کے شہر روم پہنچ گیا۔

ڈائیکٹر نے مجھے مسکرا کر خوش آمدید کہا۔ میں نے بہت چاہا بہت کوشش کی کہ اس بے حسی اور لاتعلقی کے نادیدہ حصار کو توڑ کر مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دوں مگر ناکام ہو کر اس طرف ایسے ہی دیکھتا رہا جیسے کہ ایک اجنبی دوسرے اجنبی کی طرف دیکھتا ہے۔ اتنا ہی نہیں میں نے بڑے کھردرے اور خشک لہجے میں اُس سے یہ بھی کہا کہ یہاں کسی سے بھی میرا تعارف کرانے کی کوشش نہ کرے۔

ہم لوگ ایک ساتھ ایک بڑے ہال میں داخل ہو گئے۔ میں دیوار سے لگ کر چپ چاپ ایک تاریک گوشے میں بیٹھ گیا۔ ہال میں ہمارے علاوہ بیس فلم کے تقسیم کار موجود تھے جو ڈائریکٹر کی دعوت پر یہاں تشریف لائے ہوئے تھے اور اس وقت ہال کی وسطی نشستوں پر دراز تھے۔

بتی گل کر دی گئی اور اس کے ساتھ اچانک ہی فلم ''مقتول کا انتقام'' سے پردہ سیمیں جلوہ بار ہو اُٹھا۔ اب کوریڈو کی کہانی کا آغاز ہو چکا تھا جسے دلچسپی نہ ہونے کے سبب میں نے دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر ابتدائی چند منظر پردے سے گذرنے کے بعد جیسے ہی کوریڈو پردے پر جلوہ گر ہوا کوئی شے ایکا ایکی میرے وجود میں اتر کر اچھل کود کرنے لگی اور جو خلا کی کیفیت میں اپنے اندر بہت دنوں سے محسوس کر رہا تھا۔ وہ اچانک ہی دور ہو گئی۔ اس وقت میری حالت ایک ایسے انسان کی سی تھی جو لمبے عرصے بیہوش رہ کر اچانک ہی ہوش میں آ گیا ہو۔ لیکن ایسا احساس مجھے لمحے بھر کے لئے ہی ہوا تھا اور یہ اس وقت ہوا جب کوریڈو ایزل پر بیٹھا سامنے کے منظر کو کاغذ پر منتقل کرنے میں مصروف تھا اور یہ کاریڈو میں خود تھا۔ پھر جب وہ روزالی کے حسن و شباب کی رعنائیوں میں گم رومانی جذبات سے سرشار سا نظر آیا تو وہی سارے جذبات حسن کا نشہ خماری و سرشاری اور مستی جیسی ساری کیفیتیں اپنی بھرپور قوت کیساتھ میری اندر متحرک ہو اٹھی تھیں اور میری یہ حیرت اس وقت تو اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب جوش جذبات سے مغلوب ہو کر روزالی کو اپنی باہوں میں باندھے اور اس کے شفق گلگوں رخساروں کو چومنے کے لئے میرے بے قرار بازو آپ ہی آپ ہوا میں دراز ہو گئے۔ میرے پیاسے ہونٹ بری طرح پھڑک رہے تھے۔ مگر یہ کیفیت بھی عارضی ثابت ہوئی۔ مجھے لگا چڑیا پنجرے سے اُڑ چکی ہے اور پھر سے میں پہلے کی طرح خالی ڈبہ خالی بوتل بن گیا ہوں۔ ایک دم خالی خالی۔

اور پھر جیسے ہی کوریڈو کا روزالی کے بھائی سے نفرت والا سین پردے پر نمودار ہوا میرے دل میں شدید غصے اور ہیجان خیز نفرت کا کھولتا ہوا لاوا سا پھڑک اُٹھا اور اس طرح کوریڈو کو بیس سالہ زندگی کے تمام دکھ سکھ اور تمام کیفیتیں اور اذیتیں جو دو مہینے کی شوٹنگ کے دوران فلم کی شکل میں محفوظ ہو چکی تھی وہی سب کی سب کوریڈو کے وسیلے سے متحرک ہو کر اب مجھے ہال میں بیٹھ کر جھیلنی پڑ رہی تھیں۔ پھر فلم کے آخری حصے میں جب کاریڈو کا زہر کی گولیاں نگل کر تڑپ تڑپ اٹھنے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے والا انتہائی اذیتناک سین پردے پر جلوہ گر ہوا تو میں کرسی سے گر پڑا۔ آنکھیں حلقوں سے باہر نکل پڑی تھیں اور جیسے ہزاروں بچھو میری آنتوں میں اور سارے جسم میں اپنے زہریلے ڈنک پیوست کر کے مجھے ناقابل بیان

اذیت میں مبتلا کیے ہوئے تھے۔ جاں کنی کا عالم تھا اور بس میری جان ہی کا نکلنا اب باقی رہ گیا تھا۔ آنکھوں میں اندھیرا تھا۔ سر چکرا رہا تھا اور بری طرح دم گھٹ رہا تھا۔ ہچکیوں پر ہچکیاں آرہی تھیں۔

پھر اچانک ہی ہال مُیں قمقمے روشن ہوگئے اور اس کے ساتھ ہی میں پہلے جیسا ہوگیا ایک دم سپاٹ اور خالی خالی۔ فلم ختم ہوتے ہی فلم کے تقسیم کاروں نے ڈائریکٹر کو چاروں طرف سے محاصرے میں لے لیا اور اسے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مبارکباد پیش کرنے لگے۔ موقعہ غنیمت جان کر میں ہال کے بغلی دروازے سے باہر نکل آیا اور ٹیکسی کر کے اپنے اسی ہوٹل میں پہنچ گیا جہاں کہ میں مقیم تھا۔

اسی شام مجھے تلاش کرتا ہوا ڈائریکٹر میرے ہوٹل پہنچ گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ تقسیم کار فلم سے بہت متاثر ہوئے ہیں اور ''ملان'' ''روم'' اور ''پیرس'' کے لئے تین پرنٹ ہاتھ کے ہاتھ فروخت ہو چکے ہیں۔ آنے والے پیر کے دن سے فلم روم کے شاندار ''تھیٹر اسپلینڈر'' (SPLENDOR) میں ریلیز ہونے جارہی ہے۔ یہ چند ہی روز میں ملان شہر میں بھی دکھائی جائے گی۔

پھر اس نے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی میرے کوٹ کی جیب میں ٹھونس دی اور فوراً ہی سلام کر کے رخصت ہوگیا۔ دوسرے دن وہ پھر حاضر ہوا اور دو نئی فلموں کے کنٹریکٹ مجھ سے سائن کرائے اور ڈالرز کی شکل میں خاصی رقم میرے آگے رکھدی۔

دوسرے دن علی الصبح میں روم کے ریلوے پلیٹ فارم پر کھڑی ٹرین میں سوار ہو کر واپس گھر کے لئے چل دیا۔ میری جسمانی حالت ابھی بھی ویسی کی ویسی ہی تھی یعنی وہی خالی ڈبہ اور خالی بوتل جیسی اور صحتیات ہونے کے فی الحال کوئی آثار بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔

گھر آکر میں نے اپنی بیماری کی نوعیت پر بڑے غور وخوض سے کام لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ میری قوت حس میرے جذبات واحساسات اور زندگی کی تمام حرکت اور ہلچل جیسی ساری توانائی میرے اندر سے نکل کر فلم کی دو کلو میٹر لمبی ریل (Reel) میں منتقل ہو چکی ہے۔ قید ہو چکی ہے۔ اب جب بھی فلم پردے پر آئے گی میرا غیر معمولی حساس دل فلم میں پیش کئے جذبات واحساسات کو جو کہ میرے اپنے ہیں، محسوس کرنا شروع کریگا اور فلم میں جو کچھ کوریڈو پر گذری ہے۔ فلم کے چلنے پر وہی سب کچھ مجھ پر بھی گزرنی شروع ہو جائے گی اور ہوا بھی یہی۔

ایک دن جب کہ میں اپنی مطالعہ گاہ میں بیٹھا ہوا تھا ایکا ایکی مجھے محسوس ہوا جیسے کسی پُر فضا اور خوشگوار ماحول میں ایزل پر میں کوئی فطری منظر و نقل کر رہا ہوں اور یہ اس لئے ہوا کہ یہاں سے پانچ سو کلو میٹر دور شہر روم میں تھیٹر اسپلینڈر (SPLENDOR) کے اسکرین پر اس وقت کوریڈو سینری پینٹ کر رہا تھا۔ پھر اچانک ہی روزالی کے حسن وشباب سے جذباتی، مسرت، نشہ، مستی، برانگیختگی، غصہ و نفرت، قہر وغضب قید اور قید سے فرار جیسے سارے واقعات جو اس وقت روم میں تھیٹر کے پردے پر دکھائے جارہے تھے ان سب کا بھرپور اطلاق مجھ پر یہاں گھر بیٹھے ہو رہا تھا۔ محبت کی لطافت اور شہوانی جذبات کی برانگیختگی کے طوفانی بہاؤ میں بہہ کر میں بے خود سا ہوا جارہا تھا کہ کچھ ہی دیر کے بعد میں ایک غصیل اور وحشی درندے میں تبدیل ہو گیا۔ میرے حلق سے خوفناک آوازیں منہ سے جھاگ بہنے لگے۔ پھر ذہنی اِنتشار اور خلفشار کے عالم میں بے جان دیوار پر پیشانی ٹکائے میں سسک سسک کر رو رہا تھا۔ یہ فلم کا وہی

منظر تھا جس میں کوریڈو کو دیواروں سے لپٹ کر روتے دیکھ کر اس کی بیٹی خوف سے بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی۔ اب کہانی کے آخری موڑ پر میں زمین پر پڑا بڑی جان لیوا اذیت کے عالم میں مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ زہر کی گولیاں میرے اندر اپنا کام دکھا رہی تھیں اور میں جانکنی کے عالم سے گذر رہا تھا۔ موت سے پہلے کا کاریڈو کی جانکنی کا یہ منظر جسے دیکھ کر روم کے تماشبین محظوظ ہو رہے تھے وہی منظر وہاں سے پانچ سو کلومیٹر کی دوری پر یہاں موجود حقیقی طور پر میں پلے کر رہا تھا۔ یعنی اس وقت جو کچھ بھی فلم میں ہو رہا تھا۔ وہ سب کچھ مجھ پر یہاں گذر رہا تھا۔ لگاتار دو گھنٹے تک یہ فلم روم میں چلی اور میرے ساتھ یہی سب کچھ ہوتا رہا۔ اس کے بعد فلم کا دوسرا شو شروع ہو گیا اور میں پھر سے فلم کے واقعات کیساتھ جڑتا چلا گیا۔ شام کے چار بجے سے رات کے دو بجے تک چار شو مکمل ہوئے تھے۔ ایک ساتھ چاروں ہالوں میں فلم چل رہی تھی اور میں ایک دن میں چار چار بار کاریڈو کی موت کا جان لیوا عذاب جھیلنے پر مجبور تھا۔ ایسا بھیانک عذاب تو کسی عظیم گنہگار نے جہنم میں بھی نہ جھیلا ہوگا جو میں خدا کی بنائی ہوئی اس زمین پر جھیل رہا تھا اور یہ سب میرے غیر معمولی حساس دل کی بدولت انجام پا رہا تھا۔

اگلے دن ریلوے اسٹیشن پر میں نے ٹرین پکڑی اور پھر سے روم پہنچ گیا۔ سفر اختیار کرتے وقت میں نے خاص طور پر اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا تھا کہ دوران سفر کا وقت فلم شو کے اوقات سے ہٹ کر ہو تا کہ سفر کی حالت میں میرا وجود مسافروں کی نظر میں تماشہ بن کر نہ رہ جائے۔

شہر کا معروف ماہر نفسیات جس سے علاج کی خاطر میں یہاں روم آیا ہوا تھا اس نے میرے کیس میں بڑی غیر معمولی توجہ کا مظاہرہ کیا۔ اُس نے کہا مجھے اس کے پاس روز آنا ہوگا۔ دراصل وہ یہ چیک کرنے کا خواہاں تھا کہ فلم کے واقعات کا میری حرکات وسکنات اور جذبات واحساسات پر کیا اثر پڑتا ہے۔

اور پھر اُس دن جب کہ میں اپنے معالج کی مطالعہ گاہ میں بیٹھا تھا فلم میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات نے مجھے اپنے حلقہ بازو میں لے کر کسنا شروع کر دیا۔ یہ فلم ''ملان'' اور شہر ''روم'' میں ایک ساتھ دکھائی جا رہی تھی۔ دونوں فلموں کے شو میں وقت کے تھوڑے فرق کی وجہ سے دونوں فلموں میں واقعات کی ترتیب میں فرق پیدا ہو گیا تھا۔ ایک ہال میں پیچھے کے واقعات گردش کر رہے تھے تو دوسرے ہال میں آگے کے واقعات رونما ہو رہے تھے جس کا فطری اور منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ایک ہی وقت میں مجھ پر دو متضاد کیفیتیں طاری ہونا شروع ہو گئیں۔ روم کے فلم میں اگر میں روزالی کے بھائی کے سر پر لاٹھی تانے ہوئے تھا تو اسی وقت ملان شہر کی فلم میں قید بند سے رہائی پانے کے لئے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اسی طرح روم شہر کی فلم میں بٹی ہوئی چادر کی مدد سے قید سے فرار ہو رہا تھا تو ملان کی فلم کے لئے زمین پر تڑپتے ہوئے موت کی ہچکیاں لے رہا تھا۔ غرض یہ کہ دو متضاد کیفیتوں کے تصادم کے سبب میرا جسم کسی بھی حرکت کو مکمل قبول نہ کر پانے کی وجہ سے صرف اینٹھ کر اور پھڑ پھڑا کر رہ جاتا تھا۔ مگر جب ملان کی فلم کا شو ختم ہو گیا اور روم کی فلم رہ گئی تو اس کے زیر اثر ہو کر میں نے زمین پر گر کر اور تڑپ کر موت کا منظر عملی طور پر دہرانا شروع کر دیا۔

رات کے دو بجے روم کا فلم شو ختم ہونے پر میرے اسپیشلسٹ معالج نے مجھ سے کہا۔ ''آؤ ذرا باہر کی تازہ ہوا کا لطف لیا جائے۔

اور میں اس کے پیچھے ہولیا۔

رفیق شاہین

اب مجھے اپنے امریکن ڈائریکٹر کی تلاش تھی۔ وہ مجھے "پلازہ کولونا" میں ملا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ اُس نے مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ میرا خیر مقدم کیا اور بنا تمہید باندھے شروع ہوگیا۔

"آپ کو معلوم ہے فلم کے دس اور پرنٹ فروخت ہو چکے ہیں۔ کچھ امریکہ میں اور کچھ سوئیڈن میں۔ چند ہی روز میں یہ فلم وہاں بہت سے ہالوں میں ایک ساتھ دکھائی جائے گی۔

اتنا سنتے ہی میرے چہرے پر ہیبت طاری ہوگئی۔ بیساختہ میرے منہ سے بڑی بھیانک چیخ نکلی اور میں یتورا کر زمین پر گرتے ہی بے ہوش ہوگیا۔

میری بیماری میری سمجھ میں تو پہلے ہی آچکی تھی اور اب تو اس کا علاج بھی سمجھ میں آگیا ہے چنانچہ اپنا علاج میں نے خود ہی کیا ہے اور خدا کے فضل سے اب شفایاب ہو چکا ہوں۔ آپ کہیں گے کیسے؟ تو سنئے میں فلم "مقتول کا انتقام" کے سارے حقوق ساری کاپیاں اور ان کے نیگیٹو خرید کر انہیں تباہ کر دیا ہے۔

قربان فاؤں میں اپنے اس فرشتہ صفت ڈائریکٹر کے کہ اس بے چارے شرافت کے پتلے نے مجھے اس جہنمی عذاب سے بچانے کے لئے مالی طور پر اپنے آپ کو تباہ و برباد کر ڈالا ہے اور دولت کی ہمالیائی چوٹی پر پہنچنے کے بعد وہ غریب پھر سے زمین پر آگیا ہے۔ اب وہ لاکھوں ڈالر کا مقروض ہے اور اس کا فلمی کیریر بھی پوری طرح چوپٹ ہو چکا ہے۔ اُس نے فلم کی کہانی کو منحوس قرار دیکر اور اُسے اب کبھی نہ بنانے کا فیصلہ کر کے کہانی کا اسکرپٹ بھی بذر آتش کر دیا ہے اور وہ آج کل بیمار ہے۔ اس کے برعکس وقت اور محنت کے علاوہ مالی اعتبار سے میرا کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ لگے ہاتھوں اب یہ بھی واضح کروں کہ فلم کے حقوق خریدنے لائق سرمایہ میرے پاس بالکل بھی نہیں تھا۔ اگر چہ ڈائریکٹر نے مجھے معقول رقم دی تھی مگر فلم کے حقوق خریدنے لائق تو وہ بالکل بھی نہ تھی۔ ہیچ تھی۔ لہٰذا مصیبت سے جان چھڑانے اور جان بچانے کے لئے میں نے اپنا غیر معمولی حساس دل (SUPER SENSITIVE HEART) جو میری موت کے بعد ان کا ہوگا ایک میڈیکل کالج کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ اس سودے بازی میں میرے مشفق معالج کی کرم فرمائی بھی شامل رہی ہے۔ انہیں کے اس مشورے پر کہ میرے دل کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے حیرت انگیز انکشافات روشنی میں آئینگے میڈیکل کالج نے میرے دل کی خریداری منظور کر کے مجھے خطیر رقم ادا کی تھی۔

اب آپلوگ سمجھ ہی گئے ہونگے کہ میڈیکل کالج سے ملنے والی وہ رقم اور اپنے ڈائریکٹر کی دی ہوئی رقم خرچ کر کے ہی میں نے فلم کے سارے حقوق اپنے نام کرائے تھے۔ تبھی میری اس جہنمی عذاب سے گلوخلاصی ممکن ہوئی ہے۔

..........☆☆☆..........

☆......طامس ہارڈی

☆......رفیق شاہین

ٹیس

وہ مئی کی ایک خوشگوار شام تھی۔ شام کے سُرمئی سائے کائنات سے ہم آغوش ہو رہے تھے۔ جیک دربے فیلڈ گھر جانے کی دھن میں تیز رفتار قدموں سے راستہ طے کر رہا تھا کہ تبھی اُسے فادر ٹرنگھم دکھائی پڑے جو اُس کی طرف آ رہے تھے۔ انہوں نے جیک کو ''سر جان'' کے خطاب سے نوازا۔ جیک پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ بات بھی حیرت کی تھی کہ پادری جیسی مقدس اور معزز ہستی اُلٹے سیدھے دھندوں سے اپنے اکثر العیال خاندان کا پیٹ پالنے والے ایک بے وقعت مزدور کو سر جان کہہ کر پکارے اور تعظیم وادب سے گفتگو کرے۔ اتنا ہی نہیں فادر نے اُسے بتایا کہ وہ ڈیوڈ بروِلے نام کے شاہی خاندان کا قابل تعظیم فرد ہے۔ اُسے اور بھی ورطۂ حیرت میں ڈالدیا۔ اُسے حیرت زدہ دیکھ کر فادر نے اُسے یقین دلانے کی غرض سے یہ بھی بتایا کہ فاتح اعظم سَر ولیم کے دور کے ایک نارمن نامی جاگیردار کے تجربے میں اُس کا نام موجود ہے۔ اس حیرت ناک اور مسرت بخش انکشاف سے جیک مارے خوشی کے پاگل ہو اُٹھا اور فخر سے اس کی چھاتی تن گئی۔ اور اب تو اُس کے طور طریقے ہی بدل گئے تھے۔ اس احساس سے کہ وہ بھی طبقہ اشرافیہ کا ایک معزز فرد ہے اس کے پاؤں زمین پر ہی نہ پڑتے تھے۔ جیک کی بیوی بھی یہ خبر سن کر خوشی سے پھولے نہیں سمائی اُسے فوراً ہی ایک ڈیوڈ بروِلے خاندان یاد آ گیا جو ''ٹرنیٹرج'' میں اقامت پذیر تھا۔ اُس نے جھٹ فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنی بڑی بیٹی ٹیس کو اس خاندان میں بھیجے گی تاکہ خون کے رشتے کو حوالہ بنا کر اور اپنی بدحالی کی دہائی دے کر مالی امداد حاصل کی جاسکے۔

اگلے ہی دن ٹیس مسٹر ڈیوڈ بروِلے کے یہاں پہنچ گئی۔ یہ ایک شاندار حویلی تھی جس کے سامنے کے وسیع و عریض احاطے میں ہر طرف دور دور تک سبزہ پھیلا ہوا تھا ساتھ ہی انواع واقسام کے پیڑ پودے اور رنگا رنگ پھولوں کی کیاریاں اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔ وہ حویلی کے پھاٹک میں داخل ہو کر حویلی کا نصف راستہ بھی طے نہیں کر پائی تھی کہ اس کی ملاقات الیک نام کے ایک نوجوان سے ہوگئی اور وہ پیکر حسن وشباب ٹیس کی ایک جھلک دیکھتے ہی اس پر دل وجان سے فدا ہو گیا۔ اُس نے اپنا تعارف الیک ڈیوڈ پروِلے کہہ کر کرایا اور ٹیس سے اُس کی آمد کا مقصد پوچھا چند سوالات بھی کئے لیکن اُس کو اپنی ماں سے ملنے کا موقع نہیں دیا۔ دراصل اس خاندان کا ڈیوڈ پروِلے خاندان سے کیسا بھی کوئی رشتہ یا تعلق نہیں تھا۔ الیک کے خاندان والوں نے محض سرکاری اور سیاسی فائدے حاصل کرنے کی غرض سے مشہور کر رکھا تھا کہ وہ ڈیوڈ بروِلے خاندان کے افراد ہیں۔ الیک نے ٹیس سے کہا کہ اس وقت وہ واپس چلی جائے وہی اس کی ملازمت پکی کرا کے اس کو مطلع کر دیگا۔ ٹیس واپس لوٹ گئی۔

چند یوم گزرنے کے بعد جیک کا ایک خط ملا جس میں ٹیس کو ملازمت کی اطلاع دی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ وہ تیار رہے اُسے لانے کے لئے گاڑی بھیج دی جائے گی۔

اور پھر اگلے ہی دن الیک گاڑی لے کر ٹیس کے گھر پہنچ گیا۔ ٹیس گاڑی میں سوار ہوگئی اور گاڑی چل پڑی۔ پہاڑی گھماؤ دار راستوں پر گاڑی ایک خاص رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ گاڑی جب فراز سے نشیبی راستوں میں اُترتی تو ٹیس کا دل بیٹھنے لگتا جس سے اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں ہو اُٹھتے۔ اس پر الیک اس کا مذاق اُڑاتا اور زور زور سے ہنسنے لگتا۔

حویلی میں داخل ہونے کے بعد اُسے پتہ چلا کر مسز ڈیوڈ پر ولے نابینا خاتون تھیں۔ اُن کا کم سے ہی سامنا ہو پاتا تھا۔ وہاں ٹیس کو جو کام سونپا گیا تھا وہی معمولی نوعیت کا آسان کام تھا۔ وہ سنیچر کو حویلی کی خادماں کے ساتھ بازار جاتی اور گھریلو قسم کا سامان خرید کر حویلی لے آتی تھی۔

ایک دن بازار میں دیر ہو جانے پر سینئر خادمائیں اُس پر اپنا غصہ اُتارنے میں لگی تھیں کہ تبھی گھوڑے پر سوار الیک وہاں آ پہنچا اور ٹیس کو ہوا خوری کی دعوت دی جسے ٹیس نے بخوشی قبول کیا اور اُچک کر الیک کے گھوڑے پر سوار ہوگئی۔ پھر کچھ لمحوں میں وہ حویلی سے باہر تھے۔

سنسان راستوں پر گھوڑے کو ہانکتے ہوئے الیک نے ٹیس سے ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ شروع کی تو وہ گھبرا اُٹھی۔ پھر ایک مقام پر راستہ معلوم کرنے کے لئے الیک گھوڑے سے اُترا تو وہ بھی اُتر گئی۔ اُسے بہت زیادہ تھکن محسوس ہو رہی تھی کیوں کہ گھوڑے پر سوار ہونے کا یہ اُس کا پہلا ہی اتفاق تھا۔ وہ ایک ویران گوشے میں درختوں کے جھنڈ تلے واقع ایک ہموار چٹان پر جا کر لیٹ گئی۔ خشک اور خوشبو سے معطر ہوا کے نرم جھونکوں نے جیسے ہی اُس کا بدن سہلانا شروع کیا اُس کی آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہونے لگے اور وہ بے اختیارانہ طور پر نیند کی اغوش میں سما گئی۔ پھر جیسے ہی نیند ٹوٹنے پر وہ چونک کر اٹھی تو یہ دیکھ کر گھبرا اُٹھی کہ الیک اُس پر جھکا ہوا تھا اور وہ اس کی مضبوط باہوں کی قید میں تھی۔ اس نے اس قید نا گہاں سے رہائی کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکی۔ اُس نے الیک کی بہت منت سماجت کی مگر وہ کہاں ماننے والا تھا۔ وہ تو کب سے اسی موقع کی تاک میں تھا۔ اس کے ہاتھ گستاخی کی ساری حدیں پھلانگ چکے تھے۔ اب جذبات برانگیختہ ہو جانے پر ٹیس کی مزاحمت بھی کم زور پڑتی چلی گئی اور اس نے خود سپردگی اختیار کرتے ہوئے اپنے وجود کو پوری طرح اس کے حوالے کر دیا۔ الیک اسے ساتھ لئے جذب و کیف کے آسمان پر جب تک اڑ ا گیا اڑا اور جب دم ٹوٹ گیا تو حال میں واپس آ کر ٹیس کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ ٹیس بھی اب الیک کے پھینکے جال سے اور اس سحر سے جو اُس پر طاری کر دیا گیا تھا۔ رہا ہو کر پوری طرح ہوش وحواس میں آ گئی تھی۔ الیک نے اس کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا وہ اس حقیقت کو فراموش نہ کر سکی۔ اُس کے دل میں الیک کے خلاف نفرت کے جذبات جگہ بنا چکے تھے۔ وہ جان چکی تھی کہ اب وہ اُسے کبھی معاف نہ کر پائے گی۔ یہ اکتوبر کا اور اُس کی ملازمت کا چوتھا مہینہ تھا کہ اس کے ساتھ یہ شرمناک حادثہ پیش آ گیا۔ اُس نے یہاں ایک پل بھی ٹھہرنا گوارا نہیں کیا۔ اُس نے جلدی میں اپنا سامان سمیٹا اپنی پوٹلی تھامی اور حویلی سے وداع ہو کر بنا کسی سے کچھ کہے اپنے گاؤں ''مارلٹ'' کے راستے پر چل پڑی۔ الیک کو پتہ چلا تو وہ گاڑی لے کر ٹیس کو ڈھونڈھنے نکل پڑا اور اُسے راستے میں جالیا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر اپنے کئے پر ٹیس سے معافی طلب کی اور ہر ممکن طریقے سے اسے منانے کی کوشش کی لیکن وہ اس سے شدید طور پر متنفر تھی اس کے لاکھ منانے اور منت وسماجت کرنے کے باوجود بھی وہ اُسے معاف کرنے کے

لئے تیار نہ ہوئی لہٰذا مایوس ہو کر الیک واپس لوٹ گیا۔

اُس نے گھر پہنچ کر اس بدنما حادثے کا ذکر جب ماں سے کہا تو وہ رو پیٹ کے خاموش ہو گئی۔ اب سوائے صبر کے اور چارہ بھی کیا تھا۔ نو ماہ کے بعد ٹیس کے بطن سے ایک نحیف و نزار اور بیمار بچے نے جنم لیا جسے یہ دنیا راس نہ آسکی اور اُس نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں۔ پادری نے معصوم کے جنازے کو گناہ کی نشانی قرار دے کر رسوم جنازہ کی ادائیگی سے صاف انکار کر دیا۔

ٹیس نے گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور ملازمت کی تلاش میں در در بھٹکنے لگی۔ اسی دوران اُسے کسی سے معلوم ہوا کہ "ٹیبلوٹھیز" کے کسی ڈیری فارم میں گوالن کی ضرورت ہے۔ یہاں آکر اسے ملازمت مل گئی۔ یہاں ڈیری فارم کے مالک مسٹر کریں کی بیوی کا اس کے ساتھ اچھا برتاؤ تھا۔ دوسری گوالن ہمجولیاں بھی یہاں اُس کی دلجوئی میں لگی رہتی تھیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ وہ اپنے ساتھ پیش آئے حادثے کو بالکل بھول گئی۔

"ٹیبلوٹھیز" کے قریبی گاؤں "ایمنسٹر" میں کلیر نام کا ایک پادری رہتا تھا جس کا بڑا بیٹا "اینجلز" "ٹیبلوتھیز" میں مقیم تھا جو کھیتی باڑی کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اسے اپنے باپ کے مذہبی کٹرپن اور دقیانوسی عقائد و نظریات سے سخت چڑھ تھی اور وہ طبقہ اشرافیہ کے معزز و متکبر اور سفاک لوگوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ تحصیل علم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ کھیتی باڑی کا پیشہ اپنانے کا اپنے دل میں پکا ارادہ کر چکا تھا۔

اُس کی ملاقات ٹیس سے ہوئی اور دل میں وہی اُسے چاہنے لگا۔ ٹیس بھی اس سے محبت کرنے لگی تھی لیکن اس کی محبت کو کھل کر سامنے آنے میں کافی وقت لگ گیا۔ بہر کیف جب اینجلز نے اُسے شادی کا پیام دیا تو اُس نے فوری طور پر اپنی منظوری دینے سے گریز کیا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اُسے پہلے اپنے داغدار ماضی سے آگاہ کر دے اس کے بعد ہی وہ شادی کا اقرار کریگی۔

ادھر اینجلز کی محبت نقطہ عروج پر تھی۔ اُس نے شادی کے لئے اپنے والدین کو بھی رضامند کر لیا تھا اور شادی کے لئے مسلسل ٹیس پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ چنانچہ جب کہ ٹیس کو ٹیبلوتھیز آئے ساتواں ہی مہینہ تھا اُس کی اینجلز کے ساتھ شادی ہو گئی۔ اس شادی میں دونوں کے ہی والدین نے شرکت سے انکار کر دیا تھا۔

اب اینجلز کو اپنے ماضی سے آگاہ کرنے کی ٹیس کی تمنا سہاگ رات میں پوری ہو گئی۔ ٹیس نے ڈیوڈ بروے لے خاندان، الیک سے ناجائز تعلق، بچے کی پیدائش جیسے سبھی معاملات اور واقعات اُس پر تفصیل سے واضح کر دیے۔

ٹیس کا خیال تھا کہ وہ سب جان کر اُس کی دلجوئی کرے گا ور پچھلی باتیں بھول جانے کی تلقین بھی کریگا مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ ٹیس کی روئداد کو اوّل اوّل مذاق ہی مانتا رہا لیکن جب ٹیس اُسے اپنے بیان کی سچائی کا یقین دلانے میں کامیاب ہو گئی تو وہ ناگاہ ہی اشتعال میں آکر آپے سے باہر ہو گیا اور ٹیس کو طعنے تشنیع دینے لگا۔ پھر جب معاملہ حد سے سوا ہو گیا تو ٹیس بھی بھڑک اٹھی جس سے دونوں میں تکرار بڑھ گئی اور پھر شادی کے چوتھے ہی دن اس تکرار نے دونوں کے درمیان علاحدگی کی شکل اختیار کر لی۔ ٹیس سے بے نیاز ہو کر اینجلز کھیتی باڑی کے اُمور کی طرف راغب ہو گیا اور نو آباد کاری کا سہولیات ملنے کے

لالچ میں پڑ کر ملک برازیل ہجرت کر گیا۔

ٹیس اپنے گاؤں واپس چلی گئی۔ وہاں آٹھ ماہ تک اس نے کئی ڈیریوں میں عارضی طور پر کام کیا پھر ایک سہیلی کے بتانے پر ''فلنٹ کیموبوس'' پہنچ کر ایک فارم میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں اسے کھیتیوں پر کڑی مشقت کرنی پڑتی تھی اور وہ غیر معمولی تھکان سے چور چور ہو جاتی تھی۔

ایک روز اتوار کے دن وہ اپنے شوہر کے والدین سے ملنے ''ایمنسٹر'' جا پہنچی لیکن وہ لوگ گرجا گھر گئے ہوئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں اینجلز کے بھائی نے اُسے بہت بُرا بھلا کہا۔ ملاقات کا اب کوئی مطلب ہی نہ رہا تھا۔ لہٰذا وہاں سے مایوس ہو کر اُس نے واپسی کو ترجیح دی۔ وہ ''فلنٹ کیموبوس'' جا ہی رہی تھی کہ راستے میں ایک راہب کا وعظ سننے کے لئے کھڑی ہو گئی اور یہ دیکھ کر تو حیرت سے اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکل پڑیں اور وہ ہکا بکا رہ گئی وہ راہب کوئی اور نہیں ''ایلیک'' تھا۔ ٹیس کو پہچان کر وہ دیوانہ وار اس کی طرف لپکا اور اپنا احوال سننے کے لئے اس کی منت و سماجت کرنے لگا۔ اُس نے بتایا کہ وہ پادری کلیر کا مرید ہو چکا ہے اور اس مذہبی وعظ سُن کر اس کے قلب کی صفائی ہو چکی ہے اور اب وہ بالکل بدل چکا ہے۔ اُس کی بات سن کر ٹیس نے اپنا ردِّ عمل محفوظ رکھا اور مجمع سے نکل کر اپنی راہ لی۔ ٹیس کی خاموشی سے ایلیک کو حوصلہ ملا اور وہ ٹیس سے ملنے فارم پر جانے لگا۔ ٹیس اس سے قبل کہ اُس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتی۔ ایلیک نے اپنا راہبوں والا چغہ اُتار پھینکا اور پھر سے فیشن کا ماڈرن لباس زیب تن کر کے فارم پہنچ گیا اور کہا کہ ٹیس کی خاطر وہ اپنی راہبانہ زندگی ترک کر کے پھر سے پہلے ہی جیسا ہو گیا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھ کر اس کا کھویا وقار اسے واپس لوٹا دے۔ لیکن ٹیس نے حامی نہیں بھری کیونکہ اس کے دل میں اس کے خلاف جو نفرت کے جذبات مچلتے رہتے تھے اب اور بھی شدید ہو گئے تھے۔ اس کو اس بات کا بھی شدید صدمہ تھا کہ بیٹی کی بربادیوں کے غم میں اس کا باپ جیک دنیا سے چل بسا تھا اور اُس کے خاندان کے افراد بڑی زبوں حالی اور کسمپرسی کے عالم میں انتہائی المناک اور اذیتناک زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ وہ سب ایلیک کی وجہ سے ہی اس حال کو پہنچے تھے۔ فارم پر اُس کا اینجلز اور اُس کے خاندان والوں کو بُرا بھلا کہنا ان کا مذاق اُڑانا اور طنزیہ قہقہے لگانا بھی اسے سخت ناگوار گزرتا تھا۔

ایک دن ٹیس نے اینجلز کے نام ایک مفصل خط تحریر کیا جسے اُس کے باپ پادری کلیر کو پہنچا کر وہ اچانک ہی کہیں گم ہو گئی۔

ادھر اینجلز جب برازیل سے واپس گاؤں آیا تو بیک وقت اُسے دو خط ملے۔ ایک خط ٹیس کا تھا اور دوسرا کسی دوست کا۔ اُس کے دوست نے اپنے خط میں اسے مطلع کیا تھا کہ ٹیس بڑی مشکل میں ہے اور بڑی دردناک زندگی بسر کر رہی ہے۔ یہ پڑھنا تھا کہ اینجلز فوراً ہی دوڑا دوڑا اس کے گاؤں پہنچا اور اُس کی ماں سی مدد سے ٹیس کی تلاش شروع کر دی۔ تلاش کے بعد ''سنیٹ برن'' میں ٹیس کا ٹھکانہ ملا۔ لیکن جب وہ ٹیس کے مکان میں داخل ہوا تو اس پر بجلی سی گر پڑی۔ اسے یہ دیکھ کر انتہائی حیرتناک صدمہ پہنچا کہ وہ تنہا نہیں تھی اس کے ساتھ ایلیک بھی رہ رہا تھا۔

ٹیس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اینجلز کی طرف دیکھا اور گلوگیر آواز میں کہا۔ ''اب بہت دیر ہو چکی ہے۔''

اینجلز جس کے دل و دماغ میں طوفانی آندھیاں چنگھاڑ رہی تھیں ٹیس کے مکان سے واپسی

بعد مایوس و مغموم سر جھکائے اپنے راستے چلا جا رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر اور قطعاً اتفاقیہ اس کی مڈ بھیڑ ٹیس سے ہوگئی۔ تھوڑے ہی وقت میں یہ اُس کی ٹیس سے دوسری ملاقات تھی۔

وہ مفرور حالت میں تھی اور کہیں گم ہو جانا چاہتی تھی۔ اس شہر سے نکل کر وہ کسی دور افتادہ مقام پر بس کر دنیا والوں کی نظروں سے محفوظ ہو جانا چاہتی تھی۔ اینجلز کے اصرار پر ٹیس نے اُسے بتایا کہ اُس کی مکان سے واپسی کے بعد اُس نے چھرے کے پے در پے وار کر کے الیک کو ہلاک کر دیا ہے اور اب وہ قانون کی نظروں سے بچنے کے لئے یہاں سے دور کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں ہے۔

اینجلز نے مضبوطی سے اُس کی کلائی تھام لی اور اب وہ دونوں ہی ڈرے سہمے سے کھیتوں کھلیانوں اور جھاڑ جھنکاروں میں چھپتے چھپاتے ایک ویرانے کی طرف نکل گئے۔ جہاں ایک ویران کھنڈر میں انہیں سر چھپانے کو جگہ مل گئی۔ یہاں اینجلز کی صحبت میں گزرا وقت ٹیس کو اپنی زندگی کا سب سے سہانا اور مسرت بخش وقت محسوس ہوا۔

پانچویں دن وہ سب سے چھپتے چھپاتے ''اسٹون ہنج'' پہنچ گئے تھے۔ شام ہو چلی تھی اور اس سے پہلے کہ رات گھر آئے پر وہ آگے کے سفر پر نکلتے پولیس وہاں آ پہنچی اور جھپٹ کر ٹیس کو گرفتار کر لیا۔

ماہ جولائی تمازت آفتاب سے بری طرح تپ رہا تھا۔ ''ونٹوسینٹر'' جیسے تاریخی شہر کی جیل میں پھانسی دینے کی تمام تیاریاں مکمل کر لی گئی تھیں۔

شام کے وقت جیل سے ملحق ایک بلند ٹیلے پر کھڑا اینجلز جیل کے احاطے کے خوفناک اور لرزہ انگیز منظر اپنی آنکھون سے دیکھ رہا تھا۔ شام کا سورج جواب تیزی سے سیڑھی بہ سیڑھی سمندر کی گہرائیوں میں اُترتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ٹیس کی زندگی کا سورج بھی موت کے اندھیرے غار میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو چکا تھا اور اینجلز کے دل سے نکلی آہ اس کے سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

............☆☆☆............

☆......انتون چیخوف

☆......رفیق شاہین

چور چور

ایک پست قامت دبلے پتلے شخص کو جو ہاتھ کر گھے کی بُنی ہوئی قمیض اور پیوندردہ برجیس زیب تن کئے ہوئے تھا عدالت کے تحقیقاتی افسر (Court Investigator) کے رُوبرو پیش کیا گیا۔ اس کے چیچک کے نشانات زدہ چہرے پر بے تحاشہ بال اُگے ہوئے تھے اور گھنی بھوؤں کی چلمن سے جھانکتی اُس کی نصف ہی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ اپنے چہرے کے تاثرات کے لحاظ سے وہ بڑا دل گرفتہ اور اُداس اُداس دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھا اور اس کے گھنے اور اُلجھے ہوئے بے ترتیب بولوں پر مکڑی کا جالا لگے پھونس کے چھپر کا گماں ہوتا تھا۔

''گریگوریف!'' تحقیقاتی افسر نے اُس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تھوڑا میرے قریب ہو جاؤ اور میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دو''۔ جولائی کی سات تاریخ کو ریلوے کا چوکیدار اکنفوف جب کہ ریل کی پٹریوں کی نگہبانی میں مصروف تھا اُس نے یہاں سے ایک سو اکتالیس میل کے فاصلے پر تمہیں ریل کی پٹری سے بولٹ سے نٹ کھولتے ہوئے رنگے ہاتھوں دبوچ لیا تھا۔ یہ نٹ ریل کی فولادی پیڑیوں کو لکڑی کے تختوں کو جوڑنے کا کام انجام دیتے ہیں۔ تم نے جو نٹ کھولا تھا وہ یہ ہے اور اسی کے ساتھ ہی تمہیں گرفتار کر لیا گیا تھا اب بتاؤ یہ سب کیا ہے؟۔''

''حضور کیا کہا؟ میں سمجھا نہیں۔''

''اس معاملے میں اکنفوف نے تمہارے خلاف جو بیان دیا ہے کیا وہ سچ ہے؟۔''

''ہاں جی سچ ہے۔ جھوٹ نہیں ہے۔''

''بہت خوب! اب یہ بھی بتاؤ کہ ریل کی پٹری سے تم نے یہ نٹ کیوں کھولا تھا؟۔''

حضور! بات پلّے نہیں پڑ رہی ہے۔ میں ذرا موٹی عقل کا ہوں۔''

''بہانے بازی سے کام نہیں چلے گا۔ ٹھیک سے بتاؤ یہ نٹ تم نے کیوں کھولا تھا؟۔''

''ضرورت کے لئے حضور والا!'' گریگوریف نے بڑے تمسخرانہ انداز میں کہا

''حضور! اتنا تو آپ خود بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ضرورت نہ ہوتی تو میں یہ نٹ کھولتا ہی کیوں؟ مجھے کونسا باولے کتے نے کاٹا ہے۔''

''وہ ضرورت کیا تھی جس کی وجہ سے تم نے یہ نٹ کھولا تھا؟۔''

''حضور والا! یہ نٹ ہمارے لئے بڑے کام کی چیز ہیں۔ انہیں ہم لوگ مچھلی کے شکار کی چھڑی میں باندھتے ہیں۔''

''ابھی آپ نے ''ہم لوگ'' کہا اس ہم لوگ سے آپ کی مراد کیا ہے۔؟''

''ہم لوگ کا مطلب ہے میں اور کسان کلیموف۔''

''سنئے جناب! یہ احمقانہ انداز ترک کر دیجئے۔ یہ مچھلی کے شکار کی چھڑی بیچ میں کہاں سے آ گئی؟ آپ بات کو گھمانے کی کوشش نہ کریں اور میرے سوالوں کے جواب ذرا سنجیدگی سے دیں۔ آپ کے لئے یہی بہتر ہوگا۔''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں حضور! میں سچ بول رہا ہوں اور آپ مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہیں...... سرکار پیدا ہونے کے بعد سے آج تک میں تو جانتا ہی نہیں کہ جھوٹ کس بلا کا نام ہے میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ شکار کی چھڑی میں وزن باندھے بغیر کیا آپ مچھلی کا شکار کر سکتے ہیں؟ چلئے مان لیا آپ چھڑی کی ڈور میں چارے کے طور پر کینچوے باندھ لینگے...... مگر آگے کیا ہوگا؟...... کچھ بھی نہیں۔ یہ ڈوری میں بندھا چارہ تو پانی کی سطح کے نیچے بھی جائے گا جب آپ ڈوری کے ساتھ وزن بھی باندھ لینگے...... اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں...... اب آپ ہی بتائے بغیر وزن باندھے چارے کے پانی کی سطح پر تیرتے رہنے پر کیا مچھلیاں ہاتھ آ جائیں گی؟...... سرکار! آپ کو معلوم نہیں ہے ''پرچ'' ''پائک'' اور ''بربوط'' جیسی کام کی مچھلیاں زیرآب گہرائی میں ہی پائی جاتی ہیں اس لئے ڈوری میں وزن کو باندھ کر ہی چارے کو پانی کی گہرائی میں مچھلیوں تک پہنچایا۔ ورنہ اگر چارہ پانی کی سطح پر ہی پڑتا رہا تو چھوٹی مچھلی ''ایسپ'' بھلے ہی ہاتھ لگ جائے...... اور ایسپ بھی ہاتھ لگنا یوں ممکن نہیں ہے کہ وہ اُتھلے پانی میں ہی پائی جاتی ہے...... اور ہمارے علاقے میں تو وہ دور دور تک لاپتہ ہے۔''

''اب تم ایسپ مچھلی کے ذکر سے ہمارا وقت ضائع کر رہے ہو۔''

لیجئے آپ نے ہی پوچھا ہے اور آپ ہی ایسی بات کر رہے ہیں۔ سرکار میری بات کو سمجھئے...... ایک بچہ بھی اگر مچھلی کا شکار کھیلتا ہے تو وہ ڈور میں وزن ضرور ہی باندھتا ہے...... اب اگر وہ نرا اناڑی ہو اور وزن نہ باندھے تو نہ باندھے اس کے خلاف کوئی قانون تو ہے نہیں۔''

''خیر! تو تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ تم نے مچھلی کے شکار میں ڈور میں وزن باندھنے کی خاطر نٹ کھولا ہے۔؟''

''اور اتنی دیر سے کیا بتا رہا ہوں...... چلو آپ سمجھے تو...... ورنہ نٹ کا مجھے کونسا فولادی گھونسہ بننا ہے سوائے مچھلی کے شکار کے۔''

لیکن مچھلی کے شکار کے لئے نٹ ہی کیوں؟ وزن تو استعمال شدہ کارتوس لوہے کی کیل اور لوہے کی سلاخ سے حاصل کئے گئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بھی ہوتا ہے آپ نے ان کے استعمال پر غور کیوں نہیں کیا ہے؟۔۔۔۔''

''آپ تو بچوں کی سی باتیں کر رہے ہیں سرکار!...... کیا کیلیں اور کارتوس اور لوہے کی چھڑیں کیا سڑکوں پر پڑی مفت میں مل جائیگی؟...... آپ کیوں نہیں سمجھتے کہ نٹ میں سوراخ بھی ہوتا ہے...... وہ ڈور کے ساتھ آسانی سے بندھ جاتا ہے۔''

''کیسی احمقانہ باتیں کئے جا رہے ہیں...... یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اگر چوکیدار نے تمہیں نٹ کھولتے نہ دیکھا ہوتا تو ریل گاڑی پلٹ جاتی اور تمہاری نت کی چوری کتنے مُسافروں کو موت کی نیند سُلا دیتی۔''

''خدا نہ کرے میں کیوں کسی بے گناہ کی جان لینے لگا...... نہ تو میں کوئی بے دین کافر ہوں نہ

جلاد اور نہ ہی کوئی بے رحم قاتل...... مالک مجھے ظلم و تشدد سے دور ہی رکھے......"

"کیا تم نہیں جانتے کہ ریل گاڑیوں کو کس طرح حادثے پیش آتے ہیں؟ وہ اسی طرح پیش آتے ہیں کہ تم نے دو تین نٹ کھول لئے اور پھر جب گاڑی اس مقام پر آئی تو پٹری ڈھیلی ہو جانے کی وجہ سے پلٹ گئی۔"

"سرکار آپ تو نشے بازوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ سارا گاؤں نٹوں کی مالائیں بنا کر اپنے گدھوں کے گلوں میں ڈالے تو کچھ نہیں اور آپ کہتے ہیں کہ چھوٹے سے سائز کے تین نٹوں کے کھولنے پر اتنے بڑے سائز کی گاڑی پلٹ جائے گی۔ کہاں پہاڑ سی گاڑی اور کہاں بے چارہ ننھا نٹ......"

"مگر تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ لوہے کی پٹری کو جو ٹریک پر بچھے لکڑی کے تختوں سے جوڑ رکھتا ہے وہ یہی نٹ ہے۔"

"چلئے آپ کی بات مان بھی لیں مگر آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ میں نے سبھی نٹ نہیں کھولے ہیں۔ بہت سے بغیر کھولے چھوڑ دیے ہیں۔ دہقانی ہیں تو کیا ہوا تھوڑی بہت عقل تو ہمارے پاس بھی ہے۔"

"پچھلے سال یہاں ایک گاڑی پلٹ چکی ہے۔" تحقیقاتی افسر نے کہا۔ "اب میں سمجھا ہوں کہ گاڑی پلٹنے کی اصل وجہ کیا ہے؟"

"مگر سرکار آپ تو یہ بات سمجھ ہی نہیں پا رہے ہیں کہ وہ چوکیدار جس نے مجھے گرفتار کیا ہے وہ نا سمجھ ہے، ان پڑھ ہے۔ اس نے میرا گریبان تھاما اور گھسیٹتا ہوا مجھے تھانے لے گیا۔ کیا یہ غلط نہیں کہ گریبان پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اسے مجھے میرا قصور بتانا چاہئے تھا مگر اس کی عقل اُس کی گدھی میں ہے۔ اُس نے نہ صرف گریبان پر ہاتھ ڈالا بلکہ میرے چہرے اور چھاتی پر انگنت گھونسے بھی مارے تھے...... یہ بات بھی آپ نوٹ کر لیجئے۔"

"تم فالتو باتوں سے پرہیز کرتے ہوئے پہلے میرے اس سوال کا جواب دو کہ تلاشی لینے پر تمہارے گھر سے بھی ایک نٹ برآمد ہوا ہے۔ ہم جاننا چاہتے ہیں تم نے کب کہاں سے یہ نٹ کھولا ہے؟"

"اچھا تو آپ کا اشارہ اُس نٹ کی طرف ہے جو لال رنگ کی چھوٹی سی صندوقچی میں رکھا ہوا تھا۔"

"کہاں رکھا تھا اور کیسے رکھا تھا؟ مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے صرف یہ جاننا ہے کہ تم نے یہ نٹ کب اور کہاں سے کھولا ہے؟"

"یہ نٹ میں نے کہیں سے بھی نہیں کھولا ہے۔ مجھے تو یہ کبڑے سیمیون کے بیٹے اگناشکا نے دیا ہے۔ یہ میں اُسی نٹ کی بات کہہ رہا ہوں جو آپ کو لال صندوقچی میں ملا ہوگا۔ اُس نٹ کے بارے میں نہیں کہہ رہا ہوں جو سلیج یعنی برف پر پھسل کر چلنے والی بلا پہیوں والی گاڑی میں رکھا ہوا ہے یہ والا نٹ میں نے اور متروفان نے مل کر کھولا تھا۔"

"یہ متروفان کون ہے؟"

"ارے تعجب ہے کہ آپ متروفان کو نہیں جانتے۔ متروفان پیتروف وہی ہے جو مچھلی کے شکار کے لئے جال بن کر بازار میں بیچتا ہے۔ بے چارے کو ہر دم بہت سے نٹوں کی ضرورت رہتی ہے

کیونکہ ایک ہی شکاری جال تیار کرنے میں خُدا جھوٹ نہ بلوائے زیادہ نہیں تو کم از کم دس نٹ تو خرچ ہو ہی جاتے ہیں۔

''اوہ!۔ تحقیقاتی افسر ماتھے کا پسینہ رومال میں جذب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''میرا خیال ہے میں اب تمہیں تعزیزات رُوس کی دفعہ ایک ہزار کیا سی پڑھ کر سُنا ہی دوں۔ غور سے سُنو۔ مذکورہ بالا دفعہ کا لب لباب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ جان کر بھی اس کے عمل سے تباہی و بربادی اور ہلاکت خیزی جیسے مہلک نتائج برآمد ہونگے بین الاقوامی روسی ریلویز کو نقصان پہنچاتا ہے تو مذکورہ بالا دفعہ کے تحت عمر قید کی سزا کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ تو آیا سمجھ میں کہ اس نٹ کی چوری کا کیا نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے؟ اب یہ مت کہنا کہ تم بڑے بھولے ہو اور یہ جرم تم سے انجانے میں ہوا ہے۔''

''حضور! یہ بات تو آپ ہمیں تب بتائیں جب ہماری کھوپڑی میں تھوڑی بہت عقل ہو...... ایسی پیچیدہ باتیں تو آپ جیسے دانشور ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ہم تو سرکار! نرے گنوار لٹھ ہیں۔''

''تم سب سمجھتے ہو۔ مکر و ریا کاری سے تم ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔''

''سرکار! میں جھوٹ کیوں بولوں گا؟ مکاری کیوں کروں گا؟...... آپ گاؤں چل کر کسی سے بھی پوچھ لیجئے۔ ہر کوئی آپ کو یہ بتا کر قائل کر دیگا کہ بغیر وزن باندھے قاعدے کی مچھلی پکڑنا کسی طور بھی ممکن نہیں ہے۔ تبھی تو میں بھی ڈور میں نٹ باندھتا ہوں۔ اگر ایسا نہ کروں تو ایسپ سے بھی بدتر مچھلی کانٹے میں نہیں پھنس پائے گی۔''

''پھر وہی ایسپ؟ چلو یہی بتادو کہ ایسپ کے بارے میں تم کیا کیا جانتے ہو؟''

''اجی بتانا کیا ہے۔ آپ کانٹے میں تتلی پھنسا کر اسے سطح آپ پر تیرنے دیں اور وزن نہ باندھیں تو خود آزما کر دیکھ لیجئے شاید کوئی ایسپ پھنس جائے جبکہ یہ بھی ممکن نظر نہیں آتا کیونکہ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ ہمارے علاقے میں ایسپ ہوتی ہی نہیں ہے۔''

''اچھا! بہت ہوگئی بیان بازی، اب آپ خاموشی اختیار کریں۔''

تحقیقاتی افسر سر جھکا کر کچھ لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ نٹ چور متذبذب سا کبھی افسر کے چہرے پر نظر ڈالتا ہے اور کبھی کاغذ پر تھرکتے ناچتے اس کے قلم پر۔ پھر افسر کے چہرے پر نظر ڈالتا ہے اور کبھی کاغذ پر تھرکتے ناچتے اس کے قلم پر پھر وہ گھبراہٹ سے پریشان ہو کر کھلے میں پہنچنے کی خاطر کہتا ہے۔

''بیان مکمل ہو گیا ہے تو سرکار! میں اب جاؤں؟''

''ابھی نہیں زاب میں تمہیں سرکاری محافظوں کی نگہبانی میں جیل بھیجونگا۔''

گریگوریف جلدی جلدی پلکیں جھپکا کر اور گھنی بھوؤں کے جھاڑ کے نیچے سے آنکھیں چمکا کر پوچھتا ہے۔

''سرکار جیل سے آپ کی مراد کیا ہے؟ میرے پاس فالتو وقت بالکل بھی نہیں ہے۔ مجھے یہاں سے میلے جا کر ایگور سے مچھلی کی چربی کے تین روبل وصول کرنے ہیں۔''

''خاموش ہو جاؤ۔ مجھے اپنے کام میں مداخلت پسند نہیں ہے۔''

''اگر جیل جانے سے کوئی فائدے کی امید ہوتی تو چلا بھی جاتا۔ میں نے نہ تو چوری کی ہے نہ ہی کسی سے رشوت لی ہے۔ اگر حضور والا کو ٹیکس کی نادہندگی کا شبہ ہے تو وہ بھی بے بنیاد ہے۔ آپ یلدار کی بات پر تو بالکل بھی یقین نہ کریں۔ وہ سچا عیسائی نہیں ہے۔ اُس کے بارے میں آپ کسی سے بھی دریافت کر سکتے ہیں۔''

''خاموش رہو!......ایک دم خاموش۔''

''لیجئے آپ فرماتے ہیں تو ہو گیا خاموش۔ مگر یہ بات میں قسمیہ طور پر کہہ رہا ہوں کہ یلدار پکا بے ایمان ہے......اُس کے حساب کتاب میں گڑبڑ ہے۔ دراصل ہم تین بھائی ہیں کزما گریگوریف، ایگور گریگوریف اور میں یعنی دینس گریگوریف......''

''یہ شخص چپ ہونا تو جانتا ہی نہیں ہے......میرے کام میں مسلسل مخل ہو رہا ہے......سیمیون! لے جائے اسے۔''

جب دو لحیم شحیم پولیس والے اُس کے بازو مضبوطی سے گرفت میں لے کر اُسے تحقیقاتی افسر کے دفتر سے باہر لے جانے لگے تو وہ بڑبڑانے لگا۔

''یہ ظلم ہے......زیادتی ہے......بے انصافی ہے......ہم تین بھائی ہیں......ایک بھائی کے جرم کا دوسرا بھائی ذمے دار کیسے ہو سکتا ہے......یہ صریحاً بے انصافی ہے......جو سرکاری ٹیکس کی چوری کرتا ہے وہ میں نہیں ہوں......میرا بڑا بھائی کزما گریگوریف ہے......جرم کسی کا اور سزا کسی کو......واہ رے انصاف کرنے والو......صحیح معنوں میں ایماندار جج تو وہ جنرل تھا جو اب اس دنیا میں نہیں ہے......خدا جنت میں اُسے زیادہ سے زیادہ حور و غلمان سے نوازے!۔ اگر آج وہ زندہ ہوتا تو ضرور مجھ سے انصاف کرتا اور ......تمہارے عدم انصاف پر تمہارے اچھی طرح خبر لیتا۔''

پولیس والے اُسے اپنے ساتھ لئے گاڑی میں سوار ہو جاتے ہیں۔ گاڑی آگے بڑھ جاتی ہے اور اسی کے ساتھ ہی دینس گریگوریف کی بڑبڑاہٹ کی آواز بھی معدوم ہو جاتی ہے۔

☆......انتون چیخوف

☆......رفیق شاہین

(طنز و مزاح سے بھرپور دلچسپ روسی کہانی)

شکار اور شکاری

''کیا تم شادی کرنے جا رہے ہو۔'' رقص گاہ میں پیوتر پیترووچ کے ایک دوست نے اُس پر بالکل ہی غیر متوقع طور پر یہ سوال ٹھونک دیا۔ ''اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ شادی کے سلسلے میں دوستوں کو اسٹیگ پارٹی کب دے رہے ہو؟

''تم سے یہ کس احمق نے کہہ دیا اور تم نے یہ کہاں سے سُن لیا کہ میں شادی کرنے والا ہوں؟'' پیترووچ نے حیرت و استعجاب کا مظاہرہ کیا۔

''کیا بات کرتے ہو سبھی لوگ تو کہہ رہے ہیں اور اس بات کی شہادتیں بھی موجود ہیں۔ پیارے دوست اب بات چھپنے والی نہیں ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو ہم کچھ نہیں جانتے ہیں۔ ہم تو اُڑتی چڑیا کے پَر بھی گن کر بتا دیں کہ کتنے ہیں۔ تم ہم سے چھپانے کی کوشش مت کرو۔ ہمیں سب کچھ پتہ ہے ہیہ...... ہیہ...... ہیہ...... ہا'' ......اس بات کے تو خاصے معقول ثبوت بھی موجود ہیں۔ تم اپنا بیشتر وقت کوندراشکن کے یہاں گزارتے ہو۔ وہاں باقاعدہ طور پر ڈنر اور سپر میں شریک رہتے ہو۔ رومانی بیلیڈ نظمیں گا گا کر سُناتے ہو۔ اور پھر تم کسی اور کے ساتھ تو سیر سپاٹے کے لئے جاتے نہیں ہو ناستیا ہی ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوتی ہے۔ اُس کو تحفے میں پھولوں کے گلدستے پیش کئے جاتے ہیں۔ ہمیں ایک ایک بات معلوم ہے جناب! کل ہی تو میری ملاقات ناستیا کے ڈیڈی سے ہوئی تھی۔ شادی کے حوالے سے وہ کہہ رہے تھے کہ آخری مرحلہ بھی بس طے ہی سمجھو۔ کیا پتہ کہ تم شہر بھی نہ پہنچ پاؤ اور شادی اپنے انجام کو پہنچ چکی ہو۔ خیر! اچھا ہی ہے آپ پر کرمِ الٰہی بنا رہے۔ اس معاملے میں میری نیک خواہشات تم سے بھی زیادہ کوندراشکن کے ساتھ ہیں۔ بے چارا ایک دو نہیں اکٹھی سات بیٹیوں کا باپ ہے۔ سات عدد بیٹیوں کا باپ ہونا کوئی مذاق نہیں ہے جناب! یہ تو اچھی ہی بات ہے کہ غریب کے سَر سے ایک بیٹی کا بوجھ تو کم ہو ہی جائے گا۔''

''مر گئے۔'' پیترووچ نے سرد آہ بھری۔ یہ دسواں شخص ہے جس نے پچھلوں کی طرح ناستیا سے شادی کی بابت مجھ سے سوال کیا ہے۔ آخر یہ لوگ قیاس کے گھوڑے دوڑا کر ایسے اُوٹ پٹانگ نتیجے کیسے برآمد کر لیتے ہیں۔ لعنت ہو ان کی شکلوں پر۔ محض اتنی سی بات پر کہ میں کوندراشکن کے یہاں ڈنر قبول کر لیتا ہوں اور ناستیا کے ساتھ نظر آ جاتا ہوں بس اتنی ہی بات اور یار لوگوں کی ایسی ایسی بے پَر کی قیاس آرائیاں...... کہتے ہیں شادی......نہیں......قبل اس کے کہ میں کسی مشکل میں پھنس کر رہ جاؤں۔ مجھے سب کا منہ بند کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر اختیار کرنا ہی ہوگی کیونکہ خطرہ قریب تر ہے۔ میں کل ہی

کوندراشکن کے گھر جا کر اُس کھوکھلی کھوپڑی کی خوش فہمیوں کی مالا کے سارے دانے بکھیر کر رکھ دوں گا تا کہ وہ مجھے داماد کی نظر سے دیکھنا بند کر دے۔ یہی اس سَر آ پڑی مصیبت سے بچ نکلنے کا واحد حل ہے۔ کوندراشکن سے ایک خاص ملاقات اور سارے مسئلے ختم...... ہے ہو...... ہے ہو...... ہے ہو......۔

اگلے ہی دن ملکین کوندراشکن کے گھر جا پہنچا۔ کوندراشکن اپنی مطالعہ گاہ میں تھے۔ وہ وہیں پہنچ گیا۔

''آیئے پیترووچ ملکین! آیئے...... تشریف لایئے۔'' میزبان نے مہمان کا حسب معمول بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔ پھر وہ ہاتھ نچا کر بڑی خوش مزاجی سے بولے۔''اپ کیا کرو گے؟ وہ تو گم ہوگئی۔ ہا...... یا...... ہا...... پریشاں نہ ہو میرے عزیز! میں تو مذاق کر رہا تھا۔ وہ گوسیو کے یہاں کوئی بات پوچھنے گئی ہے وہ بس آتی ہی ہوگی۔''

بات دراصل یہ ہے کہ میں یہاں ناستیا کریلوونا سے ملنے نہیں آیا ہوں۔'' ملکین کہنے کو تو یہ کہہ گیا مگر دل پر گھبراہٹ کے بوجھ کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ ہڑبڑاہٹ میں اُس نے آنکھیں مسلتے ہوئے ہمّت دکھائی اور کہا:

سچ پوچھیئے تو بس میں آپ ہی کے پاس آیا ہوں تا کہ کسی مسئلے پر آپ سے گفتگو کا شرف حاصل کرسکوں...... دراصل میری آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے۔''

''اوہ! تو کچھ آنکھ میں پڑ گیا ہے ؟...... تو کیا یہی بات تم مجھ سے کہنے آئے ہو؟'' کوندراشکن نے زیرلب مُسکراتے ہوئے بڑے معنی خیز انداز میں پلکیں جھپکائیں۔ ہی...... ہی...... ہی...... کالا ہے...... جانتا ہوں دال میں کالا کچھ ہے ضرور...... تمہاری اس گھبراہٹ سے ناواقف نہیں ہوں...... خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کیا بات کرنا چاہتے ہو...... کیا کہنا چاہتے ہو...... وقت کوئی ناموزوں تو ہے نہیں ہے...... پھر کیسا تکلف...... ہی...... ہی...... ہی۔''

بات دراصل یہ ہے کہ میں...... کہ میں آپ کو الوداع کہنے آیا ہوں...... میں یہ شہر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔'' بالآخر ہمت سے کام لے کر اُس نے دھما کہ کر ہی دیا۔ وہ کیا؟...... تم شہر چھوڑ کر جا رہے ہو؟ ...... میں سمجھا نہیں...... آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟......؟ کوندراشکن کا چہرا فرط حیرت سے متغیر و متبدّل ہو اُٹھا تھا اور اُس کی آنکھوں کے حلقے پھیل کر چوڑے ہوگئے تھے۔ کوئی اہم بات نہیں ہے...... سادہ سی بات ہے...... مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کی مشفقانہ رواداری، وضعداری اور مہمان نوازی کے لئے آپ کا شکریہ ادا کروں...... آپ کی بیٹیاں بھی ماشاءاللہ بڑی مہذب با اخلاق اور نیک سیرت واقع ہوئی ہیں۔ میں اُنہیں کبھی فراموش......۔'''' بس سُن لیا...... اب مجھے بھی کچھ کہنے دو۔'' کوندراشکن جس کا چہرہ دہکتے انگارے کی طرح لو دے اُٹھا تھا اُس نے ملکین کی بات کو درمیان میں قطع کر دیا۔ ''تم میری سمجھ سے تو بالاتر ہو میرے عزیز! ...... مانتا ہوں کہ ہر شخص اپنی مرضی کا مالک و مختار ہوتا ہے...... تم بھی ہو...... اور جانا چاہو تو جا بھی سکتے ہو مگر بات یہ نہیں ہے بچّے! ...... اصل بات تو یہ ہے کہ تم ذمہ داری سے صرفِ نظر کر رہے ہو...... تم اصل معاملے سے بچ نکلنا چاہتے ہو اور یہ صریحاً بداخلاقی ہے...... بددیانتی ہے جناب!''

''مم...... مم...... میں سمجھا نہیں۔'' ملکین نے حیرت سے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھا نہیں

میں کس معاملے سے نکل رہا ہوں؟...... کس بات سے مُکر رہا ہوں؟ کیسے......؟...... آخر کس طرح؟''

''اس طرح جناب والا! اس طرح کہ گرمیوں بھر تمہارا یہاں آنا جانا رہا۔ ڈنر میں، سیر میں تم برابر شریک ہوتے رہے۔ لڑکیوں سے گپ شپ فرماتے رہے اور اب تمہارا یہ فرمانا کہ تم شہر چھوڑ کر جارہے ہو، آخر یہ سب کیا ہے؟''

''مگر میں نے کوئی آسرا نہیں دیا۔ کوئی جھوٹی اُمید نہیں بندھائی تھی۔''

''بیشک تم نے شادی کی تجویز پیش نہیں کی تھی مگر تمہارے طور طریق سے کیا یہ واضح نہیں تھا کہ تمہارا جُھکاؤ کس طرف ہے اور تم کیا چاہتے ہو۔ تم نے ہر روز کھانے میں ہمارے ساتھ شرکت کی، تم ناستیا کا ہاتھ ہاتھ میں لئے سیر وتفریح کو جاتے رہے اور اس سب کی تمہاری نظر میں کوئی اہمیت کوئی وقعت نہیں۔ اس طرح روز روز کے کھانوں میں منگیتر ہی شریک ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں تمہاری حیثیت کیا منگیتر کی نہیں ہے۔ کیا یہ سب میں بے سبب ہی کہہ رہا تھا؟ ہاں میرے محترم یہ صریحاً بددیانتی ہے۔ بہتر ہوگا تم شادی کا پیام پیش کرو۔ نہیں تو پھر......'' ''دیکھیئے میں مانتا ہوں ناستیا ایک خوش خصلت اور نیک سیرت خاتون ہیں، میں اُن کا دل سے احترام کرتا ہوں مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ ایک اچھی بیوی ثابت نہ ہو سکے گی۔ ہم دونوں کے درمیان بُعدِ قطب المشرقین ہے...... میرا مطلب ہے خیالات ونظریات میں فرق ہے۔''

''اتنی سی بات؟'' کوندراشکن نے مُسکرانے کی کوشش کی۔ ''میں تو جانے کیا سمجھ بیٹھا تھا مگر اتنی سی بات...... میرے بھولے بھالے نادان نوجوان! میری سمجھ میں تو یہی نہیں آتا کہ تم لوگ کیوں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو؟ تم کیوں نہیں مان لیتے کہ شوہروں کو ہم خیال بیویاں ملنا تو ممکن ہے ہی نہیں کیا لڑکپن والی نادانی کی بات کی ہے تم نے۔ تم نے تو اس بے بات کی بات پر میرے سَر پر پہاڑ ہی گرادیا تھا۔ مانا کہ فی الوقت تم دونوں کے خیالات میل نہیں کھاتے ہیں لیکن جب شادی کے بعد تم ایک ساتھ رہنا شروع کردو گے تو رفتہ رفتہ خیالات کا یہ ٹکراؤ ایک دن ختم ہو جائے گا اور ازدواجی زندگی میں خود بخود ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی، استحکام آجائے گا۔ اب یہی دیکھ لو کہ ایک تازہ اور نئی سڑک پر پاؤں رکھنا بھی مشکل ہوتا ہے مگر بعد میں لوگ اس پر رواں دواں گزرتے ہیں۔''

''آپ بجا فرماتے ہیں اور میں خود بھی مانتا ہوں۔'' ملکین نے بات سے نئی بات نکالنے کا گُر آزمایا۔ ''لیکن بات ناستیا کریلوونا کی نہیں میری ہے کہ میں خود ہی اُن کے لائق نہیں ہوں۔''

''ارے واہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ کون مان لے گا کہ تم سا لائق نوجوان ناستیا کے لائق نہیں ہے۔''

''آپ ایسا اس لئے کہہ رہے ہیں کہ میں نے آپ سے یہ بات چُھپا کر رکھی ہے کہ میں کوئی رئیس وثروت مند نہیں ہوں بلکہ ایک مفلس وقلاش ہوں۔''

''دولت مند نہیں تو نہ سہی۔ تمہیں ہر ماہ جو تنخواہ ملتی ہے وہی بہت ہے۔''

''مگر بات آمدنی کی نہیں ہے، بُری عادت کی ہے، بُری عادت کی ہے۔ میں ایک رندِ بلانوش بھی تو ہوں رات دن شراب میں غرق رہتا ہوں۔''

''یہ بات تو اس سے پہلے میرے علم میں نہیں تھی۔ مگر تم نوجوان ہو۔ اس نوخیز عمر میں کوئی شراب سے کیسے بچ کر رہ سکتا ہے۔ اپنے وقت میں کبھی میں بھی جوان تھا میں کیوں جھوٹ بولوں میں نے

بھی پی ہے اور خوب پی ہے۔ شراب ہے ہی ایسی چیز جو اچھے اچھوں کو اپنے شیشے میں اُتار لیتی ہے۔"

"لیکن میں کوئی ایسا ویسا شرابی نہیں ہوں۔ مجھے شراب کی لت اپنے اجداد سے ورثے میں ملی ہے۔ میں جام پہ جام لنڈھاتا چلا جاتا ہوں۔"

"مجھے یقین نہیں آتا کہ شراب تم سے کٹریل جوان کو مغلوب کرسکتی ہے۔ اپنا غلام بنا سکتی ہے۔"

"اس رنگیلے سیار بوڑھے سے چھٹکارہ پانا تو بڑی ٹیڑھی کھیر معلوم ہوتا ہے۔" ملکین نے سوچا۔ "یہ تو ہر قیمت پر بیٹی کو میرے سَر منڈھنے پر تلا ہے۔" اپنی سی ہر ممکن کوشش کرتے اُس نے ایک اور بڑا پتہ بھی پھینک دیا۔

"آپ کا یہ بڑکپن ہے کہ آپ نے میری مے نوشی کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مگر میرا دامن سماجی اور اخلاقی بُرائیوں سے بھی تو داغدار ہے کہ میں رشوت بھی تو لیتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں میرے بچّے! تم سچ بولتے ہو یہ بڑی بات ہے۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ اگر تم رشوت لیتے ہو تو کون سی نئی بات ہوگئی۔ آج کے روس میں تو سبھی رشوت لیتے ہیں۔ شریر نوجوان! کیا تم یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ تمہارے اس انکشاف پر میں صدمے سے بیہوش ہو جاؤں گا۔"

"ایک اور بھی اہم بات جسے بتانے کا حوصلہ نہ ہوسکا اب بات نکلی ہے تو لگے ہاتھوں وہ بھی بتادوں۔" "مجھ پر غبن کا مقدمہ چل رہا ہے۔ جب تک کہ مقدمے کا فیصلہ نہ ہوجائے میں یہ شادی کرنے سے معذور ہوں۔"

"مقدمہ؟...... غبن کا؟" کوندراشکن ہونے والے داماد کے اس دھماکہ خیز انکشاف پر دم بخود رہ گئے۔

"تب تو ٹھیک ہی کہتے ہو...... شادی سے پہلے مقدمے کا فیصلہ ضروری ہے۔"

"کہا کوئی بڑا غبن کیا ہے؟"

"یہی کوئی چوالیس ہزار ایک سو روبل کا۔"

"بڑی رقم ہے۔" کوندراشکن نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "اس کا صاف مطلب ہے سائبیریا کی جلاوطنی اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ یہ شادی لڑکی کی بربادی ہی ثابت ہوگی۔ اب کیا ہوسکتا ہے۔ جاؤ...... خدا تمہارا نگہبان ہو۔" اتنا سُن کر ملکین کی جان میں جان آ گئی۔ اُس نے سکون کا لمبا سانس لے کر اپنا ہیٹ اُٹھایا اور ابھی وہ اپنی جگہ سے اُٹھ بھی نہ پایا تھا کہ "پھر بھی تو یہ" کوندراشکن نے بات آگے بڑھائی۔ "اگر ناستیا تم سے محبت کرتی ہے تو اُسے تمہارے ساتھ سائبیریا جانے میں کیا عذر ہوسکتا ہے۔ وہ محبت ہی کیا جو ایثار و قربانی کی آزمائش پر کھری نہ اُترے۔" "تمسک گبیر نیا" سائبیریا کا بڑا زرخیز علاقہ ہے۔ میرے عزیز یقین مانو سائبیریا میں زندگی یہاں کے مقابلے میں بدرجہا بہتر ہے۔ اگر میرے ساتھ خاندانی مجبوریاں نہ ہوتیں تو میں اس علاقے پر سائبیریا کو ترجیح دیکر کب کا وہیں منتقل ہوگیا ہوتا۔ بہتر ہوگا اب تم شادی کے لئے اپنی منظوری میں تامل سے کام نہ لو۔" "یا خدا! یہ بوڑھا ...... کس قدر خود غرض ہے۔" ملکین نے سوچا۔ "یہ تو اپنی بیٹیوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے اُنہیں ابلیس کی زوجیت میں ڈھکیلنے، یا اُنہیں جہنم میں جھونکنے کے لئے بھی تیار ہوجائے گا۔"

ملکین اس احساس سے افسردہ ہوگیا کہ ...... اتنی کوششوں کے باوجود بھی ابھی وہ اس

بوڑھے شکاری کے جال سے رہا نہیں ہو پایا ہے۔ اُس کی ساری چالیں بے اثر ہو چکی ہیں، سارے مہرے پِٹ چکے ہیں۔ اُس نے جال میں پھنسے پنچھی کی طرح ایک بار پھر اپنے پَر پھڑ پھڑائے۔

''معاملہ محض غبن کا نہیں ہے۔ خدشہ تو اس بات کا بھی ہے کہ وہ مجھے چار سو بیسی کے معاملے میں ضرور پھانسنے کی کوشش کریں گے۔

''تو کیا ہوا ؟۔ اس سے کیا ڈرنا۔ دونوں دفعات کی سزا تو ایک ہی ملنی ہے۔ میری سمجھ میں یہی نہیں آتا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو تم اہمیت دیتے ہی کیوں ہو۔''

''بات اہمیت کی نہیں ہے۔'' ملکین نے ایک اور اُڑان بھرتے ہوئے کہا۔ میرا سب سے بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں نے ہر بات آپ کو بتائی ہی کہاں ہے۔ میرے سینے میں ایک اور بھی راز پَل رہا ہے۔ خدا کے لئے مجھے وہ راز اُگلنے پر مجبور نہ کیجئے گا۔''

''مجھے کوئی راز واز نہیں اُگلوانا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ سرے سے کوئی راز ہے ہی نہیں۔''

''کاش ! ایسا ہی ہوتا میرے محترم و مشفق جناب کوندراشکن !۔ راز ہے اور وہ راز اگر میں آپ کو بتا دوں تو آپ کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک جائے گی اور یہ جاننے کے بعد کہ میں کون ہوں آپ کا چہرا فق پڑ جائے گا۔ دراصل میں قید خانے سے بھاگا ہوا ایک مفرور مجرم ہوں۔''

کوندراشکن کو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا۔ خوف زدہ ہو کر انہوں نے اپنی کمر کرسی کی پُشت سے ٹکا دی۔ وہ تحیر و استعجاب کا مجسمہ بنے رہ گئے۔ اور کچھ ایسے دم بخود ہوئے کہ اُن کی زبان ہی گنگ ہو کر رہ گئی۔ وہ اُسے ٹکٹکی باندھے تکے جا رہے تھے جیسے ملکین میں انہوں نے کوئی بھوت چھپا دیکھ لیا ہو...... کوئی غلیظ کراہیۃ النظر اور ہولناک و ہیبتناک بھوت۔ اُنہوں نے سرد آہ بھری اور بے جان سی آواز میں بولے۔

''یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں جس کی مہمان نوازی اور خاطر و مدارات جی و جان سے کر رہا ہوں وہ ایک دن آستین کا زہریلا سانپ نکلے گا۔ اب یہاں بیٹھے ہی کیوں ہو۔ میں تمہاری صورت تک دیکھنا نہیں چاہتا ہوں جاؤ۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ جاؤ۔''

کوندراشکن کی ناراضگی کو اپنی رہائی کا پروانہ مان کر اور موقع غنیمت جان کر ملکین نے جلدی سے اپنا ہیٹ اُٹھایا اور دروازے کی طرف لپک کر قدم آگے بڑھا دیے کہ پیچھے سے کوندراشکن کی گرجدار آواز سُنائی پڑی۔

''رُک جایئے۔ تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ جب تم قانون کو چُھل دے کر ایک بھاگے ہوئے مفرور مجرم ہو تو گرفتاری سے کیسے بچے ہوئے ہو؟''

''میں یہاں اصلی نام کے بجائے فرضی نام سے رہ رہا ہوں اس لئے میری گرفتاری اتنی آسان نہیں ہے۔''

''پھر تو یہ بھی ممکن ہے کہ تم تبدیلی اسم کے ساتھ جیسے اب رہ رہے ہو ویسے عمر بھر بھی رہ سکتے ہو۔ کسی کو پتہ ہی نہ چلے گا کہ تمہاری اصلیت کیا ہے اور تم کون ہو۔ میں جانتا ہوں تم ایک سیدھے سچے باضمیر انسان ہو۔ تمہیں ارتکاب گناہ پر ندامت ہے۔ تم پچھتاوے کی آگ میں جل رہے ہو۔ خدا سے یہ بات چھپی نہیں ہے۔ وہ تمہیں بخش دے گا۔ کوئی بات نہیں...... چلو شادی کے لئے راضی ہو جاؤ۔''

ملکین پسینہ پسینہ ہوگیا۔ اُس کے تاش کے پتوں میں سب سے بڑا ٹرپ کا پتہ یہی تھا۔ مفرور قیدی والا۔ اب جب یہ بھی پٹ گیا تو اُسے بس ایک ہی راستہ سجھائی دے رہا تھا کہ وہ مزید بحث و تمحیث کے پھیر میں پڑنے کے بجائے کانوں میں تیل ڈال کر یہاں سے چپ چاپ کھسک لے۔ قبل اس کے وہ خیال کو عملی جامہ پہنائے کہ ناگاہ ہی ایک نیا خیال اُس کے دماغ میں بجلی کی طرح کوند گیا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے فالتو باتوں سے آپ کا وقت ضائع کیا ہے۔ خیر اب کام کی بات بھی بتائے دیتا ہوں کہ میری اصل مجبوری کیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ایک پاگل ہوں اور پاگل کی شادی قانوناً ممنوع ہے۔''

''تم کو پاگل کوئی پاگل ہی کہہ سکتا ہے۔ ایسے منطقی استدلال سے بات کرنے والا جو اچھے اچھوں کو پاگل بنا کر رکھ دے وہ کیسے پاگل ہو سکتا ہے۔ نہیں میرے بچّے! اس بات پر میں کبھی یقین نہیں کر سکتا...... ناممکن...... بالکل ناممکن۔''

وہ یہ بات آپ عدم واقفیت کی بنا پر کہہ رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کچھ پاگل ایسے بھی پائے جاتے ہیں جن پر کبھی کبھی ہی پاگل پن کا دورہ پڑتا ہے جب کہ باقی اوقات میں وہ عام لوگوں کی طرح نارمل زندگی بسر کرتے ہیں۔''

''مہربانی فرما کر وہ بات مت کرو جس پر میں کبھی یقین نہیں کر پاؤں گا۔ اب تم خاموش ہی ہو جاؤ تو اچھا ہے۔''

''اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے پاگل پن کی سند بھی آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔''

''کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ میں ڈاکٹر کی سند پر تو یقین کرلوں گا مگر اس بات پر نہیں کہ تم پاگل ہو۔ تم جیسا اچھا بھلا تو پاگل ہو ہی نہیں سکتا۔''

اب شکاری کے جال سے رہائی کے لئے اس نے اُمید کی آخری کرن کا ہی سہارا لینا ناگزیر سمجھا۔ اُس نے کہا۔ ''آپ کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میں ڈاکٹر سے سند لے کر ابھی آتا ہوں۔''

اتنا کہہ کر اور کانوں میں تیل ڈال کر اس نے سَر پر اپنا ہیٹ رکھا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ وہاں سے نکل آیا۔

اس کے ٹھیک پانچ منٹ کے بعد وہ اپنے ڈاکٹر دوست فیولیف کے پاس اُس کے کلینک میں بیٹھا ہوا تھا۔ اب یہ اُس کی بدقسمتی ہی تھی کہ ایک ہی منٹ پہلے ڈاکٹر کی کسی بات پر اپنی بیوی سے جھڑپ ہو چکی تھی اور وہ شدید ذہنی تناؤ کا شکار تھا۔

''عزیز دوست! مجھے ایک خاص معاملے میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ کچھ لوگ مجھے اپنے جال میں پھانسنے کا تہیہ کئے بیٹھے ہیں۔ اس سے بچ نکلنے کی ایک ہی تدبیر ہے، شیکسپیئر کے ''ہیملٹ'' والی تدبیر یعنی خود کو پاگل ثابت کر دینا۔ اور یہ بات تو آپ خود بھی جانتے ہوں گے کہ پاگل کے لئے شادی قانوناً ممنوع ہے۔ مہربانی کر کے آپ میرے پاگل پن کی سند مجھے عطا کر دیجیے۔''

''کیا تم شادی کرنا نہیں چاہتے؟ ڈاکٹر نے سوال کیا۔''

''ایک فیصدی بھی نہیں۔ اگر کائنات کی ساری دولت میرے قدموں میں ڈال دی جائے تب بھی نہیں۔''

''اگر ایسا ہے تو معاف کیجیے گا میں آپ کو پاگل پن کا سرٹیفکیٹ نہیں دے سکتا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''جو شخص شادی سے گریزاں ہے، کسی بھی قیمت پر شادی کے لئے رضامند نہیں۔ وہ تو پاگل ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا معاف کیجیے گا میں یہ نہیں کرسکتا۔ البتہ جب تم شادی کے لئے تیار ہو جاؤ تو میرے پاس چلے آنا میں تمہیں پاگل پن کی سند دیدوں گا۔''

....

☆......گائی دی موپاساں

☆......رفیق شاہین

نئے رشتوں کی نئی فصل

(نئے رشتوں کی مہک سے مشامِ جاں کو معطر کرنے والی فرنچ کہانی)

دیہات کی وسیع ملکیتِ آراضی میں جہاں ایک جانب وسیع فارم واقع ہیں۔ تو دوسری طرف محل نما عالیشان حویلیاں جن میں کبھی شاہی القاب سے سرفراز ''بیرن'' (BARON) جیسی عظیم المرتبت ہستیاں رہا کرتی تھیں آج کل ان میں علاقے کے مقامی دولت مند زمیندار بود و باش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی زمینداروں میں ایک نام ''ہوتوت'' کا بھی تھا جو اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ ایک ایسی ہی پُرشکوہ حویلی میں نوابوں کی طرح بڑی آن بان سے رہتے چلے آ رہے تھے۔ ''ہوتوت'' نے حویلی کے احاطے میں کھڑے سیب کے ایک درخت سے اپنے ایک پالتو کتے کو باندھ رکھا تھا جو شکار کا سازوسامان لانے لے جانے والے خدمتگاروں پر زور زور سے بھونکنے لگتا تھا۔

وہ موسم شکار کا پہلا دن تھا۔ ہوتوت شکار پر روانگی سے پہلے اپنے مہمانوں ٹیکس کلیکٹر موسیو برمونت اور نوٹری موسیو مونادو کی تواضع کے خیال سے انہیں اپنے وسیع رسوئی گھر میں لے آیا تھا۔ جہاں وہ اور اس کا اکلوتا بیٹا سیزر ہوتوت مختصر ناشتے اور جام شراب سے مہمانوں کو نوازتے ہوئے خود بھی شراب سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہوتوت کے دوست جانتے تھے کہ وہ اپنے مہمانوں پر اپنی جاہ و حشمت شان و شوکت اور شکار میں اپنی مہارت کا رعب جمانے کا عادی تھا اس لئے اس کی ہاں میں ہاں ملانے میں انہیں کوئی تردد بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ خاصہ لحیم شحیم اور سرخ و سپید قسم کا ایک بارعب مگر خوش مزاج انسان تھا۔ قد بھی نکلتا ہوا تھا اور طاقتور تو وہ اس بلا کا تھا کہ تماشبینوں سے داد کمانے کے لئے سیبوں سے لدی وزنی گاڑی کو زمین سے اوپر اُٹھالیتا تھا۔ وہ جتنا کہ ایک نزاکت پسند رئیس تھا اتنا ہی وہ ایک اُجڈ کسان بھی تھا۔ علاوہ ازیں اس کی دولت وثروت، جاہ و حشمت، خود مختارانہ فطرت، قدر و منزلت اور اُس کے اثر و رسوخ کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ اُس نے اپنے لاڈلے بیٹے سیزر ہوتوت کی تعلیم و تربیت پر بس اتنی ہی توجہ دی تھی کہ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد اسے گھر میں بٹھالیا تا کہ زمین جائداد اور کھیتی باڑی کے کام کو سنبھالنے میں وہ اس کی مدد کر سکے۔

سیزر اپنے باپ کی طرح سرو قد تو ضرور تھا۔ مگر فربہ نہیں تھا۔ دبلا پتلا تھا۔ سادہ لوح اور خوش مزاج بھی تھا اور اپنے باپ کی تعبید اری اور فرمانبرداری میں تو اُس کا جواب ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ کی ہر بات کو ماننا اور ان کے بتائے ہر کام کو انجام دینا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

ٹیکس کلیکٹر موسیو برمونت ایک پستہ قد اور فربہ اندام شخص تھے جن کے پھولے پچوتے اور

بھرے بھرے رخساروں پر سُرخ رنگ کی باریک باریک نسوں کا کچھ ایسا جال بچھا تھا جیسا کہ نقشے میں دریاؤں اور ندیوں کو نشان خاطر کرنے والی ٹیڑھی میڑھی لکیروں کا جال بچھا ہوتا ہے۔ انہوں نے بڑے پُر اشتیاق لہجے میں استفسار کیا۔

''ارے بھئی یہ تو بتاؤ کہ یہاں کے جنگل میں کیا خرگوش بھی پائے جاتے ہیں؟''

کوئی کمی نہیں ہے یہاں خرگوشوں کی'' ہوتوت نے جواب دیا۔

''خاص کر لیپاتیر وادی تو جنگلی خرگوشوں سے بھری پڑی ہے۔''

''کیا یہاں سے نکلنے میں ہمیں دیر لگے گی؟'' نوٹری نے دریافت کیا۔ وہ ایک سیدھا سچا انسان تھا۔ خاصہ موٹا تازہ تھا اور اس کے چہرے کی رنگت زردی مائل تھی۔ اُسے شہر ''روئین'' سے یہاں آئے ابھی ایک ہی ہفتہ ہوا تھا۔ اس وقت وہ چست قسم کے مخصوص شکاری لباس میں ملبوس تھا جس میں اس کی آگے کو نکلی ہوئی توند بُری طرح جکڑ کر رہ گئی تھی۔ اُس نے پھر دریافت کیا۔ ''روانگی میں کتنا وقت اور لگے گا؟''

اتنا کہہ کر وہ فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ باقی لوگ بھی اُٹھ کر اپنا شکاری ساز وسامان اور اپنی بندوقوں کو سنبھالنے لگے۔ انہوں نے بیڑیاں بھی چیک کیں اور پاؤں میں تنگ ہو جانے والے شکاری بوٹوں کو فرش پر پیر پٹک پٹک کر آرام دہ بنانا شروع کر دیا اور پھر مع ساز وسامان حویلی کے احاطے میں پہنچ گئے۔ زنجیروں میں بندھے شکاری کتے بھونکتے بھونکتے اپنے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ بہر حال شکاری جماعت اب حویلی کے احاطے سے باہر نکل کر شکار گاہ کے رُخ پر چل پڑی تھی۔

یہ بلند ٹیلوں کے درمیان واقع ایک مختصر سی وادی تھی۔ بالفاظ دیگر یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ وادی کی سطح اونچی نیچی اُوبڑ کھابڑ اور ناہموار ہونے کی وجہ سے زراعت سے محروم حالت میں بیکار سمجھ کر یوں ہی چھوڑ دی گئی تھی۔ یہاں گھاس پھوس سے ڈھکے تنگ درے بھی تھے جو شکار کے لئے انتہائی موزوں مانے جاتے ہیں۔

یہاں پہنچ کر شکاری ادھر اُدھر پھیل گئے۔ ہوتوت نے دایاں اور اس کے بیٹے سیزر نے بایاں مورچہ سنبھال لیا۔ مہمانوں نے وسط میں رہنا پسند کیا۔ شکاریوں کے خادموں نے شکاری تھیلے اور دیگر ساز وسامان سنبھال رکھا تھا۔

شکاریوں کی نگاہیں ادھر سے ادھر گردش کرتے ہوئے شکار کی متلاشی تھیں۔ اور ان کی انگلیاں ان کی بندوقوں کے سیفٹی کیچز پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اُن کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو چکی تھیں اور وہ دم سادھے بندوق کے پہلے دھماکے کا بڑی بے چینی اور بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔

پھر ناگاہ ہی بندوق کے پہلے دھماکے کی آواز سے ساری وادی گونج اُٹھی۔ یہ فائر ہوتوت نے کیا تھا۔ سبھی نے دیکھا تھا کہ تیتروں کے اُڑتے قافلے میں سے ایک تیتر الگ ہو کر تیزی سے نیچے کی طرف آیا اور پھر قلابازیاں کھاتا ہوا جھاڑ جھنکار سے پُر ایک گہرے کھڈ میں سما گیا۔ راستے کے خس و خاشاک اور ادھر ادھر بکھرے پتھروں سے بچتے بچاتے شکاری اُسی سمت میں دوڑ پڑے۔ زخمی تیتر گڑھے میں اُگی گھنی جھاڑیوں کے پیچھے گم ہو گیا تھا۔ ہوتوت خود بھی اپنے زخمی شکار کی تلاش میں جھاڑیوں کے

پیچھے چلا گیا تھا۔ کہ دفعتاً ایک بار پھر ایک اور دھماکہ ہوا جس سے ساری فضا تھرّا اُٹھی۔
''دیکھو! دیکھو ! وہ جارہا ہے بدمعاش۔'' موسیو برمونت کے منہ سے بیساختہ ہی نکل گیا۔ دراصل اُس نے ایک بھاگے ہوئے خرگوش کی جھلک دیکھ لی تھی۔ مگر خرگوش سے قطع نظر سب کی نگاہیں اسی گھنٹی جھاڑی پر مرکوز تھیں جہاں سے دوسرا دھماکہ ہوا تھا مگر جھاڑی کے پیچھے کا منظر دیکھ نہیں پارہی تھیں۔ اچانک منہ کے پاس ہاتھ لاکر اور انہیں بھونپو کی شکل دیکر نوٹری نے بآواز بلند کہا۔ ''ہوتوت کیا آپ اپناے شکار اپنے قبضے میں لے چکے ہیں؟'' مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ اس پر مضطرب ہوکر سیزر نے اپنے خادم سے کہا ''جوزف! تم اُس طرف جاکر اپنے مالک کی مدد کرو۔ ہم لوگ تمہارے پیچھے آرہے ہیں۔'' بوڑھا جوزف جو محض ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا اور جس کے جسم کا جوڑ جوڑ بڑے واضح طور پر نمایاں تھا اور جو کسی سوکھے پیڑ کے کھردرے تنے جیسا نظر آتا تھا اپنے آقا کے بیٹے کا حکم بجاتے ہوئے آگے بڑھا اور مدھم رفتار سے چلتا ہوا جھاڑ جھنکار سے ڈھکے ہوئے ایک ڈھلواں نشیب میں اُتر گیا۔ وہ ایک چالاک لومڑی کی طرح گڑھے کے نشیبی ڈھلان پر بڑے محتاط انداز میں قدم جما جما کر نیچے اُترتے ہوئے ابھی گڑھے کی تہہ تک بھی نہ پہنچا تھا کہ ناگاہ ہی اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ بڑی بھیانک اور دلخراش آواز میں چیخنے چلاّنے لگا۔

''یہاں آیئے...... آپ سب لوگ یہاں آیئے...... ذرا دیکھیے تو یہ کیا ہوگیا ہے......''

سب لوگ راہ میں حائل پتھریلی چٹانوں اور خاردار جھاڑیوں کو پھلانگتے اور دیوانہ وار بھاگتے دوڑتے مطلوبہ مقام پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ہوتوت بیہوش کی حالت میں کمر کے بَل زمین پر چاروں خانے چت پڑا ہوا تھا اور اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھام رکھا تھا اور اس کے پیٹ سے بہتی خون کی دھار مٹی میں جذب ہورہی تھی۔ مُردہ تیتر کو جُھک کر اُٹھاتے ہوئے نجانے کیسے بندوق زمین پر گر کر خودکار طور پر چل گئی اور گولی ان کا پیٹ پھاڑ کر ان کی آنتوں میں دھنس گئی تھی۔ سب نے مِل جُل کر اپنی مشترکہ کوششوں سے جیسے تیسے اُنہیں گہری خندق سے باہر نکالا۔ اور جب ان کی قمیض اُتاری گئی تو سب نے دیکھا کہ ان کے پیٹ میں ایک بڑا ہولناک سوراخ بن گیا تھا جس سے اُن کی آنتیں باہر نکل آئی تھیں۔ احباب نے ان کی آنتوں کو دھیرے سے اندر کھسکا کر سوئی دھاگے کی مدد سے ان کے پیٹ کو سی دیا تھا اور پھر آناً فاناً انہیں واپس حویلی پہنچا کر وہ بڑی شدّ ومد سے ڈاکٹر اور چرچ کے پادری کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

ڈاکٹر نے اپنے مریض کی نازک صورتحال کا بڑی سنجیدگی سے معائنہ کیا اور پھر قریب ہی کرسی پر بیٹھے اور روتے سسکتے اُن کے بیٹے سیزر سے مخاطب ہوکر کہا۔

''بیٹے! تمہارے باپ کی حالت اُمید افزا نہیں ہے۔''

پھر جب ہوتوت کے زخم کی مرہم پٹی کی جارہی تھی مریض کی انگلیاں مرتعش ہو اُٹھیں، لب تھر تھرائے اور پھر مریض نے اپنی آنکھیں بھی کھول دیں۔ اُس کے چہرے کے تاثرات بتارہے تھے کہ آس پاس نظر ڈال کر غالباً وہ معاملے کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور پھر ایسا لگا کہ صورتحال کی نوعیت کو وہ بخوبی جان چکا تھا۔

''اے زمین و آسمان کے خالق و مالک! لگتا ہے میرا آخری وقت نزدیک ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔ ڈاکٹر نے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں..... نہیں..... ایسا نہ کہیئے..... بس دو دن صبر سے کام لیجیے..... خدا بڑا کارساز ہے...... رحیم و کریم ہے..... اُس پر یقین رکھیئے..... وہ ضرور آپ کو اچھا کر دے گا۔''

''نہیں..... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔'' مریض نے مدّھم سی آواز میں کہا۔

''میرا آسمان سے بُلاوا آ چکا ہے اور مجھے جانا ہی ہوگا..... مجھے معلوم ہے میرا پیٹ چاک ہو چکا ہے..... اور اس سے پہلے کہ میرا چراغ حیات گل ہو میں اپنے بچّے سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''پاپا !..... پاپا !..... میرے پیارے پاپا! ..... میں یہاں آپ کے پاس ہوں۔''

مت رو میرے نورِ نظر..... میرے لختِ جگر..... میرے لاڈلے!.....'' ہوتوت نے بڑے مشفقانہ لہجے میں کراہتے ہوئے کہا۔

''یہ وقت رونے دھونے کا نہیں ہے میرے بچّے..... اس بیش قیمتی وقت میں مجھے تم سے کوئی انتہائی اہم بات کہنی ہے..... میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا..... تم سب سے کہو کہ وہ ایک منٹ کے لئے دوسرے کمرے میں چلے جائیں..... پھر تم اپنا چہرا میرے چہرے کے قریب لاکر میری باتوں کو غور سے سننے کی کوشش کرنا۔

سارے لوگ بیٹے کو باپ کے پاس چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے تب تنہائی نصیب ہونے پر باپ نے بیٹے سے کہا۔

''بیٹے اب تم چوبیس سال کے ایک بالغ مرد میں تبدیل ہو چکے ہو۔ بالغ اور سمجھدار ہونے کے ناتے تمہیں میری باتیں غیر فطری اور نامعقول معلوم نہیں ہوں گی۔ یہ بات تو تم بھی جانتے ہو کہ تمہاری ماں کو گزرے سات سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور یہ بھی کہ اس وقت میں اپنی عمر کے پینتالیسویں سال میں ہوں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے انیس برس کی عمر میں تمہاری ماں سے شادی کی تھی۔ اس حساب سے جب تمہاری ماں کا انتقال ہوا اُس وقت میری عمر صرف سینتیس (۳۷) سال کی تھی۔ تم مانتے ہو نا اس بات کو؟''

''ہاں پاپا! مانتا ہوں۔''

پھر تو تمہیں یہ بھی ماننا ہوگا کہ ایک مرد کے لئے سینتیس سال کی عمر میں رنڈاپے کے عذاب کو جھیلنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔''

''ہاں آپ صحیح فرماتے ہیں بہت مشکل ہے۔''

''خدا تمہارا بھلا کرے! اب یہ بتانا میرے لئے ذرا بھی مشکل نہیں رہا کہ جہاں میں نے تمہاری ماں سے کیا یہ وعدہ نبھایا کہ ان کے بعد گھر میں دوسری عورت بیاہ کر نہیں لاؤں گا وہیں میں نے رنڈاپے کے دُکھ درد سے بچنے کی سبیل بھی نکال لی تھی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے شہر ''روئین'' کی ایک نوخیز حسینہ سے تعلقات استوار کر لئے تھے جو اب بھی روئین میں ریو دی فرسٹ اپیر لان نمبر ۱۸ کے

فورتھ فلور پر رہتی ہے اور وہاں پہلے کو چھوڑ کر دوسرا دروازہ اسی کے فلیٹ کا ہے۔ یہ سب میں تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ تم یاد رکھو کہ وہ شریف لڑکی مجھے بے حد عزیز ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک وفادار و جاں نثار قسم کی میری غیر قانونی بیوی ہے۔ کیا میری باتوں کا مطلب تم سمجھ رہے ہو بیٹے؟''

''ہاں پاپا! سمجھ رہا ہوں...... خوب اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔''

''جیسا کہ میں نے کہا وہ واقعی نیک اور مثالی لڑکی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ وہ اس گھر کے لئے جس میں تمہاری ماں اور ہم تم رہتے ہیں اجنبی ضرور ہے مگر میرے لئے نہ وہ اجنبی ہے نہ غیر۔ وہ میری روح میں بسی ہوئی ہے۔ اس پر بھی میں نے اسے حویلی میں جگہ نہیں دی تو اس کی وجہ وصیت ہے۔ جس کے میں سخت خلاف ہوں۔ وصیت لکھ دینے سے خاندان کے افراد میں دشمنی کی نیو پڑ جاتی ہے۔ اس لئے میں نے اُسے روئین میں ہی رکھنا مناسب سمجھا۔ ہاں تو بیٹے! میں تمہیں یہ بات بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے کوئی وصیت نامہ نہیں لکھا ہے کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ تم ایک دیانتدار دردمند اور رحمدل نوجوان ہو۔ حریف لالچی اور بددیانت تو بالکل بھی نہیں ہو اس لئے مجھے تم پر مکمل اعتماد ہے۔ میں نے اپنے دل میں پہلے ہی تہیہ کر لیا تھا کہ اپنے آخری وقت میں تمہیں ہر بات بتا دوں گا اور تاکید کر دوں گا کہ تم میری شریک حیات کو بھول نہ جانا۔ اُسی کیرولین سیلی دونت کو جو روئین شہر میں ریودی فرسٹ اپیر لان نمبر ۱۸ کے فورتھ فلور پر رہتی ہے اور پہلے کو چھوڑ کر دوسرا دروازہ اسی کے فلیٹ کا ہے۔ اور اب پھر سے میں تمہیں تاکید کر رہا ہوں کہ تم اُسے ہر حال میں یاد رکھنا اور اس سے انصاف بھی کرنا۔ اور ہاں ایک بات اور۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کے پاس آ کر اس کے سارے معاشی مسائل حل کر دوں گا تاکہ اسے ملال نہ ہو کہ میں اس کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ خدا کے فضل سے تم خوش حال ہو۔ معاشی حالات خوشگوار ہیں اور بھی تمہارے پاس بہت کچھ چھوڑ کر جا رہا ہوں اس لئے کچھ کرنا تمہارے لئے ذرا بھی مشکل نہ ہوگا۔ یاد رہے کہ ہفتے کے سبھی دنوں میں اُس سے ملاقات ممکن نہیں ہے۔ وہ ''ریو بیودوئی'' میں مادام مورین کے یہاں ملازمت کرتی ہے۔ تم اُس سے ملنے جمعرات کے دن جانا۔ میں خود بھی سات سال سے جمعرات کے دنوں میں ہی اُس سے ملاقات کرتا رہا ہوں۔ جمعرات کو وہ بڑے بے قراری سے میرا انتظار کیا کرتی تھی۔ اور اب جب تم اُسے بتاؤ گے کہ میں دنیا میں نہیں رہا تو اس پر بجلی گر پڑے گی بہت روئے گی وہ۔ مجھے تم پر اٹوٹ یقین ہے اسی لئے میں یہ بات تمہیں بتا رہا ہوں۔ میرے دل کو اس بات پر سکون حاصل ہے کہ تم میری وصیت، میری تاکید اور میری آخری خواہش کی بے حرمتی نہیں کرو گے۔ اور اس راز کو صیغۂ راز ہی میں رکھو گے۔ یہ بات تم نوٹری پادری یا کسی کو بھی مت بتانا۔ ایک کو بتانے سے بات ہزاروں میں مشتہر ہو جاتی ہے لہٰذا تم اس بات کو اپنے سینے ہی میں دفن کر دینا۔ اب میری تسلی کے لئے تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم میری بات سمجھ گئے ہو؟''

''ہاں پاپا!''

''تمہیں یاد ہے کہ تم نے میرے مرتے وقت مجھے زبان دی ہے؟''

''اچھی طرح یاد ہے پاپا!''

''وعدہ نبا ہو گے؟''

''نبھاؤں گا پاپا!۔''

''بھولو گے تو نہیں؟۔''

''ہرگز ہرگز بھی نہیں پاپا!۔''

''تم بروز جمعرات اُس سے ملنے جاؤ گے؟''

''ضرور ضرور ہی جاؤں گا۔''

''اور اُس کا پتہ؟۔''

''میں نے اچھی طرح حفظ کر لیا ہے اور اپنے دل پر لکھ لیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میرے دل پر جو بوجھ تھا وہ اب ہٹ گیا ہے اور میں پُرسکون ہو گیا ہوں۔ اچھا! اب تم سب لوگوں کو کمرے میں بُلا لو۔ مجھے جو کہنا تھا کہہ چکا ہوں۔''

اتنا کہہ کر اُس کے باپ نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر جب یہ کہا کہ موت اس کی چھاتی پر سوار ہو چکی ہے اور یہ ملاقات آخری اور وداعی ملاقات ہے تو سیزر صدمے کی تاب نہ لا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

دروازہ کھلتے پادری مریض کے کمرے میں چلا آیا۔ مرنے والے کو اپنی موت یقینی نظر آ رہی تھی اس لئے اُس نے جسم کو حرکت دینے اور دنیا کو آخری بار دیکھنے کی تمنا میں بند آنکھیں کھولنا بھی ضروری نہ سمجھا۔ ویسے اُس کی چھاتی پر رکھا وزنی پتھر تو اُس کے بیٹے کی اُمید افزا باتوں سے ہٹ ہی چکا تھا! اس لئے اب وہ بڑے سکون سے خود کو موت کے حوالے کر دینا چاہتا تھا۔ رہا خدائی مندوب کے آگے اپنے گناہوں کا اقبال کرنا تو اس کی اب ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ یہ کام تو وہ اپنے سعادتمند بیٹے کے آگے پہلے ہی انجام دے چکا تھا۔

سَر جھکائے بیٹھے سوگوار عزیزوں، دوستوں، پڑوسیوں اور خدمتگاروں کی موجودگی میں پادری نے مقدس آیاتِ الٰہی کی قرأت سے نیم مُردہ شخص کو دنیاوی گناہوں کے داغ دھبّوں سے پاک وصاف کیا اور جملہ مذہبی رسومات کی ادائیگی کے بعد وہاں سے رُخصت ہو گیا۔

مرحوم ہوتوت کو بروز اتوار اور موسم شکار کے پہلے دن یہ سانحہ پیش آیا اور اگلا ایک دن چھوڑ کر بروز منگل اُنہیں سُپردِ خاک کر دیا گیا تھا۔ قبرستان میں باپ کی تدفین کے بعد مرحوم کا بیٹا سیزر ہوتوت سیدھا اپنے گھر پہنچا اور باپ کی دائمی جدائی کے غم میں اگلے دن تک مسلسل زار و قطار روتا رہا۔ باپ کے ساتھ نیند کی دیوی بھی اُس کی آنکھوں سے رُخصت ہو گئی تھی۔ وہ یہ سوچ سوچ کر مرا جا رہا تھا کہ اس کی ماں اور بھائی بہن جو بھی تھے بس اُس کے باپ تھے اور اب جبکہ انہوں نے بھی منہ موڑ لیا ہے تو وہ اتنی بڑی حویلی میں کیسے رہے گا اور کیسے جی پائے گا؟ پھر خود کو بھلا کر اس نے اپنے باپ کی وصیت کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا کہ اُن کی خواہش وہ ضرور ہی پوری کرے گا۔ وہ بھولا نہیں تھا کہ کل جمعرات ہے اور اُسے کل ہی شہر روئین جا کر ریودی فرسٹ اپیر لان نمبر ۱۸ کے چوتھے مالے پر واقع دوسرے دروازے پر اُسے کیرولین سینی ڈونت سے مُلاقات کرنی ہوگی۔ اُس نے پھر سے اس نام اور پتے کو اچھی طرح ذہن نشیں کر لیا اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ پتہ اس کے دل پر نقش ہو گیا ہے اور اب بھول جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

اور پھر اگلے ہی دن اس کا حکم بجاتے ہوئے خدمت گار نے اس کی گاڑی میں اعلیٰ نسل کا گھوڑا گرین ڈواچ جوت کر سفر کے لئے گاڑی تیار کر دی تھی۔

اب ''این وِلی'' سے ''روئین'' جانے والی شاہراہ پر گاڑی میں جُتا نارمن گھوڑا اپنی خصوصیت و انفرادیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سرپٹ دوڑ لگا رہا تھا۔ گاڑی میں سوار سیزر نے سیہ رنگ کا فراک کوٹ زیب تن کر رکھا تھا اور پائجامے کے زیریں سرلے پر فیتے بندھے ہوئے تھے نیز اُس نے سیہ سلک منڈھا اونچا سا ہیٹ بھی سر پر رکھ چھوڑا تھا۔

اُس کی گاڑی ٹھیک دس بجے روئین پہنچی۔ وہاں وہ سب سے پہلے ''ریودی ٹروئس میسرس'' میں واقع ہوٹل ''دی بونسن این فینٹس'' کے سامنے جا کر رکا۔ ہوٹل کے مالک کو اس کے باپ کی موت کی اطلاع مل چکی تھی لہٰذا ہوٹل کے مالک اُس کی بیوی اور اُس کے پانچوں بیٹوں نے اسے باری باری گلے لگا کر دعاؤں سے نوازا۔ اُن کے استفسار پر اُسے اتوار کے دن گزرنے والے حادثے کے بارے میں تفصیلات بیان کرنی پڑیں جس کے نتیجے میں غم سے اس کی آنکھیں اشکبار ہو اُٹھیں۔ اور جب اُسے رئیس زادہ جان کر انھوں نے اپنے منصوبہ بند شفقتوں کے جال میں پھانسنے کی کوشش کی تو اُس نے ان کے احسانات قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ ان کے ساتھ لنچ میں شامل ہونے کے لئے اُس کے پاس وقت نہیں ہے۔

اس کے بعد اُس نے اپنے ہیٹ سے گرد جھاڑی، فراک کوٹ کو برش کیا، جوتوں کو گرد و غبار سے نجات دلا کر چمکایا اور پھر بغیر کسی سے کچھ دریافت کئے ریودی ایپرلان فرسٹ کی تلاش و جستجو شروع کر دی۔ لیکن جب اس کام میں کامیابی نہیں ملی۔ تو پھر مذہبی ادارے چرچ سے وابستہ ایک پادری کو قابل اعتماد مان کر اُس سے مدد لینے میں کوئی بُرائی نہ سمجھی۔

پادری کے بتائے ہوئے راستے کے مُطابق اب اُس کی منزل دور نہ تھی۔ سڑک سے دوسری گلی میں داخل ہو کر اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر اُسے دائیں جانب مڑ جانا تھا۔

باپ کی آخری خواہش پوری کرتے ہوئے اُسے عجیب غریب احساسات سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا کیوں کہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ جس لڑکی سے ملاقات کرنے جا رہا ہے دنیا کی نظر میں وہ ایک رکھیل ہی تو ہے اور اب اُسے اُس سے ہم کلام بھی ہونا تھا۔ وہ اُس سے کیسے ملے گا اور کیا گفتگو کرے گا؟ ان سوالوں کے دباؤ سے اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی اور وہ بڑی اُلجھن اور پریشانی سی محسوس کر رہا تھا ساتھ ہی اسے شرم بھی دامن گیر تھی۔ قدیم دقیانوسی تصورات کی جڑیں تو کہیں نہ کہیں ہم سبھی کے اندر پیوست رہتی ہیں۔ ایک داشتہ سے انصاف کرتے ہوئے ہم سبھی متعصب ہو جاتے ہیں۔ سیزر ہو تو بھی اس سے مبرّیٰ نہ تھا۔ دوسری طرف اُس نے یہ بھی پڑھ رکھا تھا کہ انسانوں کی ماں عورت ایک قابل تعظیم ہستی ہے۔ اس سے عزت سے پیش آنا چاہیئے۔ ان دو متضاد تصورات کے باہم تصادم سے وہ عدم توازن کا شکار ہوا تو ضرور مگر لمحاتی طور پر کیونکہ وہ اپنے مرحوم باپ کی آخری خواہش پوری کرنے کا اپنے دل میں پختہ ارادہ اور تہیہ کر چکا تھا۔ اس لئے لغزش پا کا تو کوئی امکان ہی نہ تھا۔ اور اپنے اس ٹھوس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بالآخر وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ ہی گیا۔ وہ دروازہ جس پر نمبر ۱۸ لکھا تھا ادھ کھلا تھا جسے اس نے پیچھے کی طرف ڈھکیل کر پوری طرح کھول دیا۔ سامنے کی طرف اسے ایک زینہ دکھائی دیا جو نیم

تاریک تھا اور اُس کی سیڑھیاں اوپر کی طرف چلی گئی تھیں۔ تین منزلہ بلندی طے کر کے وہ چوتھے مالے تک پہنچ ہی گیا اور پھر مختصر سی گیلری میں پہلے کو چھوڑ کر دوسرے دروازے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سانسیں درست کرنے کے لئے ایک لمحے کا توقف کیا اور پھر بکھرے حوصلے کو مجتمع کر کے دروازے پر لگی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ بٹن کے دبتے ہی اندرونی کمرے میں گھنٹی کی آواز زور سے گونج اُٹھی جسے سُن کر اُسے اپنے جسم میں تھرتھراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔

ایکا ایکی دروازہ کھلا اور اُس کے روبرو ایک خوش وضع وخوش لباس حسینہ کھڑی ہوئی تھی۔ اُس کے ریشمین بالوں کا رنگ کتھئی تھا اور اُس کا حسین ودلآویز چہرا سُرخ وسفید ہونے کی وجہ سے شفق رنگ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ متحیر ومتعجب ہو کر اُسے سوالیہ نظروں سے تکے جا رہی تھی۔ سیزر اُس لئے خاموش تھا کہ بولنے کے لئے اُسے مناسب الفاظ ہی سجھائی نہیں دے رہے تھے۔ ادھر لڑکی کے لئے اُسے خوش آمدید کہنا اس لئے ممکن نہ تھا کہ اوّل تو آنے والا اجنبی تھا دوسرے اسی وقت ہوتوت کی آمد بھی متوقع تھی۔ وہ اسی عالم میں تقریباً بیس سیکنڈ تک ایک دوسرے کو یونہی تکتے رہے۔ بالآخر خاموشی کے اس طلسم کو توڑنے کی پہل اس لڑکی نے ہی کر ڈالی۔

''فرمایئے موسیو! میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟''

''جی میں ہوتوت کا بیٹا ہوں۔'' اُس نے بھرّائی آواز میں کہا۔

لڑکی کچھ یوں چونک اُٹھی جیسے اُسے بجلی کا جھٹکہ لگ گیا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے چہرے کا رنگ گلابی سے زرد ہو گیا۔ اُس نے لرزیدہ سی آواز میں کہا۔

''کیا آپ ہی سیزر ہوتوت ہیں؟'' گویا وہ اُس کے نام سے برسوں سے واقف تھی۔ اُس نے بڑے گھبرائے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''بتایئے...... بتایئے...... کیا ہوا؟...... آخر بات کیا ہے؟''

''مجھے یہاں میرے پاپا نے بھیجا ہے...... آپ کے پاس...... کچھ کہنے کے لئے۔''

''خدا رحم کرے۔'' اُس نے پیچھے ہٹ کر اُسے اندر آنے کے لئے راستہ دیتے ہوئے کہا۔ ''آیئے اندر تشریف لے آیئے۔'' اور وہ اس کے پیچھے چل پڑا۔

کمرے میں داخل ہونے پر اُس نے دیکھا کہ ایک چار یا پانچ سال معصوم سا بچہ فرش پر بیٹھا بلّی سے کھیل رہا تھا اور اس کے پیچھے سلیب پر اسٹوو کے اوپر رکھے پوٹ سے بھاپ اُٹھ رہی تھی جو اس بات کا اشارہ تھا کہ تازہ بنا کھانا اپنے قدردانوں کی توجہ کا منتظر ہے۔

''بیٹھ جایئے۔'' اُس کی سماعت میں سُریلی آواز کی مٹھاس سی گُھل گئی۔ وہ بیٹھ گیا۔

''جی فرمایئے...... مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

وہ پھر سے مشکل میں پڑ گیا کہ کہے تو کیا کہے اور کیسے کہے۔ اس کی نگاہیں اپارٹمنٹ کے وسط میں مرکوز تھیں جہاں ایک میز کے گرد تین کرسیاں قرینے سے لگی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف تولیہ اور نیپکن وغیرہ کھونٹیوں پر لٹکے ہوئے تھے اور کمرے کا تیسرا حصّہ بچّے کے کھیل کود کے لئے وقف تھا۔ میز پر گلاسوں، پلیٹوں اور چمچوں کانٹوں کے علاوہ سُرخ رنگ کی شراب سے نصف بھری بوتل بھی رکھی ہوئی

تھی۔اس کے علاوہ وہاں سفید رنگ کی شراب میں بھری ایک اور بھی بوتل تھی۔ جس کی سیل ابھی ٹوٹی بھی نہ تھی۔ اُسے یہ سمجھتے ذرا بھی دیر نہ لگی کہ آج کا یہ وقت یہاں پاپا کی آمد کا وقت تھا اور کھانے پینے کا یہ سارا اہتمام انہیں کے لئے کیا گیا تھا۔ میز پر رکھی ڈبل روٹی کی تراشی ہوئی قاشوں کو بھی اُس نے پہچان لیا کہ یہ اُس کے پاپا کے لئے...... کیوں کہ اُن کے دانت کمزور تھے۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ بڑی سی تصویر جو اس کے پاپا نے کبھی فرانس میں کھنچوائی تھی اور جو "ان ولی" میں ان کی حویلی کے ڈرائینگ روم کی دیوار پر آویزاں تھی بالکل وہی تصویر یہاں بھی ایک دیوار کی زینت بنی ہوئی تھی۔

"ہاں تو موسیو سیزر! آپ کو جو بھی کہنا ہے بے تکلف کہہ دیجیے۔"

لڑکی کی آواز میں تھرتھراہٹ مضمر تھی اور اس کے فق ہوئے چہرے کو دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی خدشہ کوئی انجانا خوف اسے اندر ہی اندر چوہے کی طرح کُتر رہا تھا اور وہ ایک انجانی سی اذیت میں مبتلا تھی۔

"ٹھیک ہے مادام سیلی صاحبہ!" اُس نے جی کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ موسمِ شکار کے پہلے دن اور بروز اتوار پاپا ایک حادثے کا شکار ہو گئے اور اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

اتنا سنتے ہی وہ پتھر کا ایک بے حِس و حرکت بُت بن کر رہ گئی۔ لگتا تھا اس پر سکتہ طاری ہو گیا ہے۔ نجانے کتنے منٹ اس پُراسرار اور ہولناک خامشی کی نذر ہو گئے۔ پھر نہ سُنائی دینے والی نحیف سی آواز میں وہ زیرلب بڑبڑانے لگی۔ "نہیں......نہیں......ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟......خدا اتنا بے رحم کیسے ہو سکتا ہے......نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔"

ایکا ایکی اس کی اشکبار آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی سی لگ گئی۔ اُس نے اپنا چہرا اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور سسکاریاں بھر کر رونے لگی۔ ادھر جب بلّی سے کھیلنے والے معصوم بچّے نے اپنی ماں کو زار و قطار آنسو بہاتے اور روتے ہوئے دیکھا تو وہ خود بھی رونے اور چیخنے چلاّنے لگا۔ اُس نے اپنے دماغ میں اپنی ماں کی اس ابتر حالت کا ذمہ دار اسی اجنبی سیزر کو سمجھ لیا۔ وہ غصّے میں بھر کر بھاگم بھاگ سیدھا سیزر کے پاس جا پہنچا اور اُس کی جانگھوں پر مکّوں پر مکّے برسانے لگا۔ لڑکی کو روتے اور اس کے بچّے کو ایسا کرتے دیکھ کر سیزر پر وحشت سی سوار ہونے لگی۔ اُسے لگا جیسے موجودہ صورتحال کا وہی ذمہ دار ہے۔ وہ اس سوگوار ماحول سے متاثر ہو کر خود بھی بڑے جذباتی انداز میں رونے لگا۔ پھر رُخساروں پر بہتے آنسوؤں کو پونچھ کر اور منتشر حواس یکجا کر کے اُس نے باپ پر گزرے افسوسناک سانحے کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔

"ہاں! اتوار کے دن صبح آٹھ بجے یہ حادثہ رونما ہوا تھا۔" اور پھر بلا لحاظ و خیال کہ وہ اس کی متحمل ہو گی یا نہ ہو گی اُس نے اپنے باپ کے حادثے سے متعلق ساری روداد اُسے اوّل تا آخر من و عن سُنا دی۔ اس دوران بچّے نے بھی اپنی انتقامی کارروائی جاری رکھی اور اُس کی ٹانگوں کو برابر طبلے کی طرح بجاتا رہا۔

اور اُس وقت جب وہ اس کہانی کا دوسرا المیہ باب بیان کر رہا تھا کہ مرتے وقت اُس کے

باپ نے اسے سیلی کے بارے میں یعنی اسی لڑکی کے بارے میں کیا کہا تھا تو ویسلی نے اپنا نام سن کر چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور کہا ''معاف کیجیے گا ابھی جو آپ نے فرمایا میں سمجھی نہیں ہوں۔ کیا آپ اسے دہرانا پسند کریں گے؟''

سیزر نے پھر سے سارا واقعہ من و عن بیان کر دیا۔ اسی دوران ''اُف میرے خدا! اور ہائے ہائے جیسے کلمات اس کے منہ سے برابر ادا ہوتے رہے۔ ماں کی بگڑی حالت میں تھوڑا سُدھار دیکھ کر اب بچے نے بھی اس کی پٹائی سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اب وہ ماں کا باز و تھامے بزرگوں کی طرح اس کی باتوں کو بڑے غور و انہماک سے کچھ اس طرح سُن رہا تھا جیسے ان باتوں کا مفہوم اس کی سمجھ سے بالاتر نہیں ہے۔

کہانی مکمل کرنے کے بعد ہوتوت کے بیٹے نے کہا۔

''اب پاپا کی وصیت کے مطابق میں وہ بات بیان کرنے جا رہا ہوں جسے میرے اور آپ کے درمیان طئے ہونا ہے۔ اس لئے ذرا توجہ سے سننے کی کوشش کیجیے گا۔'' اُس نے کہا۔

''میرے باپ نے مرتے وقت میرے لئے بہت کچھ چھوڑا ہے۔ اور میرے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ میں نہیں چاہوں گا کہ میرے ہوتے ہوئے آپ کو کسی بھی بات کی کوئی پریشانی ہو۔''

''اوہ ! موسیو سیزر ا'' اُس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''پلیز! ایسی باتیں پھر کسی وقت کے لئے چھوڑ دیجیے۔ اس وقت تو غم سے میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔ میری حالت تباہ ہے اور میں ہی جانتی ہوں کہ کس طرح میں خود کو قابو میں کیے ہوئے ہوں۔ اور ہاں یہ بھی سُن لیجیے کہ میں اپنے لئے کچھ قبول کرنا پسند نہیں کروں گی۔ البتہ اگر آپ ان کے بیٹے کو معاشی سہولیات فراہم کرنا چاہیں تو بشوق کر سکتے ہیں۔ اس میں ٹانگ اڑانے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔''

پھر تو میں صاف الفاظ میں جاننا چاہوں گا کہ کیا یہ بچہ میرے مرحوم باپ ہی کا بیٹا ہے؟'' سیزر نے متحیر ہو کر دریافت کیا۔

''جی ہاں یہی سچ ہے۔ یہ آپ ہی کے پاپا کی نشانی ہے۔ اس کی رگوں میں ان ہی کا خون رواں ہے۔''

یہ سُن کر ہوتوت کے بیٹے کی نظر خاص اپنے چھوٹے بھائی پر مرتکز ہو کے رہ گئی۔ لڑکی نے اب پھر سے سسکنا اور رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد تا دیر خاموشی چھائی رہی جس میں شگاف ڈالتے ہوئے سیزر نے کہا۔

''اچھا تو مادام کیرولین ویسلی دُونت صاحبہ! قبل اس کے کہ میں آپ سے رُخصت طلب کروں میں چاہوں گا کہ آگے کی گفتگو کے لئے کوئی دن اور وقت مقرر فرما دیں۔''

''اوہ! نہیں۔'' وہ چلائی۔ ''مت جاؤ......مجھ تنہائی کی ماری ہوئی کو......ایک غم زدہ بدنصیب کو......ایک بے یار و مددگار کو اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ...... یہاں میرے اور میرے بیٹے کو تسلی چاہیئے......تنہائی کا یہ زہریلا ناگ مجھے ڈس لے گا...... شدت غم سے اگر میں مری نہیں تو پاگل ضرور ہو جاؤں گی......مت جاؤ موسیو سیزر!......مت جاؤ......پلیز! بیٹھ جاؤ۔'' اور سیزر سعادت مندی

اور فرمانبرداری جس کی گھٹی میں میں پڑی تھی ویسلی کی التجا سے سہم کر فوراً ہی بیٹھ گیا۔ لڑکی نے کہا۔ ''اپنے مرحوم پاپا کے بارے میں باتیں کرو اور بتاؤ کہ ان کی کیا مصروفیات تھیں۔؟''

وہ سوال پر سوال کرتی رہی اور اپنے باپ کی غمگین یادوں میں گم سیزر اسے ہر بات بتاتا رہا جس سے وہ خوشی اخذ کرتی رہی۔ مرحوم کی متعلقہ باتوں میں اس کی غیر معمولی دلچسپی بذات خود اس بات کی معتبر دلیل تھی۔ کہ وہ اُس کے باپ کو اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہنے والی ایک پاک باطن اور شوہر پرست خاتون تھی جس نے ہوتوت کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ جب تک ممکن ہوا وہ اپنے باپ سے متعلق ادھر ادھر کی باتیں چُن چُن کر اُسے بتاتا رہا مگر انجانے میں ہی گفتگو نے بذات خود حادثے کا رُخ اختیار کر لیا۔ اور جب اس نے سیلی کو یہ بتایا کہ مرحوم کے شکم کا زخم اس قدر کشادہ تھا کہ اس میں بیک وقت دو بند مُٹھیاں بآسانی سما سکتی تھیں تو سیلی سے سہا نہ گیا اور فرطِ الم سے اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ وہ تادیر سسکتی اور روتی رہی۔ باپ کے ہولناک وہیبتناک زخم اور ان کی اذیت ناک و دردناک موت کی یاد تازہ ہو جانے پر وہ خود بھی ویسلی کا ساتھ نبھاتے ہوئے بآواز بلند رونے لگا۔ اور پھر جب آنسوؤں کے بہہ جانے پر دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو اُس نے بیساختہ ہی جھک کر اپنے چھوٹے بھائی ایملی کی پیشانی کو چوم لیا۔ اس پر اس کی ماں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''یتیم ہو گیا ہے بے چارہ اور یہ بات وہ جانتا تک نہیں ہے۔''

''وہی کیوں؟''۔ سیزر نے کہا۔ ''میں خود بھی تو یتیم ہو گیا ہوں۔'' پھر دیر تک کسی کی بھی کی آواز سُنائی نہ دی۔ دونوں ہی خاموش تھے کہ ایکا ایکی ویسلی نے چونک کر کہا۔

''گڈ گاڈ! میں تو بھول ہی گئی کہ تم سویرے سے سفر میں ہو اور ضرور ہی تمہیں بھوک پریشان کر رہی ہوگی۔''

''نہیں مادام سیلی! ایسا نہیں ہے۔''

''ایسا کیسے نہیں ہے۔'' اس نے پُرزور لہجے میں کہا۔

''نہیں مادم!۔'' اُس نے ضِد کی۔ ''میں نے کہا نا کہ مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں تو خود ہی مصیبت میں مبتلا ہوں۔''

''بُرے وقت اور مصیبت سے کوئی محفوظ نہیں۔ لوگ مصیبت میں مبتلا ہو کر کھانا پینا اور جینا ترک تو نہیں کر دیتے۔ دلی صدمہ تو مجھے بھی ہوا ہے۔ تمہارے یہاں سے چلے جانے کے بعد میری کیا حالت ہوگی مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔ دو چار لقمے ہی سہی پلیز۔''

بالآخر سیزر ہوتوت کو لڑکی کے اصرار پر اُس کے آگے خود سپردگی اختیار کرنی ہی پڑی۔

سیلی نے کُکر سے تازہ بنا شوربہ پلیٹ میں نکال کر اس کے سامنے میز پر سجا دیا۔ اُس نے وہ پلیٹ منٹوں میں صاف کر دی اور لال رنگ کی شراب سے بھرا ایک گلاس بھی پی کر خالی کر دیا۔ مگر جب سیلی نے سفید رنگ کی شراب سے بھری بوتل کی سیل توڑنا چاہا۔ تو اُس نے مزید پینے سے صاف انکار کر دیا۔ کھانا کھاتے وقت اس کی ساری توجہ اپنے چھوٹے بھائی ایملی کی ہی جانب منعطف رہی۔ وہ زیرِ لب خفیف سے تبسم کے ساتھ اسے پیار سے بار بار نظر گھما کر دیکھ لیتا تھا۔ ساتھ ہی وہ چھوٹے بھائی کے ہونٹوں

اور ٹھوڑی پر لگے ساس کو بار بار رومال سے صاف بھی کرتا جارہا تھا۔ کھانے سے فارغ ہوکر پھر وہ اچانک ہی کھڑا ہوگیا اور کہا۔

''ہم سیلی دُونت ! بتایئے معاملات طے کرنا کب پسند کریں گی؟ اور دوبارہ مجھے یہاں کب آنا چاہیئے؟''

''اگلی جمعرات کو۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو...... ویسے موسیو سیزر ! یہی میرا اپنا دن ہے...... میں اپنے سارے ضروری کام اسی دن انجام دیتی ہوں کیوں کہ ہفتے کے باقی تمام دن مجھے ملازمت پر مستعد رہنا پڑتا ہے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ جمعرات کو ہفتے کا سب سے پیارا اور مبارک دن مان لینے میں مجھے کوئی عار نہیں ہے۔''

''پھر تو آپ کو اگلی ملاقات پر ہمارے ساتھ لنچ لینے میں بھی کوئی عار نہیں ہونا چاہیئے۔ بولئے منظور ہے؟''

''اس کا وعدہ تو مشکل ہے۔''

''کچھ مشکل وشکل نہیں ہے۔ کھانے کی میز پر ساتھ بیٹھنے سے باتیں خوشگوار ہوتی ہیں اور وقت اچھا گزرتا ہے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ ایسا کہتی ہیں تو ایسا ہی سہی۔''

اُس نے ''گڈ نون'' کہتے ہوئے مادام سیلی دونت سے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور ایملی کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ گھر آ گیا اور یہ ہفتہ اُسے بڑا طول طویل اور اُکتاہٹ آمیز محسوس ہوا۔ اس کی ماں اور بہن تو تھے ہی نہیں جو گھر میں جی لگتا اس لئے وہ کھیتوں کھلیانوں شکارگاہوں اور گھر میں بھی ہر دم ہی اپنے باپ کی پرچھائیں بن کر اُن کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ اگر اپنے باپ کا حکم بجانے اسے کہیں جانا پڑتا تب بھی لنچ اور ڈنر کی میز پر اُسے اپنے باپ کی قربت حاصل ہو جاتی تھی۔ باپ کے گزر جانے پر اب اُسے اپنی یہ وسیع وعریض حویلی ایک ویران وسنسان قبرستان سی محسوس ہونے لگی تھی۔ باپ کی یادیں بھوتنی طرح ہر دم ہی اس کے اردگرد منڈلاتی رہتی تھیں۔ ان کا سگار پینا۔ اُس سے گھوڑوں گایوں اور بھیڑ بکریوں کے بارے میں باتیں کرنا۔ اُن کا شفقت سے سَر پر ہاتھ پھیرنا، کام سے خوش ہوکر پشت تھپتھپا کر شاباشی دینا، گرمجوشی سے مصافحہ کرنا۔ سیر ہوکر کھانے کی تاکید کرنا جیسی ان کی یہ تمام باتیں ان کی یہ ساری نیکیٹس اسے رہ رہ کر یاد آرہی تھیں۔ اُس کے ماں باپ تایا چچا بہن بھائی اور دوست احباب جو بھی تھے بس اُس کے باپ ہی تھے۔ باپ کے سَر سے اُٹھ جانے کے بعد اس کی زندگی میں جو بہت بڑا خلا در آیا تھا سردست اُس کے پُر ہونے کا امکان سیہ پوش ہی نظر آ رہا تھا۔

باپ کا ذکر اور ان کی یادیں ہی اس کی حرز جاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ موسم خزاں کے تازہ جُتے کھیتوں پر جا کر تمنا کرتا کہ کاش! دور سے اسے اپنے باپ کا ہیولہ ہی نظر آ جائے۔ وہ پڑوسیوں کو حادثے سے متعلق وہ باتیں بناتا جن سے کہ وہ لاعلم تھے۔

ایسے میں مادام سیلی دونت کا بھی چہرا اُس کی نگاہوں میں گردش کرنے لگتا اسے فخر ہونے لگتا کہ مادام سیلی اُس کے باپ کا بہترین انتخاب ہیں ایک ہمسفر اور شریک حیات میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ سب کی سب اُن میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ وہ ایک بے لوث، دردمند، خوش مزاج اور سچّے دل سے محبت کرنے والی نیک خاتون ہیں۔ اُن کی قربت اُسے بڑی راحت بخش اور سکون پرور محسوس ہوتی تھی۔ اُسے اپنا چھوٹا شوخ و شریر بھائی ایملی بھی بڑا پیارا محسوس ہوا تھا۔ اسے غم تھا تو اس بات کا تھا کہ اس کے حقیقی چھوٹے بھائی کو اُس کے باپ ہوتوت کا نام کبھی نہ مل سکے گا۔

اور پھر جب جمعرات کو صبح کے وقت اُس کی گاڑی میں جُتا تیز رفتار گھوڑا ''گرین ڈورج'' اپنی ٹاپوں کی تال پر شاہراہ پر سرپٹ دوڑ لگاتے ہوئے اسے روئین لئے جا رہا تھا، باپ کی موت کے بعد یہ پہلا ہی اتفاق تھا کہ وہ قدرے راحت و سکون محسوس کر رہا تھا۔

مادام سیلی دُونت کے فلیٹ میں داخل ہونے پر اُس نے دیکھا کہ سب کچھ کمرے میں اُسی قرینے سے سجا سنورا ہے جیسا کہ پچھلی جمعرات کو تھا سوائے اس کے کہ ڈبل روٹی کی قاشیں تراشنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔

اُس نے اُس حسین و جمیل خاتون سے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور پھر ایملی کے پھول سے رخسار پر بوسہ دیا اور کرسی پر قبضہ جما لیا۔ ایسا کرتے ہوئے اُسے بڑی اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔

مادام سیلی کچھ دُبلی سی نظر آ رہی تھی اور اُس کے چہرے کا رنگ بھی زردی مائل تھا۔ لگتا تھا پورا ہفتہ روتے دھوتے گزارا ہوگا۔ سیلی کی نظریں سیزر کے چہرے پر ہی مرکوز تھیں۔ وہ یہ جان کر کہ اُن کا بیٹا بھی اپنے باپ ہوتوت کی طرح ان پر کتنا مہربان ہے کہ اُن کے دکھ درد کو اپنا دُکھ درد مانتا ہے، وہ دل ہی دل میں اُس پر فدا ہوئی جا رہی تھی۔

لنچ کی میز پر اہم معاملات طئے ہونے میں خاصا وقت صرف ہوا تھا۔ سیزر چاہتا تھا کہ وہ سیلی کے لئے ایک بڑی سالانہ رقم وقف کر دے مگر سیلی اس کے لئے رضامند نہ تھی۔ اُس کی دلیل یہ تھی کہ ملازمت کے ذریعے وہ جو کچھ کماتی ہے وہ گھریلو اخراجات پورا کرنے کے لئے کافی ہے البتہ اگر وہ اپنے چھوٹے بھائی کے مستقبل کو سنوارنے کے لئے کچھ کرنا چاہے تو بشوق کر سکتا ہے اس میں اُسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ سیزر جانتا تھا کہ ایملی کے لئے اُسے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے؟ اور جہاں تک کہ سیلی کا تعلق ہے تو اُس کی خوددارانہ ضد کے باوجود اُس نے اُسے ایک ہزار فرانک قبول کرنے پر آمادہ کر ہی لیا تھا۔

کافی پی کر جب سیزر نے خالی کپ میز پر رکھا تو سیلی نے پوچھا

''کیا اسموکنگ پسند کرو گے۔؟''

''ہاں'' ۔اُس نے کہا۔ ''میرا پائپ میرے پاس موجود ہے۔''

مگر جب جیب میں داخل ہو کر اس کا ہاتھ خالی باہر آ گیا تو وہ مُسکرائے بغیر نہ رہ سکی اور اُس نے والٹ سے اُس کے باپ کا پائپ نکال کر اُسے پیش کر دیا جسے اُس نے شکریے کے ساتھ مسکرا کر قبول کر لیا۔ اُس نے دیکھا یہ اُس کے باپ کا ہی پائپ تھا اور ہو بہو ایسا ہی پائپ اُس نے اپنی حویلی میں بھی دیکھا تھا۔ پائپ نے اُسے جذباتی کر دیا تھا۔ اُس نے تنبا کو میں آگ لگا کر گہرے گہرے کش لگانے

شروع کر دیے اور پھر ایملی کے ساتھ چھوٹے بچوں کی طرح کھیلنے لگا۔ ادھر سیلی نے میز سے جھوٹے برتن اُٹھا کر سنک میں ڈالنے شروع کر دیے تا کہ بعد میں انہیں دھو کر صاف کر سکے۔

گھڑی میں تین بجے کا وقت دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ جانے کے خیال سے ہی اُس کے چہرے پر اُداسی چھا گئی۔ پھر بھی وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''اچھی بات ہے مادام سیلی ! گڈ ایوننگ ! اور شکریہ ! آپ کی اس دوسری بار کی مہمان نوازی کا۔''

وہ اس کے روبرو کھڑی ہو گئی اور اُس میں ہوتوت کی واضح جھلک دیکھ کر شرمائے بغیر نہ رہ سکی۔ اُس نے کہا۔

''کیا آپ آگے بھی ہم سے ملتے رہیں گے۔؟''

'دپہلے آپ ہی بتائیں کہ کیا آپ ہم سے ملنا پسند کریں گی۔؟''

''ہاں سیزر ! کیوں نہیں۔ آپ کے آتے رہنے پر ہمیں بہت خوشی ہوگی۔''

''تو پھر مجھ میں اتنی ہمت کہاں کے ملنے ملانے میں لاپروائی سے کام لوں۔ آپ یاد رکھیں ! اگلی جمعرات کو ہم لوگ پھر ملیں گے۔''

''کیا واقعی موسیو سیزر۔؟''

''یقیناً اور بلا مبالغہ۔'' اس کا لہجہ اعتماد سے لبریز تھا۔

''تیار ہو کر آیئے گا ہم سب ایک ساتھ ہی لنچ لیں گے۔'' سیلی نے کہا۔

''آپ حکم دیں اور میں نافرمانی کروں۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔''

''ٹھیک ہے۔ تو اگلی جمعرات طے رہی۔''

''ہاں مادام ! اگلی جمعرات......اگلی جمعرات۔''

پھر ایکا ایکی دروازے سے اُس نے پیچھے مڑ کر کہا۔

''اگلی جمعرات ہی کیوں میم سیلی ! ہم ہر جمعرات کو ملتے ملاتے رہیں گے۔

حسین سیلی کے لبوں پر بڑی دلنواز سی مُسکراہٹ کھل اُٹھی جو اُس کے چلے جانے کے بعد بھی تا دیر اپنی بہار دکھاتی رہی۔

....

☆......فیودور دوستوئیفسکی
☆......رفیق شاہین

''ملی خاک میں محبت''

(محبت کے نئے انداز اور سوز و گداز سے مرصع ایک ناقابلِ فراموش روسی کہانی)

میری متاعِ بیش بہا ! میری تمناؤں کی جنت ! وارینکا !

کل رات میں خوش بہت خوش اور انتہائی درجے خوش تھا۔ میری خوشی اس بات میں مضمر تھی۔ کہ میری نبضِ حیات نے آخر میرا کہا پورا کر ہی دیا۔ حسب عادت دو ایک جھپکی لے کر جب میں آٹھ بجے شب سو کر اُٹھا تو موم بتی اور کاغذات میز پر رکھ کر قلم تراشنے لگا کہ تبھی میری نگاہ آپ کی کھڑکی کی طرف چلی گئی اور میرا دل خوشی کے احساس سے بلّیوں اُچھلنے لگا کہ آخر تم نے سمجھ ہی لیا کہ میں تم سے کیا چاہتا ہوں اور میرے معصوم دل کا ارمان کیا ہے۔ تمہاری کھڑکی کا پردہ کھسکا ہوا تھا اور یہ میری دلی خواہش اور درخواست کے عین مطابق تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے لگا کہ کھڑکی سے چاند طلوع ہو رہا تھا اور مجھے دیکھتے ہوئے تم میرے بارے میں ہی سوچ رہی تھیں۔ اُف یہ سوچ کر مجھے کتنا دُکھ ہوا کہ میں تمہیں اچھی طرح نظر بھر کر دیکھ بھی نہ سکا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب کائنات کا ذرہ ذرہ روشن اور تابناک نظر آیا کرتا تھا۔ آنکھوں کی جھیل میں قوسِ قزح کے رنگ تیرتے رہتے تھے۔ مگر اب وہ بات نہیں رہی۔ جوانی کے حصار کو توڑ کر زندگی کے راستے پر چلنا کسی عذاب سے کم نہیں ہے۔ شام کے وقت تھوڑا لکھنے پر ہی آنکھوں کے سامنے پتنگے سے ناچنے لگتے ہیں اور صبح جاگنے پر تو آنکھیں ایک دم لال ہوتی ہیں جن سے پانی بہتا ہے۔ ایسے میں کسی کو اپنا چہرا دکھاتے شرم آتی ہے مجھے۔ لیکن میرے حسین فرشتے ! تمہاری مبتسم نگاہ کے ایک ادنیٰ اشارے پر ہیں۔ چاند ستاروں کی خوابناک دنیا میں پہنچ جاتا ہوں اور ایسا اس وقت بھی ہوا تھا جب میں نے تمہیں پہلی بار چوما تھا۔ یاد ہے تمہیں؟ اس پر تم نے مجھے چونک کر دیکھا تھا۔ کیا نہیں؟ جب تم مجھے خط لکھو تو اسی واقعے کو لے کر بھی کچھ نہ کچھ ضرور لکھنا۔ اب تو میرا حال ہی عجیب ہے۔ چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت مجھے یہی لگتا ہے جیسے تمہاری بیتاب نگاہیں مجھی پر مرکوز ہیں اور تم میرے ہی بارے میں سوچتی رہتی ہو۔ مجھے یاد کرتی رہتی ہو۔ اور جب تم کھڑکی پر پردہ ڈال دیتی ہو تو لگتا ہے جیسے تم نے مجھے شب بخیر کہا ہو اور صبح کے یوقت جب تم کھڑکی سے پردہ کھسکا دیتی ہو تب بھی یہی لگتا ہے جیسے تم نے اپنی کھنکتی ہوئی ترنم سی آواز میں کہا ہو۔ ''صبح بخیر دیوشکن !'' اور ہاں جیسے مجھ سے مُسکرا کر یہ بھی پوچھا ہو۔ ''دیوشکن کیا رات تمہیں اچھی نیند آئی؟

وارینکا! صبح میں نے تمہیں صحن سے گزر کر کہیں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ تم بڑی ہشاش بشاش نظر آ رہی تھیں۔ صحت بھی پہلے سے بہتر تھی۔ اور تمہاری ''مذورا'' کیسی ہے؟ بڑبڑاہٹ کی بیماری تو اسے

بیشک ہے لیکن یہ ایک اچھے دل کی نیک خاتون ہے۔ اس کی اس عادتِ کو نظر انداز کر دیا کرو۔ میں نے تمہیں ''تھریسا'' کے بارے میں لکھا تھا وہ بڑی حلیم الطبع اور فرمانبردار خاتون ہے۔ میں تو اس فکر میں مرا جا رہا تھا کہ ہمارے خطوط کے تبادلے کا ذریعہ کیا ہو کہ خدا نے تھریسا کو رحمت کا فرشتہ بنا کر میرے پاس بھیج دیا۔ ہماری مکان مالکن بڑی خبیث اور ظالم عورت ہے۔ بے چاری مظلوم تھریسا پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے ہوئے کمبخت کا ذرا بھی تو دل نہیں دکھتا۔

میں جس مکان میں رہتا ہوں اُس میں اور بھی بہت سے کمرے ہیں جن میں کرائے دار رہتے ہیں۔ ایک رسوئی گھر کے وسط میں دیوار ایستادہ کر کے ایک مزید کمرے کا اضافہ کیا گیا ہے۔ میں اضافی کمرے میں رہتا ہوں۔ اب یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اس کمرے کی ایک کھڑکی آپ کی کھڑکی کے عین سامنے کھلتی ہے۔ پھر صحن مختصر ہونے کی وجہ سے میں تمہیں یہاں سے گزرتے ہوئے بھی دیکھ سکتا ہوں۔ یہاں قیام و طعام کافی سَستا ہے۔ کل چوبیں ''روبل'' میں رہائش اور کھانا دونوں کا بندوبست ہے۔ جبکہ اس سے پہلے جہاں رہائش تھی وہاں مجھے تیس ''روبل'' ماہانہ ادا کرنے پڑتے تھے۔ تو رخصت ہوتا ہوں میرے فرشتے! تمہارے لئے گل مہندی اور جرینیم کے پھول لایا تھا سو تمہارے لئے بھیج رہا ہوں۔ نرسری میں دوسری قسم کے پھولوں کے گملے بھی ہیں۔ اگر پسند کرو تو وہ بھی خرید کر لے آؤں۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ پیسے میرے پاس ہیں۔ ہر ماہ کچھ نہ کچھ بچا کر رکھتا ہوں۔ اور ہاں خط مفصل تحریر کرنا۔ تھریسا کے ہاتھوں ایک پونڈ مٹھائی بھجوا رہا ہوں۔ خدا کے لئے کوئی ایسی ویسی بات مت لکھ دینا کہ میری خوشیاں ہی تباہ ہو کر رہ جائیں تو تو الوداع میرے جگر کو شے۔

(تمہارا اچھا اور سچا دوست۔ ''دیوشکن'')

☆☆☆

۸راپریل

میرے رفیق و شفیق دوست دیوشکن !

مجھے لگتا ہے میں آپ سے لڑ پڑوں گی۔ میں نے آپ سے کتنی بار منع کیا ہے کہ یہ تحفوں کا سلسلہ بند کر دیجیے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ سب کرنے کے لئے آپ کو اپنی جائز ضرورتوں کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے۔ آپ میری خاطر اپنے آپ کو قربان کرتے ہیں۔ مجھے آپ کے تحفے قبول کرتے وقت عجیب سے ذہنی کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔ بار بار تو کہہ چکی ہوں مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ ویسے بھی میں آپ کا احسان چکانے کی حیثیت میں نہیں ہوں۔ لانا ہی تھا تو گل مہدی کا گملہ کافی ہوتا۔ یہ جرینیم قیمتی پھولوں کا گملہ لانے کی کیا ضرورت تھی۔

قرمزی رنگ کے پھول بڑے خوبصورت ہیں۔ گملہ میں نے جنگلے کی الماری میں سجا دیا ہے۔ مذورا تو پھولوں کی بہار دیکھتے ہی کھل اُٹھی تھی۔ مگر دیوشکن! آپ غلط کہتے ہیں کہ یہ سب کرنے کے لئے آپ اپنا پیٹ نہیں کاٹتے ہیں۔ میں جانتی ہوں آپ نے اپنی بہت سی ضروریات پس پشت ڈال رکھی ہیں۔ دیکھئے میں آپ سے پھر التجا کرتی ہوں آپ میری خاطر بالکل بھی خرچہ نہ کیا کریں۔ مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور آپ کوئی دولت مند نہیں ہیں۔

آپ نے پوچھا ہے کہ مذورا اور میرا ساتھ کب سے ہوا؟ وہ میرے ساتھ بہت دن سے ہے۔ وہ میرے لئے کام لاتی ہے اور اب میری زندگی اُسے کے سہارے بسر ہو رہی ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ صبح میں خوشی خوشی ریشم اور کشیدہ کاری کا کچھ سامان خریدنے بازار گئی تھی۔ مگر اب پھر اداس ہوں۔ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ کر کہ آگے میرا کیا ہوگا میں بہت اُداس ہو جاتی ہوں۔ جہاں تک کہ میرے ماضی کا تعلق ہے وہ بھی اس قدر گھنونا اور تلخ ہے کہ اس کے تصوّر سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے میری دنیا میں آگ لگائی مجھے برباد کیا مجھے ان پر رہ رہ کر غصّہ آتا ہے۔

رات گھرتی آرہی ہے۔ مجھے اب لگ کر کام کرنا ہوگا تا کہ کپڑے وقت پر تیار ہو جائیں۔ کام کی عجلت ہے اس لئے اب مزید نہ لکھ سکوں گی۔ مجھے آپ کی مظلومہ تھریسا ملی تھی۔ واقعی بے چاری کی حالت تباہ تھی۔ میں نے اُسے بیس "کوپک" دیدیے۔ آپ تو قریب ہی رہتے ہیں کبھی وقت نکال کر غریب خانے پر تشریف لائیے۔

آپ کی
وارینکا

☆☆☆

۸/اپریل

قرار جاں اور سکون قلب وجگر وارینکا !

ہاں تو میری محبت ! میرے دل کی دھڑکن ! آج کا دن مجھ سے برہم و برگشتہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے خوب مذاق اُڑایا ہے میرا اور میں اسی کا مستحق ہوں۔ چندیا پر جمے چار بالوں کے بَل بوتے مجھ کھسکتی عمر والے انسان کو عشق ومحبت کے معاملات زیب نہیں دیتے مگر وہ تو انسان نہیں کوئی فرشتہ ہی ہوسکتا ہے جو الٹی سیدھی حرکتوں میں ملوّث نہ ہو۔ خطا ہر دل سے ہوتی ہے کہ ہر دل پیار کرتا ہے۔ تو پھر اکیلا میں ہی سزاوار کیوں ؟ افسوس ہو رہا ہے کہ آپ کو لکھا ہی کیوں؟ اوپر سے ایک مصیبت یہ بھی نازل ہوئی کہ ٹھنڈا کوٹ پہن کر دفتر چلا گیا۔ بس پھر کیا تھا موقع غنیمت جان کر سردی نے فوراً ہی مجھے دبوچ لیا۔ اب سَر میں بھی درد ہے۔ اور کمر میں بھی۔ ہاں آپ نے اپنے یہاں آنے کے لئے مدعو تو کیا ہے۔ اب سوچ سوچ کر پریشان ہوں لوگوں نے دیکھ لیا تو اپنے دل میں نجانے کیا سوچیں گے۔ دن کے اُجالے میں نہیں میری گڑیا! بہتر ہوگا کہ کل شب کے اندھیرے میں اپ سے ملاقات کروں۔ میں پھر کہتا ہوں میری تمنا کی بہار! کہ میرے خط کی اوٹ پٹانگ تحریر سے کوئی غلط سلط مطلب اخذ مت کر لینا۔ میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ کبھی کبھی میرا قلم مجھ سے پوچھے بنا اپنی مرضی سے بھی بہت کچھ لکھ دیتا ہے۔ تو پھر اب اجازت دو۔ خدا نگہبان ہو تمہارا۔

تمہارا پرستار
دیوشکن

☆☆☆

۹/اپریل

میرے نگہبان و مہربان !

میرے دردمند بہی خواہ ! آپ کو شرم آنی چاہیئے۔ بے پر کی اُلٹی سیدھی باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں۔ آپ تو یونہی دلگیر ہوگئے۔ دوست کبھی کبھی ضبط و احتیاط کا دامن تھام نہیں پاتی ہوں۔ آپ میرے الفاظ کو غلط معنی نہ پہنایا کیجیے۔ میں تو خیال و خواب میں بھی یہ نہیں سوچ سکتی کہ آپ کی ڈھلتی عمر کا مذاق اُڑاؤں۔ آپ کے کردار پر حرف گیری کروں۔ آج میری طبیعت کافی علیل ہے۔ بخار چڑھا ہے۔ سردی سے بدن کانپنے لگتا ہے مذورا میری یہ حالت دیکھ کر متفکر ہو اٹھی ہے۔ زیادہ نہ لکھ پاؤں گی۔ آخر میں اتنا اور کہنا چاہوں گی کہ آپ میری طرف سے اپنا دل صاف رکھیئے اور یقین کیجیے میں ہمیشہ آپ کا احترام کروں گی۔ آپ کو چاہوں گی۔ بس خوش۔

آپ کی فرمانبردار اور خدمتگار

وارینکا

☆☆☆

۱۲/اپریل

میری موسم بہار! نکہت گل وارینکا !

اُف! یہ آپ نے اپنی طبیعت کیوں خراب کرلی ہے۔ میں ہمیشہ ہی تو تاکید کرتا رہتا ہوں کہ اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔ مگر آپ میری مانتی کب ہیں۔ آپ دھان پان سی نرم و نازک کلی جیسی تو ہیں آپ کو تو اور بھی اپنا دھیان رکھنا چاہیئے۔

آپ کا جاں نثار اور وفادار دوست

دیوشکن

☆☆☆

۲۵/اپریل

میرے ہمدرد خیر خواہ دیوشکن !

آج میری ملاقات میری چچازاد بہن ''ساشا'' سے ہوئی ہے اور میرے مکروہ ماضی کے خوفناک سایوں نے مجھے پھر سے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ''آنا فیودورونا'' پھر سے میری تلاش میں ہے۔ وہ آپ سے بھی واقف ہو چکی ہے۔ تمام میں کہتی پھرتی ہے کہ میں آپ کے ٹکڑوں پر پل کر اپنے چال چلن کو بٹہ لگا رہی ہوں۔ وہ یہ بات سب کو جتاتی ہے کہ اس نے مجھے اور میری ماں کو بھوکوں مرنے سے بچایا ہے۔ وہ مجھے الزام دیتی ہے کہ میں احسان فراموش ہوں۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ ''بیکوف'' کو لے کر اُس نے مجھے خوشحالی کا راستہ دکھایا تھا۔ مجھے وہ راستہ چھوڑنا نہیں چاہیئے تھا۔ بیکوف کو خوش رکھنے میں ہی میری بھلائی تھی۔ کیوں کیا میں نے بیکوف سے شادی کا تقاضہ؟ یونہی حالات کے دھارے میں بہتے رہنا کیا بُرا تھا؟ یہ سب باتیں سوچ کر میرا دماغ ماؤف ہونے لگتا ہے اور سارا بدن کانپنے لگتا ہے۔ یہ خط بمشکل دو گھنٹے میں لکھ پائی ہوں۔ خیر میری ان باتوں کا دل پر ذرا بھی اثر لینے کی

ضرورت نہیں ہے۔مذورا کی باتوں میں نہ آجانا وہ تو ہر بات میں تِل کا تاڑ بنا دیتی ہے۔
اچھا ہی ہوا اماں کہ تم نے اس بُری دنیا سے اپنا پیچھا چھڑا لیا ورنہ تم جب یہ دیکھتیں کہ تمہاری بے سہارا معصوم اور مظلوم بچّی پر دنیا والوں نے ظلم وستم کے کیسے کیسے پہاڑ توڑے ہیں تو تم خون کے آنسو رونے پر مجبور ہو جائیں۔

فقط ایک لاوارث اور مظلو یتیم
تمہاری وارینکا

☆☆☆

۲۰ رمئی

میری معصوم کلی پیاری وارینکا !
تمہیں یہ تھوڑے سے انگور بھیج رہا ہوں۔ان کا رس مقوی اور صحت بخش ہوتا ہے۔ کچھ دن پہلے تم نے شیر مال کی خواہش کا اظہار کیا تھا لہٰذا وہ بھی اسی کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔آپ نے لکھا ہے کہ میں اپنے حالات چھپا کر تم سے جھوٹ بولتا ہوں جبکہ میری مالی حالت اچھی نہیں ہے اور میں ہر طرح سے تباہ حال اور برباد ہوں۔تم مذورا کی باتوں کو اہمیت نہ دیا کرو۔اُس نے غلط کہا ہے کہ میں نے اپنے تن کا کوٹ نیلام کر دیا ہے۔بھلا کیوں بیچوں گا میں اپنا کوٹ؟ سب کچھ ٹھیک تو ہے۔تم ایسی اُلٹی سیدھی باتوں میں پڑ کر اپنا سکون برباد مت کیا کرو۔مت سوچا کرو ایسی باتیں۔ہاں اُس دن آپ سرسامی کیفیت میں مبتلا تھیں۔میں جم کر آپ کی پٹی سے لگا بیٹھا رہا تھا۔

☆☆☆

یکم جون

میرے محسن اعظم! میرے غم خوار ساتھی !
آپ میرے ماضی اور آنا فیودورونا کے بارے میں جاننے کے لئے اس قدر بیتاب کیوں ہیں مجھے ہر خط میں بار بار لکھتے ہیں کہ میری وہ نوٹ بک جس میں کہ میں نے اپنا ماضی نظر بند کر رکھا ہے آپ کو پیش کر دوں۔میں نے اس نوٹ بک میں اپنی زندگی کے سارے واقعات مختلف اوقات میں قلم بند کئے ہیں۔اب آپ نے ضد ہی پکڑ لی ہے تو لیجیے یہ نوٹ بک مذورا کے ہاتھ آپ کو بھجوائے دیتی ہوں۔ پڑھ کر اپنی تسلّی کر لیجیے۔

آپ کی اپنی
وارینکا

☆☆☆

میں اپنے والدین کے ساتھ گُبیرنیا(Gubernia) کے شہر ''تُلا'' کے مضافاتی علاقے میں رہائش پذیر تھی۔کافی الھڑ چنچل اور شوخ تھی۔وہاں میرے والد کو نوکری سے برطرف کر دیا۔میرے والد نے پس انداز کیا ہوا کچھ پیسہ بغرض کاروبار ''پیٹرس برگ'' میں لگایا ہوا تھا اس لئے ہم لوگ بھی ''پیٹرس برگ'' میں منتقل ہو گئے۔میرے والد کاروبار کو ٹھیک ڈھنگ سے سنبھال نہ پانے کے سبب روز بروز

قرضوں میں گھرتے چلے گئے اور ''ستوررونا'' میں جو پیٹرس برگ کا ایک محلّہ تھا اور جہاں ہمارا ذاتی مکان تھا اسی میں میرے والد بیمار پڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے انتقال کے ساتھ ہی قرضے کی رقم واپس مانگنے والوں کی ایک فوج نے ہم پر یلغار بول دی۔ ہم نے قرضہ چکانے کے لئے اپنا مکان فروخت کر دیا۔ پھر جب کہ ہم کھلی فضا میں نیلے آسمان کی چھت کے نیچے بیٹھے بے آسرا بے یارومددگار اور دانے دانے کو محتاج اپنی قسمت کو رو رہے تھے کہ تبھی آنا فیودورونا نے نمودار ہو کر خود کو والد صاحب کی رشتے دار ظاہر کیا جبکہ ہم نے انہیں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ کبھی والد صاحب نے ہم سے ان کا ذکر کیا تھا۔ انہوں نے والد صاحب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اُن کی اَنا اور ضدّی طبیعت نے آج یہ دن دکھلایا ہے۔ وہ قطعاً ناتجربے کار تھے پھر بھی کاروبار میں اپنی ہی چلاتے تھے اور اسی وجہ سے اس حال کو پہنچے۔ آنا فیودورونا کی عمر کچھ بھی سہی بدن گداز اور سڈول تھا۔ وہ بڑے ٹھسّے سے رہتی تھیں۔ چھٹویں سڑک پر بڑے سے احاطے اور پانچ کمروں والا ان کا اپنا مکان تھا۔ ان کی اور میری چچازاد بہن ساشا کی رہائش کے لئے تین کمرے وقف تھے۔ ساشا بچپن میں ہی یتیم ہو گئی تھی اور وہ تب سے اب تک ان کے ساتھ یہیں رہتی تھی۔ چوتھا کمرہ جو ان کے کمروں سے قدرے فاصلے پر تھا اس میں انہوں نے ہمیں رکھ دیا تھا۔ ہمارے بعد کے پانچویں اور آخری کمرے میں ''پوکروفسکی'' نام کا ایک طالب علم رہائش پذیر تھا۔ وہ ساشا کو اور مجھے ٹیوشن پڑھایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس کے غریب اور پھٹے حال باپ بھی اپنے بیٹے سے ملنے وہاں آتے رہتے تھے۔ انہوں نے دوسری شادی کی تھی اور ان کی سخت گیر اور کرخت مزاج بیوی ان کی اکثر پٹائی کرتی رہتی تھی۔ سوتیلی ماں کے ظلم وستم سے بچنے کے لئے ہی پوکروفسکی نے گھر چھوڑ دیا تھا۔ اور اب یہاں مقیم تھا۔ آنا فیودورونا کے بڑے پُراسرار اور انتہائی قریبی دوست ییکوف جو اکثر یہاں آتے جاتے تھے نے پوکروفسکی کو یہاں رکھنے کی آنا سے سفارش کی تھی۔ اس کے باپ کی پہلی شادی بھی ییکوف نے ہی کرائی تھی۔ ساتھ ہی دلہن کو بطور جہیز پانچ سو ''روبل'' بھی پیش کئے تھے۔ انہوں نے یہ سب کیوں کیا؟ آخر کیوں؟ یہ سوال آج بھی جواب کا طالب ہے۔ پوکروفسکی کی حقیقی ماں اور اس کے باپ کی پہلی بیوی حُسن و جمال میں بے مثال تھی۔ ایسی خوبصورت حسینہ کی پوکروفسکی کے پھٹے حال باپ کے ساتھ بے جوڑ شادی میں ییکوف کی دلچسپی بھی اسرار سے خالی نہیں ہے۔ آنا فیودورونا کے ٹھاٹ باٹ، ان کی آمدنی کے ذرائع اور گھر میں انے والے اُن کے بہت سے دوست بھی اپنے آپ میں ایک ایسا راز تھے جسے سمجھ پانا میرے لئے آسان نہیں تھا۔

شروع میں تو آناجی کا سلوک ہمارے ساتھ اچھا ہی تھا۔ مگر یہ بعد میں تبدیل ہو گیا۔ ''میں اگر ان خودغرض اور احسان فراموشوں کو اُٹھا کر یہاں نہ لاتی تو یہ بھوک اور فاقوں کے جہنم میں جل کر اب تک کبھی کے مَر کھپ گئے ہوتے۔'' ان کی ناراضگی کی بنیادی وجہہ یہ تھی کہ ہم اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتے تھے اور ہمیں ان کے دوستوں کے ساتھ گھل مِل کر باتیں کرنا پسند نہیں تھا۔

پھر یہ ہوا کہ پوکروفسکی بیمار پڑا اور مر گیا۔ اس کے بعد میری ماں بھی جو پہلے ہی بیماریوں میں گھری ہوئی تھیں گذر گئیں اور مجھ بیکس ولاچار کو یتیم ویسیر کو بے رحم اجنبیوں کی خودغرض دنیا میں بے سہارا اور بے یارومددگار چھوڑ گئیں۔ غم کی شدت نے مجھے ہوش وحواس سے بیگانہ کر دیا تھا۔ مجھے دنیا اور دنیاداری کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔ میرا دماغ محض ایک کورا

کاغذ بن کر رہ گیا تھا۔ اب سازگار موسم اور موقع کی نزاکت کا فائدہ اُٹھانے کی غرض سے انا فیودورونا میری ہمدرد اور بہی خواہ بن کر میرے قریب آئیں اور انہوں نے میرے دماغ کے کورے کاغذ پر جو بھی لکھ دیا میں اُسی کے مطابق چل پڑی۔ اور اس طرح وہ مجھے یکوف تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئیں۔

☆☆☆

۱۱رجون

دوست دیو شکن! کل تم نے مجھے جزیرے کی سیر کرائی۔ کھلی فضا، مست ہوا اور چاروں طرف چھائی ہریالی کی بہار دیکھ کر میرا جی کیسا لہلہا اُٹھا تھا۔ درختوں کی قطاریں گلپوش جھاڑیاں، بہتے ہوئے شفاف چشمے۔ میں جہاں اور اور جدھر بھی جاتی آپ میرے قریب آ کر کھڑے ہو جاتے۔ مجھے خوش پا کر آپ کی آنکھوں میں خوشی کے چراغ سے جل اُٹھتے تھے۔ آپ کی یہی ادا اور یہی اپنائیت تو میرا دل موہ لیتی ہے۔ یونہی تو فدا ہوں میں آپ پر۔ آج کل میرے ساتھ مذورا کی طبعیت بھی خراب چل رہی ہے۔

تمہاری "د"

☆☆☆

۱۳رجون

مرے راہبر مرے ہم سفر !

یہ رقعہ میں بڑی عجلت میں تحریر کر رہی ہوں۔ مجھے وقت پر کام تیار کر کے دینا ہے۔ اب ذرا توجہ کے ساتھ سنو۔ مذورا نے بتایا ہے کوئی ضرورت مند اپنی اچھی حالت کی وردی جو کوٹ پتلون اور واسکٹ پر مشتمل ہے فروخت کر رہا ہے۔ کافی سستی ہے مہربانی کر کے کنجوسی چھوڑ کر اسے فوراً ہی خرید لیجیے۔ آپ اکثر کہتے ہیں کہ آپ پیسے بچا کر رکھتے ہیں پھر خریدنے میں کیا پریشانی ہے۔ آپ کہتے ہیں نیا سوٹ سلنے گیا ہے۔ اب اور نہ بہکایئے۔ کیسے گندے سِلے اور پھٹے پُرانے کپڑے پہنتے ہیں آپ۔ گوڑے میں لگے پیوند تک تو اُدھڑے ہوئے ہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ میں اپنی آپ بیتی کا بقیہ حصّہ بھی لکھ کر آپ کو بھیج دوں۔ نہیں دوست نہیں۔ ماضی کے زخموں کو کریدنے کی ہمّت اَب مجھ میں بالکل بھی نہیں ہے۔ آنا فیودورونا اپنی صفائی دیتی پھرتی ہے کہتی ہے کہ میری تباہی میں اس کا ہاتھ نہیں ہے۔ کہتی ہے اُس پھٹے حال بڈھے سے تمہیں کیا ملے گا۔ اس کا یہ اشارہ آپ کی طرف ہے۔ کہتی ہے اسے چھوڑ کر واپس چلی آؤ میں یکوف سے معافی منگوا کر تمہارے درمیان صلح کروا دوں گی۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ یکوف مجھے معقول جہیز پیش کرنے کے لئے راضی ہیں۔ یکوف کیا مجھے کسی سے بھی کچھ بھی نہیں لینا۔ میں آپ کی اور مذورا کی صحبت میں رہ کر ہی بہت خوش ہوں۔ کاش ہم تینوں کا ساتھ ہمیشہ بنا رہے۔

وارنیکا

☆☆☆

۲۱رجون

میری قسمت کی درخشاں ماہتاب !

تم تو منھ سے نکلی ہر بات کا افسانہ بنا دیتی ہو۔ میرے کوٹ کے علاوہ بھی تو موضوع ہو سکتے

ہیں۔ خیر! مجھے مذورا سے پتہ چل گیا تھا کہ تمہارے پاس شمیضوں کی کمی ہے میرے پاس پیسے تھے۔ چار شمیضیں خرید کر آپ کو بھجوادیں۔ اب کیا ہر بات پر تبصرہ ضروری ہے۔ میری جان وجگر! میری خوشی اسی میں ہے۔ خدا کے لئے مجھے ٹوک کر میری خوشیاں برباد مت کیا کرو۔ تم نے ریشم کے گچھے خرید کر لانے کو کہا ہے۔ تو سمجھ لو کہ یہ تم تک پہنچ گئے۔

تمہارا اپنا
دیوشکن

☆☆☆

۲۵ر جون

دوست دیوشکن !

میں نے دل بہلانے کی غرض سے کہا تھا کہ کوئی کتاب ہو تو بھیج دینا مگر تم نے مجھے یہ کیسی کتاب بھیجی ہے؟ کیسا مذاق ہے تمہارا؟ کیسی فحش کتاب ہے۔ اس کا ایک ہی پیرا پڑھ کر میرا چہرا شرم سے لال پڑ گیا۔ تم ایسی کتابیں کیوں پڑھتے ہو؟ اچھی اچھی کتابیں پڑھا کرو۔ کتاب واپس لوٹا رہی ہوں۔

وارینکا

☆☆☆

۲۶ر جون

اچھی وارینکا! یہ کتاب میری پڑھی ہوئی نہیں تھی اور مجھے تمہاری پسند کا علم بھی نہیں تھا اب تمہارے دل کی خوشی کے لئے ''واتازیائیف'' کی کتاب ''اطالوی جذبات'' میں شامل معرکتہ لآرا نظم ''وارینکا'' کے چند ایسے مصرعے نقل کر کے بھیج رہا ہوں۔ جنہیں پڑھتے ہی رگ و پے میں لطف و سرور کی بجلیاں دوڑنے لگیں گی۔ لو پڑھو'' اور لرزا ٹھا والا یمر اور! رسرائیت کر گئیں اُس کے لہو میں آرزو کی تڑپتی مچلتی بے قرار مچھلیاں ردھڑک اُٹھا اس کا دل راور پگھلنے لگا بدن رسینہ متزلزل ہو گیا اور سانسیں بے قابو۔

کاؤنٹیس کے لب نعلیں تھرتھرا اُٹھے رپھولنے پچکنے لگی چھاتی ردھونکنی کی طرح رانگارہ بن کے دہک اُٹھے رخسار، شہوانیت کی موجیں دہکتے لاوے کی طرح رسر پٹکنے لگیں۔ بدن کے ساحل پر راور پھر آگ کی زمین اور آگ کے آسمان رکے وسطی شعلہ زاروں میں رامنڈتے اور گھمنڈتے رتڑپتے سلگتے اور پگھلتے رپورا ہوا سفر ردو پیاسی جوانیوں کا۔''

اور جانتی ہو اس شعری مجموعے کے خالق کو کتاب کا معاوضہ کتنا ملا تھا؟ اتنا کہ اس رقم سے بڑی سے بڑی جاگیر خریدی جاسکتی ہے۔

تمہارا ''د''

☆☆☆

۲۷ر جون

دیوشکن! نظم پڑھی۔ اوپر سے کچھ بھی کہو مگر اندر سے تو یہ خوب ہی پسند آتی ہیں کیونکہ ان میں موجود جذباتی تھرتھراہٹ دلوں کو چھو ہی لیتی ہے۔ انہیں پڑھ کر تمہیں مسرت کا احساس ضرور ہوتا ہوگا۔ ان

سے فرحت وتازگی مجھے بھی ملتی ہے۔ مگر میرے موجودہ حالات میں یہ میرے لئے سم قاتل سے کم نہیں ہیں۔

اِدھر میں نے جو قالین کاڑھ کر تیار کیا ہے اس کے بدلے میں مجھے پچاس ''روبل'' ملیں گے۔ پیسے ہاتھ میں آتے ہی اس میں سے تین ''روبل'' میں مذورا کے ہاتھ پر رکھدوں گی۔ میں آپ کو الیکساندر پشکن کی کہانیوں کا مجموعہ بھیج رہی ہوں۔ کتاب خراب نہ ہو۔ یہ مجھے واپس لوٹانی ہے۔ مذورا کہتی ہے کہ مجھے معلمہ کی نوکری مل سکتی ہے۔ پھر مجھے اتنی محنت نہیں کرنی پڑے گی اور میں صحت مند ہوجاؤں گی۔ میں بھی سوچتی ہوں اگر ایسا ہوجائے تو بُرا ہی کیا ہے۔

☆☆☆

۲۸ رجون

میری متاع حیات وارینکا !

یہ تم نوکری کا کیا ذکر لے بیٹھیں۔ میں تمہیں اس کی اجازت کبھی نہیں دونگا اور ضرورت پڑنے پر تمہاری خاطر تن کا پھٹا کوٹ بھی بیچ ڈالوں گا اور تم پر آنچ بھی نہیں آنے دوں گا۔ تم بیمار ہی کب ہو۔ تمہارا حسن گلاب کی طرح مہک رہا ہے۔ نہیں تم اسی وقت نوکری کے خیال کو اپنے دل سے نکال کر پھینک دو۔ میں جانتا ہوں نوکری کی یہ پٹی تمہیں مذورا نے پڑھائی ہے۔ بڑی پاگل عورت ہے۔ تم اس کی بات پر کان نہ دھرا کرو۔ آج شام میں تم سے ملنے آرہا ہوں۔

''دیوشکن''

☆☆☆

یکم جولائی

میرے صنم میرے محبوب !

مہربانی کرکے مجھے نوکری کے لئے منع نہ کرو۔ مجھے چین کی روٹی نصیب ہونے دو۔ میں اجنبی ماحول کے ساتھ سمجھوتہ کرلوں گی۔ مذورا کا یہ بڑھاپا ہے۔ اُسے میری وجہ سے ذرا بھی آرام نہیں ملتا ہے۔ وعلی الصبح جاگ کر سارے گھر کی صفائی اور دھلائی کرتی ہے۔ کام لاتی لے جاتی ہے۔ ادھر آپ بھی میری وجہ سے زیر بار ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو ہی دیکھیے میرے لئے تن کا پھٹا کوٹ تک فروخت کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ خدا کے لئے ایسی باتیں نہ سوچا کیجیے۔ مجھے کسی شئے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری ضرورت کا میرے پاس سبھی کچھ موجود ہے۔ میں سرتاپا پیار ہوں۔ ٹوٹ کر پیار کرسکتی ہوں مگر دوسروں کے احسانوں کا بدلہ چکانے کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میں ایک یتیم ویسیز اور افلاس زدہ مظلوم لڑکی ہوں۔

آپ کی چاہت

وارینکا

☆☆☆

یکم جولائی

وارنیکا! تم یہ بھی تو سوچو کہ جب تم ہی نہ ہوگی تو میں جیوں گا کیسے۔ کیا میری ہولناک تنہائیوں کے زہریلے ناگ ڈس نہ لیں گے مجھے۔ میں تمہاری قربتوں کا عادی ہوگیا ہوں تم ہی بتاؤ کیا جل بن مچھلی

تپتے ہوئے ریت پر زندہ رہ سکتی ہے؟ اور اگر نہیں تو یاد رکھنا تمہارے بعد میں ''نیوا'' ندی کے پل پہنچ جاؤں گا۔ پھر کیا ہے ایک لمبی چھلانگ اور زندگی کی کہانی ختم۔

تمہاری زلف گرہگیر کا اسیر
دیوشکن

☆☆☆

۶ر جولائی

میرے حبیب ونصیب !

مذورا نے پچاس ''روبل'' میرے ہاتھ پر لا کر رکھے تو تین ''روبل'' میں نے اُسے دے دیے۔ خوش ہو کر اس نے مجھے بہت دعائیں دیں۔ اس وقت آپ کے لئے میں ایک واسکٹ تیار کرنے میں لگی ہوں۔ بڑا اچھا کپڑا ہے پیلے رنگ کی زمین میں لال رنگ کے پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ آپ کو نکولائی گوگول کی کتاب بھیج رہی ہوں۔ اس میں کہانی ''گرم کوٹ'' پڑھنا نہ بھولنا۔ آپ نے تھیٹر چلنے کی دعوت دی ہے۔ سوچ لینا یہ تفریح مہنگی تو نہ پڑے گی۔ مذورا کہتی ہے آپ حیثیت سے زیادہ خرچہ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہاں یہ تو بتاؤ تھیٹر جانے کے لئے اگر میں کالے رنگ کا فراک اور گلابی رنگ کا اسکارف منتخب کروں تو کیا یہ مناسب ہوگا؟

وارنیکا

☆☆☆

۲۷ر جولائی

میرے محبوب دیوشکن !

آپ عرصے سے مجھے گمراہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے بار بار آپ کو تاکید کی مگر پھر بھی آپ غار میں جا ہی پڑے۔ اب جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ نے پیشگی پیسہ لے کر برباد کیا ہے اور میری بیماری کے دوران آپ نے اپنے تن کا کوٹ بیچ ڈالا ہے۔ آپ نے دوستی میں جھوٹ بول کر دوستی کے جذبے کو ٹھیس پہنچائی ہے دوست! آپ نے اپنی نجی ضرورتوں کا سارا پیسا تحائف مٹھائی، پھل اور تھیٹر کے ٹکٹوں پر ضائع کر دیا ہے۔ آپ کی نادانی پر میں افسوس اور پچھتاوے کے تلخ گھونٹ پی رہی ہوں۔ مجھے گنہگار ہونے کا احساس تڑپا رہا ہے۔ آپ نے میرا کلیجہ چھلنی کر دیا ہے۔ بہت دُکھ دیا ہے مجھے۔

وارنیکا

☆☆☆

۲۸ر جولائی

میری کانچ کی گڑیا وارنیکا !

تمہاری ناراضگی کا مجھے احساس ہے اس لئے اب نہیں چھپاؤں گا۔ ہاں یہ سچ ہے میرے جگر پارے ! کہ میں بری طرح برباد ہوں اور قرض کے بوجھ سے دبا جا رہا ہوں۔ میرے تن کا لباس بھی اب بہت خستہ ہو چکا ہے۔ تم نے میرے گذارے کے لئے مجھے پچاس کوپک بھیجے ہیں۔ اس بات سے میرا

دل پاش پاش ہو چکا ہے۔ کیسے غم کی بات ہے کہ میرے گذارے کے لئے میری گڑیا اپنے خون پسینے سے کمائے پیسے مجھے دے رہی ہے۔ اور میں ایک یتیم بچّی کے پیسے اینٹھ رہا ہوں۔ لعنت ہے میرے اوپر اُف!

تمہارا گنہگار

دیوشکن

☆☆☆

۴راگست

میری اُمید کے روشن چراغ ''د''

آپ میری خاطر کچھ پیسوں کا بندوبست کر لیجیے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کی خستہ حالت سے واقفیت کے باوجود بھی میں آپ سے درخواست کرنے پر مجبور ہوں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ میں اب اس گھر میں نہ رہ سکوں گی۔ یہاں سے میری منتقلی ضروری ہوگئی ہے۔

ہوا یہ کہ ایک اجنبی جس کی وردی پر تمغے سجے ہوئے تھے مجھے لاوارث اور لاچار سمجھ کر ایکا ایکی ہمارے گھر میں گھس آیا۔ اُس وقت مذورا بازار گئی ہوئی تھی۔ اُس نے کہا وہ میرے لئے اپنے دل میں پدرانہ جذبات رکھتا ہے۔ مجھے چاہیئے کہ میں اس کی سرپرستی میں اس کے ساتھ رہنا منظور کر لوں۔ وہ میری امداد میں ہمیشہ اور ہر طرح پیش پیش رہے گا۔ میں حیران و ششدر سی ابھی سوچ بھی نہ پائی تھی کہ اس کی پیشکش پر میں کس طرح کا ردِ عمل ظاہر کروں کہ اسی دوران نجانے کب اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور میرے رُخسار تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''ہائے میری جان! تم کتنی خوبصورت ہو۔ اس نے میرے رخساروں میں پڑنے والے چاہِ زقن (بھنور) کی بھی تعریف کی اور پھر دفعتاً بے قابو ہو کر میرے پیار لینے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنا ہی نیچ تھا وہ۔ کہہ رہا تھا اُس نے میرے لئے ایک شاندار حویلی کا بندوبست کر رکھا ہے جہاں میں سں رانی بن کر رہوں گی۔ وہ اب طاقت آزمائی پر اُتر آیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ میرے پیار لینے میں کامیاب ہو پاتا وہاں مذورا آ گئی اور وہ جھینپ کر رہ گیا۔ اس نے مذورا کو ایک طرف لے جا کر کچھ پیسے بھی دینے کی کوشش کی جنہیں مذورا نے پایہ حقارت سے ٹھکرا دیا اور چلاّ کر کہا کہ وہ اسی وقت گھر سے نکل جائے۔ جاتے جاتے بھی وہ یہی کہتا رہا کہ وہ یہاں پھر آئے گا اور مجھے جڑاؤ نگینے والے بندوں کا قیمتی تحفہ پیش کرے گا۔ اس نے مجھے نصیحت بھی کی کہ میں گھٹیا قلاش اور آوارہ لوگوں کے ساتھ سستے میں اپنا حسن و شباب داغدار نہ کروں اس نے مجھ پر یہ بات بھی واضح کر دی کہ وہ آنا فیودورونا کا دوست ہے اور آنا بھی مجھے سمجھانے بجھانے کے ارادے سے یہاں آنے والی ہیں۔ غرض کہ ہم دونوں اس ڈھیٹ کو بمشکل گھر سے نکال پائے۔ تو یہ آنا فیودورونا کے تاشوں کی گڈی کا ایک پتا تھا لگتا ہے وہ اس سودے بازی سے نفع کمانے کے پھیر میں ہیں۔ ایسی نازک صورتحال میں ہمارا یہاں سے جلد از جلد نکل جانا ہی بہتر ہوگا۔ ایسے آڑے وقت میں جتنا بھی ممکن ہو تم قرض لے لو اور بھاری سود کی بالکل پرواہ مت کرنا۔ میں سب ادا کر دوں گی۔

وارنیکا

☆☆☆

۱۱راگست

میری گل بکاولی !

قرضے کے لئے بتانا مشکل ہے کہ میں کہاں کہاں کس کس کے در پر گیا؟ کس کس کے آگے قرض کے لئے گڑگڑایا اور کس کس کے دھکے کھا کر اور ذلیل وخوار ناکام لوٹا۔ اب تمہارے خط سے پتہ چلا کہ تم نے گھر چھوڑ کر جانے کے بجائے یہیں رہ کر حالات کا سامنا کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو دل کے اوپر سے پتھر ہٹ گیا اور اب میں بے حد خوش ہوں مگر مصیبتوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا ہے اور میں ہر طرح سے تباہ و برباد ہو چکا ہوں۔ ساری عزت خاک میں مل چکی ہے۔ لوگ مجھے دیکھ کر تمسخرانہ ہنسی ہنستے ہیں۔ مجھ پر پھبتیاں کستے ہیں۔ مکان مالکن تو میرے منہ پر ہی مجھے خوب کھوٹی کھری سناتی ہے۔ چیختی چلاتی ہے اور گالیاں تک سناتی ہے۔ کوسے بھی خوب دیتی ہے اور ہر طرح ذلیل کرتی ہے کیونکہ میں اسے کمرے کا کرایہ نہیں دے پا رہا ہوں۔ اس کمبخت کو ہمارے تعلقات کا علم ہوگیا ہے۔ کہتی ہے "لوگو دیکھ لو اسے مجھ بیوہ بڑھیا کو دینے کے لئے اس کے پاس کرایہ نہیں ہے۔ مگر سامنے والی حرافہ کو دینے کے لئے اس کے پاس سب کچھ ہے کیونکہ وہاں اس نوعمر حسینہ سے عیاشی کرنے میں اس بوڑھے عیاش کو مزہ ملتا ہے۔ یہ اپنے مزے کی خاطر میرے کرایے کے پیسے بھی اسے دیدیتا ہے اور مجھے ٹرخائے چلا جا رہا ہے۔"

تو دیکھا وہ بدزبان...... وہ مردود. وخبیثہ نہ صرف مجھ پر بلکہ تم پر بھی غلاظت اچھالتی ہے۔ میں مصیبتوں کی کال کوٹھری میں قید ہو کر رہ گیا ہوں۔

بدنصیب اور گردش زدہ
دیوشکن

☆☆☆

۱۳راگست

میرے ہمدم میرے دوست !

ہم پر آج کل یکے بعد دیگرے گردشِ اور نئی نئی مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں۔ پہلے تو میرے ہاتھ میں چوٹ لگی اور پھر کپڑے پر استری کرتے وقت ہاتھ بُری طرح جَل گیا۔ ادھر دو تین دن سے مذورا بھی بیمار پڑی ہے۔ لگتا ہمارے بھوکوں مرنے کے دن نزدیک آ چکے ہیں۔ ادھر آپ بھی ہمیں غم پر غم دیئے چلے جا رہے ہیں۔ کتنا دُکھ ہوتا ہے آپ کا یہ حال دیکھ کر کہ آپ آج کل اُناپ شناپ پینے لگے ہیں۔ سڑکوں پر گر کر بیہوش ہو جاتے ہیں۔ اور راہگیر آپ کو اُٹھا کر آپ کے کمرے پر پہنچاتے ہیں۔ پیارے دوست! تمہیں ہم پر ترس نہیں آتا نہ سہی کم از کم اپنے اوپر تو رحم کھاؤ۔ سدھرنے کی کوشش کرو۔

تمہاری وارنیکا

☆☆☆

۱۹راگست

میرے قصرِ تخیلات کی حسین شہزادی !

میں آپ کی پریشانیوں میں اضافے کا سبب بن گیا ہوں یہ بات میرے لئے سوہانِ روح بنی

ہوئی ہے۔کاش! میں مرگیا ہوتا اور میں نے شراب نہ پی ہوتی۔ کیسا وحشی جلاد اور ظالم ہوں میں کہ اپنی معصوم کلی کو دُکھ پہنچاتا ہوں۔ آپ نے چاندی کے تیس ''کوپک'' ایک بار اور پچیس ''کوپک'' ایک بار مجھے بھیجے ہیں۔ کیسا لعنتی بے غیرت اور بے ضمیر ہوں کہ ایک بے سہارا اور یتیم بچی کی خون پسینے کی کمائی ہڑپ کئے جارہا ہوں۔''د''

☆☆☆

۹ر ستمبر

میری نورِ نگاہ وارنیکا!

آج بڑا عجیب واقعہ ہوا۔ دفتر میں ڈرافٹ لکھتے وقت مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی جس پر صاحب کے سامنے میری پیشی ہوگئی۔ صاحب نے بطور سرزنش مجھے ڈانٹ کر کہا خیال رہے آئندہ ایسی غلطی نہ ہو کہ تبھی میرے کوٹ کا بٹن ٹوٹ کر لڑھکتا ہوا صاحب کے قدموں میں پہنچ گیا جسے جھک کر میں نے اُٹھا تو لیا لیکن میری ہیئت کذائی پر صاحب کی نظر پڑگئی اس پر انہوں نے ہیڈ کلرک سے کہا۔ ان صاحب کو ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی دیدو۔'' اس پر ہیڈ کلرک نے عذر پیش کیا کہ یہ تو کئی بار پیشگی تنخواہ لے چکے ہیں۔ صاحب نے سب کو اپنے چیمبر سے رُخصت کر دیا اور جب میں وہاں تنہا رہ گیا تو انہوں نے اپنے پرس سے نکال کر مجھے سو ''روبل'' دیئے اور کہا ''جاؤ اپنا حلیہ درست کرو میں بس اتنا ہی کر سکتا ہوں۔'' تبھی سے دل ہی دل میں میں انہیں دُعائیں دئے جارہا ہوں۔ خیر اب میں آپ کو پینتالیس روبل بھیج رہا ہوں۔ بیس روبل مکان مالکن کو چلے جائیں گے۔ اور بقیہ پینتیس روبل سے میں اپنی جملہ ضرورتیں پوری کرلوں گا۔

تمہارا
دیوشکن

☆☆☆

۱۰ر ستمبر

میرے پیارا! میرے غمگسار!

تمہارا آج کا رقعہ پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ اب آپ اپنی ساری ضرورتیں پوری کر لیجیے اور ذرا ہاتھ روک خرچ کیجیے۔ خیال رہے شراب کو چھوو گے بھی نہیں۔ میں نے بیس روبل قبول کر لئے ہیں باقی آپ کو واپس بھیج رہی ہوں۔

آپکی
وارنیکا

☆☆☆

۱۵ر ستمبر

میرے قدردان و مہربان!

آج میری غیر موجودگی میں بیکوف گھر آئے اور مذورا سے آپ کے بارے میں پوچھ تاچھ

کرتے رہے۔ گھر آنے پر جب یہ بات مجھے معلوم ہوئی تو میں بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی۔ پتہ نہیں کیوں ہمیں لوگ چین سے نہیں رہنے دیتے۔ کیوں یہ ہماری ذاتی زندگی میں ٹانگ اڑانے پر تلے ہوئے ہیں؟ کیوں یہ ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں؟ کیوں؟ آخر کیوں؟

واریکا

☆☆☆

۱۹ر ستمبر

میرے دل کے ٹکڑے !

تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ مجھے پارٹ ٹائم جاب مل گیا ہے۔ مسودہ ضخیم ہے۔ فی صفحہ چالیس "کوپک" کے حساب سے کافی روبل پلّے پڑ جائیں گے۔

تمہارا اپنا

دیوشکن

☆☆☆

۲۳ر ستمبر

میرے دل و جان کے مالک !

پچھلے کئی دن سے میں نے آپ کو کچھ بھی نہیں بتلایا۔ پرسوں ہمارے یہاں بیکوف آئے تھے۔ اس وقت میں گھر پر تنہا تھی۔ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور کرسی پر دراز ہو گئے۔ پھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"آپ کی رشتے دار اور میری داشتہ آنا فیودورونا بڑی گری ہوئی عورت ہے اُس نے آپ کی چچیری بہن "ساشا" کو اور آپ کو برباد کر دیا۔ اس کام کے بدلے انہوں نے مجھ سے بھاری رقم اینٹھی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس کمینے پن میں میرا دامن بھی پوری طرح داغ دار ہے کہ میں نے تم دونوں بہنوں کی غربت ولاچاری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے تمہارے حسن وشباب کو جی بھر کو لوٹا اور عیاشی کے مزے لئے مگر اب میں اپنے ضمیر کی آواز پر کم از کم تمہاری حد تک اپنے گناہوں کا تدارک اور تلافی کرنے کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔ میں آپ سے شادی کا خواستگار ہوں تا کہ آپ کی عزتِ گم گشتہ آپ کو پھر سے مل جائے۔ جہاں تک آپ کی بہن "ساشا" کا تعلق ہے اس کی ذمہ داری قبول کرنے سے میں اس لئے قاصر ہوں کہ وہ متعدد خوابگاہوں سے گذر کر مجھ تک پہنچی تھیں اور وہ آپ کی طرح منہ بند کلی نہیں تھیں۔ میں آپ کی زندگی میں پہلا مرد ہوں اور اسی لئے میں نے آپ کو شادی کا پیام دیا ہے۔ شادی کے بعد میں آپ کو یہاں سے ہزاروں میل دور جنوب کے اسٹیپی کے میدان میں لے جاؤں گا۔ وہاں آپ ایک جاگیردارنی کی حیثیت میں جاگیر کے کام کاج دیکھا کریں گی۔ اور میں بے فکر ہو کر شکار گاہوں میں خرگوشوں کا شکار کھیلا کروں گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پیٹرس برگ ایک گندہ شہر ہے اور وہ یہاں پھر کبھی نہیں آئیں گے۔ یہاں ان کا وارث ان کا نالائق بھتیجہ بھی رہتا ہے۔ جسے حق وراثت سے محروم کرنے کے لئے بھی وہ یہ شادی ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ آپ کے مجھ پر احسانات کا بدلہ چکانے کے

لئے وہ آپ کو پانچ سو روبل ادا کر دیں مگر میں نے انکار کر دیا۔

تو میرے عظیم محسن ! اب جو اطلاع میں آپ کو دینے جا رہی ہوں اُسے سن کر آپ کو یقیناً گہرا صدمہ پہنچے گا۔ وہ اطلاع یہ ہے کہ میں نے بیکوف کی شادی کی تجویز کو خدا کا فضل و کرم مان کر صمیم قلب سے منظور کر لیا ہے۔ اس شادی کی بدولت مجھے میری کھوئی عزت پھر سے حاصل ہو جائے گی۔ یہ شادی مجھے بربادی اور بے غیرتی کی زندگی سے محفوظ رکھے گی۔ مجھے ڈراؤنے مستقبل کے معاشی مسائل سے چھٹکارا نصیب ہو جائے گا مذورا بھی یہی کہتی کہ یہ سنہرا موقع ہاتھ سے مت نکلنے دینا۔ پھر اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ ہے بھی تو نہیں۔ بوڑھی اور بیمار مذورا کے سہارے زندگی کی گاڑی آخر کب تک ڈھکیلی جاتی رہے گی؟ ادھر میں خود بھی بیمار رہتی ہوں۔ اوّل تو گذارے لایق کام ملتا نہیں اور ملتا بھی ہے تو مجھ سے ہوتا نہیں۔ صحت جو ٹھیک نہیں۔ تو معاف کرنا میرے مخلص دوست! اس معاملے میں میں نے آپ سے مشورہ نہیں لیا بلکہ آپ کو اپنا ے آخری اور اٹل فیصلہ سنانے کی جرأت کی ہے جس پر میں تادم تحریر قائم ہوں۔ آپ مجھے میرا فیصلہ بدلنے کا مشورہ دیکر مجھے شرمندہ نہ کرنا۔ آپ کا مشورہ رد کرنے پر مجھے دلی صدمہ پہنچے گا۔ ہم لوگ شادی کے بندھن میں بندھ جانے کے بعد کل ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔ آپ کے لکھے سارے خطوط مذورا آپ کو واپس پہنچا دے گی۔ مزید خط و کتاب بے سود ہوگی اور شاید بیکوف بھی اسے پسند نہیں کریں گے۔ تو میرے دوست! مجھ سے ناراض مت ہونا اور ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا الوداع

تمہیں کبھی نہ بھلانے والی۔ وارنیکا

☆☆☆

۲۳ر ستمبر

میری پھول سے بچھڑی خوشبو !

تم کہتی ہو تو اب تمہیں کبھی خط نہیں لکھوں گا۔ نہ فیصلہ بدلنے پر زور دوں گا اور نہ یہ کہوں گا کہ تمہارے اس قدم سے مجھے صدمہ پہنچا ہے۔ کیسا غم کیا صدمہ مجھے تو خوشی ملی ہے۔ زمین سے آسمان تک اونچی خوشی۔ ایسی تھرکتی اور مچلتی خوشی جس سے میری چھاتی پھٹی جا رہی ہے۔ خوشی کی وجہ بھی تو خاصی معقول ہے کہ میری کانچ کی گڑیا کو ایک رکھوالا مل گیا ہے۔ مضبوط سہارا مل گیا ہے۔ اب پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے تمہیں بخار میں کام نہیں کرنا پڑے گا۔ جاگیردانی بن کر عیش و آرام کی زندگی گزارو گی۔ تم اپنی صحت کا خیال رکھنا اور ہمیشہ خوش رہنا۔ تمہارے بعد یہ کمرہ چھوڑ کر میں تمہارے مکان میں منتقل ہو جاؤں گا۔ اور مذورا کے ساتھ رہنا شروع کر دوں گا۔ مذورا کی موجودگی اور تمہارے مکان کا چپہ چپہ مجھے یقین دلاتا رہے گا کہ تم میرے آس پاس موجود ہو۔ اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو میں تمہیں اپنے خوابوں میں بُلا لیا کروں گا۔ تم سمجھتی ہو کہ تم مجھ سے ہزاروں میل دور چلی جاؤ گی مگر میں ایسا نہیں سمجھتا۔ تم تو مجھ میں میرے دل میں بسی ہوئی ہو تم سے مجھے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ تم میری تھیں میری ہو اور میری ہی رہو گی۔

تو الوداع میرے معصوم فرشتے

دیوشکن

بیرونی ممالک کے شاہکار افسانے

☆......مسز کیٹس شوپن (امریکہ)

☆......رفیق شاہین

المیے کا رازِ نہاں

رچارڈ کو جب یہ خبر ملی کہ اس کی بیوی جوسفن کا بہنوئی اور اس کا ساڑھو بر کلے میلارڈ ریل حادثے میں ہلاک ہو گیا ہے تو بلا تاخیر وہ اس اخبار کے دفتر جا پہنچا جس میں یہ افسوسناک خبر شائع ہوئی تھی۔ وہاں مرنے والوں کی فہرست میں بر کلے میلارڈ کا نام مندرج ہونے سے اس کی موت کی از خود تصدیق ہو گئی تھی پھر بھی اس المیے کی خبر کو مزید یقینی طور پر قبول کرنے کے لئے اس نے سرکاری سطح پر اطلاعی تار برقی کا انتظار ضروری سمجھا اور احباب کو بھی تاکید کردی کہ وہ یہ اطلاع ابھی مہلوک کے گھر نہ پہنچائیں۔ البتہ جب یہ خبر اس نے اپنی بیوی جوسفن کو سُنائی تو اس کا ردعمل اُس پر وہی ہوا جو ایسی بُری خبر سُن کر سبھی کا ہوتا ہے۔ جوسفن نے خود تو کسی طرح اس صدمے کو جھیل لیا تھا مگر وہ یہ سوچ کر بے حد پریشان ہو اُٹھی کہ اُس کی بہن لوئس میلارڈ جو عارضہ قلب میں مبتلا ہے اس کے لئے اس المناک خبر کو سہنا آسان نہ ہوگا۔ پھر بھی ایسی خبر کو کوئی کسی سے کب تک چھپا کر رکھ سکتا ہے۔ بجائے اس کے کہ دوسرے کے وسیلے سے یہ خبر اُس تک پہنچے، اُس نے یہی بہتر سمجھا کہ وہ اپنی بہن کو یہی بات خود ہی بتادے۔ لہٰذا اپنے شوہر رچارڈ کے ہمراہ وہ اپنی بہن کے گھر جا پہنچی اور پہلے تو اشاروں کنایوں میں اور پھر صاف الفاظ میں بھی بر کلے میلارڈ کی ہلاکت کی خبر اسے سناہی دی۔

خبر سُن کر لوئس نے نہ تو عام بیویوں کی طرح چیخ و پکار کی، نہ سینہ کوبی کی اور نہ ہی پچھاڑیں کھائیں۔ اُس نے حیرت زدہ ہو کر بہن اور بہنوئی کے چہروں پر باری باری نظر ڈالی اور پھر والہانہ طور پر اپنی ہمشیرہ کے شانے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔ دیر تک وہ یہی کرتی رہی پھر اچانک ہی دیوانہ وار تیزی سے زینے کی سیڑھیاں طے کر کے بالائی منزل پر واقع اپنے کمرے میں پہنچ کر اندر سے دروازہ مقفل کر دیا۔ وہاں دریچے کے سامنے لگی آرام کرسی میں دھنس کر اُس نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور دریچے کے اُس پار واقع ہرے بھرے وسیع میدان میں ایستادہ ان سرسبز درختوں کو دیکھنے لگی جن سے موسم بہار اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ ہوا میں بارش کی نمی اور عجیب سی مہک رچی بسی ہوئی تھی۔ سڑک پر کوئی پھیری والا خریداروں کو آوازیں لگا رہا۔ کسی گانے والے کی دور سے آتی آواز بھی اُسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ درختوں کی شاخوں احاطے کی منڈیروں اور چھجوں پر رنگ برنگی چڑیاں پُھدک پُھدک کر اور چہچہا کر فضا کو نغمہ بار کئے ہوئے تھیں۔ اور دور مغربی آسمان کی وسیع نیلی جھیل میں سفید بادلوں کے چھوٹے چھوٹے لاتعداد ٹکڑے سفید پوش ہنسوں کی طرح تیرتے نظر آرہے تھے۔

وہ کرسی کی گدگدی پشت پر سَر لگائے بے حس و حرکت اور مہر بہ لب بیٹھی آسمان پر نگاہ مرکوز کئے ہوئے تھی۔ البتہ کبھی کبھی لمبا سانس آکر اس کے جسم کو مرتعش کر دیتا تھا اور پھر پہلے کی ہی طرح اس کا

بدن ساکت و صامت ہو جاتا تھا۔ وہ ایک گوری چٹھی اور موتی جیسے دمکتے رنگ روپ کی ایک ایسی پُرشباب حسینہ تھی جس کی قمروش پیشانی پر پڑے بل بذات خود اس کے آہنی اعصاب اور مضبوط و محکم قوت ارادی کے آئینہ دار تھے۔ وہ ہنس نما بادلوں کے قافلے کو آسمان پر تیرتے ہوئے ٹکٹکی باندھے دیکھے جارہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے رنگ و بو میں لپٹی کوئی غیر مرئی سی شئے نادیدہ طور اس کے وجود میں حلول کئے جارہی تھی۔ وہ گھبرا اُٹھی۔ اُس نے اپنی آہنی قوت ارادی کو کام میں لاکر ہر چند مغموم سے آسیبی سائے کی گرفت سے رہائی کے لئے بہت ہاتھ پیر مارے مگر جب کامیابی نصیب نہ ہوئی تو خود سپردگی اختیار کرتے ہوئے خود کو حالات کے بہتے دھارے پر چھوڑ دیا۔

اُسے اپنے ادھ کھلے ہونٹوں کی لرزش میں مضمر عجیب سا پیغام اپنی روح کے خاموش نہاں خانے میں گونجتا سنائی دے رہا تھا اور اس پیغام کو مشتہر کرنے والے وہ الفاظ تھے۔

''آزادی...... آزادی...... مکمل آزادی...... اور نئی زندگی۔'' کچھ دیر پہلے کے خوف و اضطراب پر اب پُرخمار سے جذبات و احساسات کی جمالیاتی اور وجدانی سی کیفیت غالب آچکی تھی۔ اُسے اپنی رگ و پے میں بڑی راحت بخش سُستی سی محسوس ہورہی تھی۔

''مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔'' اُس نے سوچا۔

رونا تو مجھے پھر بھی پڑے گا جب میں اس کے ہمدرد و مددگار اور کرم فرما ہاتھوں کو مُردہ حالت میں اس کے سینے پر بے حس و حرکت حالت میں دیکھوں گی۔''

رونا تو مجھے پھر بھی پڑے گا۔ جب میں وہ چہرا دیکھوں گی جو مجھے دیکھتے ہی کنول کی طرح کھل اُٹھتا تھا۔

رونا تو مجھے پڑے گا ہی جب میں اُن بند آنکھوں کو دیکھوں گی جو مجھے دیکھتے ہی چراغوں کی طرح روشن ہو جاتی تھیں۔''

رونا تو مجھے پڑے گا ہی جب میں اُسے گھر کی دہلیز سے باہر جاتا ہوا دیکھوں گی، کبھی نہ واپس آنے کے لئے۔''

مگر اگلے ہی لمحے اُس کی سوچ کا رُخ دوسری سمت میں مڑ گیا۔ اور ایکا ایکی اُسے آنے والے ماہ وسال کے مُسکراتے دنوں کا وہ عظیم الشان جلوس بھی نظر آ گیا جو بڑی گرم جوشی سے خوشی خوشی اسی کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ اُس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اُس کے ہمزاد نے جلوس والوں کے پرجوش استقبال کے لئے ہوا میں اپنی باہیں پھیلا دی تھیں۔ اور اُس کی یہ سوچ اس کی روح کی آواز بن گئی۔ کہ اب وہ دوسروں کے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے جئے گی۔ اپنی مرضی کی زندگی جئے گی اور اب وہ زیادتی اور جبر بھی۔ اس کی انفرادی زندگی میں خلل انداز نہ ہو سکے گا جو ازدواجی زندگی میں میاں بیوی ایک دوسرے پر تھوپا کرتے ہیں اس عجیب سی آزادانہ یا مجرمانہ انداز کی سوچ کے سنگین لمحے میں اس کے ضمیر نے اس پر سوال داغ دیا۔

''مسز میلارڈ! کیا تم نے اپنے شوہر سے واقعی محبت کی تھی۔؟''

اس کا جواب اُس کے ہمزاد نے یہ دیا۔

''کبھی کی تھی اور کبھی نہیں بھی کی تھی۔''

"مگر ماضی کی ان باتوں سے کیا لینا دینا۔" اُس نے سوچا۔

"سوال تو حال کا ہے، مستقبل کا ہے، آنے والی زندگی کا ہے۔"

وہ خود تو خاموش ہی تھی مگر ایک عجیب سی بے خودی کے عالم میں اس کے ہونٹوں پر خود بخود اُبھر آنے والے الفاظ اپنے آپ کو دہرائے جا رہے تھے اور وہ الفاظ یہ تھے۔

"آزادی......جسم کی آزادی......روح کی آزادی......اختیار کی آزادی۔"

☆☆☆

جوسفن نے کی ہول سے جھانکتے ہوئے کہا۔

"لوئس تمہارا کمرے میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ تنہائی میں بہن تم بیمار ہو جاؤ گی۔ لوئس پلیز ! دروازہ کھول کر باہر آ جاؤ۔"

"نہیں میں بیمار نہیں پڑوں گی۔ مجھے یہیں رہنے دو۔"

وہ بیمار تھی ہی کہاں۔ اسے تو اپنے اوپر مکمل قابو حاصل تھا۔ اُس نے ایسا کچھ نہیں کیا جس سے اس کی حالت بگڑ جاتی۔ اس کے برعکس وہ تو دریچے کے اُس پار کی بہار آفریں اور رنگین فضا سے زندگی کی حرارت کشید کرتی رہی تھی۔ اُسے تو آنے والے خوشگوار دنوں کی آہٹ ابھی سے صاف سنائی دے رہی تھی۔ موسم بہار کے مدھر نغمے گانے والے مست طیور کی روح افزا موسیقی کے شیریں زیر و بم کو اس کی سماعت ابھی سے محسوس کر رہی تھی۔ شروع میں ضرور اُسے ایسا لگا تھا جیسے وہ مایوسی کے بھنور میں پھنس گئی تھی مگر اب تو غم کے بادل آپ ہی آپ چھٹ گئے تھے اور دل ہی دل میں اُس نے لمبی عمر جینے کی آرزو کو دُعا کا پیکر بھی عطا کر دیا تھا۔

☆☆☆

بہن جوسفن کے مسلسل اصرار پر بالآخر اُس نے ہتھیار ڈال ہی دیے۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور دروازہ کھول دیا۔ بری طرح ڈگمگاتی کشتی کے ایکا ایکی پُرسکون ہو جانے پر اب وہ خود بھی پُرسکون ہو گئی تھی اور اُس کے چہرے پر کامرانی کی چمک دمک صاف نظر آ رہی تھی۔

دونوں بہنیں ایک دوسرے کی کمر میں باہیں حمائل کئے تیزی سے سیڑھیوں سے ہو کر نیچے اترنے لگیں۔ اور پھر جیسے ہی انہوں نے گراؤنڈ فلور کے صحن میں قدم رکھا ناگاہ ہی ایک دلدوز چیخ کے ساتھ لوئس فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ رچارڈ اور جوسفن نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ان کے منہ سے بھی چیخیں نکلنے سے رہ گئیں۔ سامنے برکلے میلارڈ کھڑا تھا۔ زندہ و سلامت۔ اُسے تو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ ریلوے میں کوئی ٹرین حادثہ ہوا تھا۔

لیک کر وہ بھی رچارڈ اور جوسفن کی طرح زمین پر بے سُدھ پڑی لوئس کی خبر گیری میں شامل ہو گیا۔

ڈاکٹر آ گیا تھا۔ اُس نے رسمی سی جانچ کے بعد لوئس کو مردہ قرار دے دیا۔ پھر استفسار کرنے پر اُس نے یہ بھی بتایا کہ موت کا سبب۔

سیویر ہارٹ اٹیک تھا۔ مگر ہارٹ اٹیک کی وجہ کیا تھی؟

یہ بات تو مرنے والی ہی بتا سکتی تھی۔

☆......جیک لندن

☆......رفیق شاہین

(امریکی لرزہ خیز کہانی)

سفر موت کا قدم قدم

سفر اور سفر اور سفر، سینکڑوں اور ہزاروں میل کا سفر، مہینوں اور سالوں کا سفر جان لیوا صعوبتوں اور پُر خطر راستوں کا سفر "سُبینکو" کا مقدر بن چکا تھا جو روسی امریکہ کے اس دور اُفتادہ اور ویران خطے میں اپنے اختتام کو پہنچنے والا تھا۔

ناہموار اور برفپوش زمین پر سُبینکو بڑی بے کسی و بے بسی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ اُس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ اُس ہولناک اور سوہان روح تشدّد کے تصور سے بُری طرح لرزیدہ اور سہا ہوا تھا جو آسمانی قہر کی طرح اُس پر اب ٹوٹنے ہی والا تھا۔ اُس کے سامنے اُس کا قوی اُلجثہ قزاقستانی ساتھی میخوں کے ساتھ زمین میں گاڑھا جا چکا تھا اور اب وہ نا قابل برداشت اذیت سے تڑپنے سے بھی محروم تھا۔ اس کے حلق سے نکلی جانوروں جیسی غیر انسانی دلدوز اور پُر درد آوازیں اور چیخیں سُبینکو کی رگوں میں لہو منجمد کئے دے رہی تھیں۔ جب جان بچنے کے امکانات معدوم ہو جائیں اور موت ناگزیر ہو تو بزدل سے بزدل انسان میں بھی موت سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے جبکہ سُبینکو نے تو سفر ہی موت کی راہوں پر چل کے طے کیا تھا۔ موت اب اُس کے لئے بے معنی شے ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اب اگر موت سے خوفزدہ تھا تو محض متشدّد طرز کی دردناک موت سے تھا اور تشدّد کے عذاب سے بھی بڑا عذاب تھا اجنبی دشمنوں اور شقی اُلقلب جلادوں کے پاؤں پڑنا اُن سے رحم کی بھیک مانگنا، رونا، گڑگڑانا، فریاد کرنا اور پھر بھی اُسی انجام کو پہنچنا جس انجام کو اس کے سارے ساتھی پہنچ چکے تھے۔ بے چارہ ایوانوف تو ابھی تک تترائی حالت میں ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ کتنا عجیب لگتا ہے موت سے قبل اذیتیں جھیلتے وقت مینڈکوں کی طرح پُھدکنا، سانپ کی طرح بل کھانا، کتوں، بلّیوں، بھیڑیوں، لنگوروں اور بندروں کی سی آوازیں منہ سے نکالنا۔ انسان سے جانور بننا اور پھر مرنا۔ اُف! یہ سب کتنا مہیب ہے کتنا ہولناک۔!

سُبینکو کے مقدر میں سفر تو اُسی وقت لکھ دیا گیا تھا جب پولینڈ میں اُس نے آزادی کا پہلا خواب دیکھا تھا۔ تبھی سے قسمت اُسے کہاں کہاں نہ لئے پھری کبھی "وارسا" کبھی "پیٹرس برگ" کبھی "سائبیریا" کی معدنیات کی کھدانوں میں تو کبھی بحرِ منجمد شمالی کی برفپوش بندرگاہ "کمچا تکا" میں تو کبھی چمڑی چور بحری قزاقوں کے خستہ حال جہازوں میں اور اب قسمت اُسے یہاں لے آئی تھی۔ شاید تخلیق کائنات کے وقت ہی دنیا کے بنانے والے خالق دوجہاں نے یہ ویران خطہ اس کی تقدیر کے ساتھ ہی نتھی کر دیا تھا۔ اُسے قسمت کا کھیل نہیں تو اور کیا کہا جائے کہ وہی "سبینکو" جو مصور اور شاعر تھا۔ نازک مزاج اور حساس تھا۔ لطیف جمالیاتی احساسات کی جنت میں شگفتہ و شاداب رہنے والا وہی سُبینکو اب دنیا کی

آخری سرحد پر چیختی چنگھاڑتی وحشت و بربریت کے شکنجے میں پھنس کر ایک ہولناک اور اذیتناک موت مرنے جا رہا تھا۔

اُس کا ساتھی ایوانوف بڑے آہنی اعصاب کا انسان تھا۔ احساس نام کی کوئی شئے اس میں تھی ہی نہیں اور اگر تھی بھی تو اُس کے اندر کے کسی گوشے میں روپوش تھی۔ تشدد پسند وحشی بھی کم تجربے کار نہ تھے انہوں نے وہ شئے ڈھونڈھ کر اُس کے اندر سے باہر نکال ہی لی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایوانوف جس کے لئے بڑی سے بڑی جسمانی تکلیف برائے نام ہوا کرتی تھی اب وہی ایوانوف جانوروں جیسی عجیب عجیب آوازوں میں چیخ و پکار مچائے ہوئے تھا۔

ایوانوف کی غیر فطری اذیتناک چیخیں سُپینکو کے اعصاب پر بُری طرح اثر انداز ہو رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا وہ ضرور پاگل ہو جائے گا۔

''یہ ایوانوف مر کیوں نہیں جاتا۔'' اس نے سوچا۔ لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہ تھا کیونکہ اُس کے ختم ہوتے ہی وہ لوگ سُپینکو کو نمبر پر لے لیتے۔ ''پکا گا'' کا اُس پر پہلے ہی دانت تھا۔ وہ بُغض و عناد کی نظریں اس پر مرتکز کئے بڑے بامعنی انداز میں زہریلی مُسکراہٹیں بکھیر رہا تھا۔ سُپینکو نے پچھلے ہی ہفتے اُسے ''نلیٹو'' کے قلعے سے کھدیڑ دیا تھا اور کتّے والی چابک اتنے زور سے اس کے چہرے پر ماری تھی کہ اُس کے چہرے پر لال رنگ کی ایک موٹی سے لکیر اُبھر آئی جس سے خون رِس رہا تھا۔ ظاہر ہے سُپینکو سے انتقام کی آگ میں وہ بُری طرح جھلس رہا تھا۔ اُس نے اپنے...... ذہن میں اذیت کوشی کے نت نئے طریقے اختراع کر رکھے تھے جنہیں وہ سُپینکو پر آزمانے کے لئے بے قرار تھا۔

نزدیکی قہر و عذاب کے ہولناک اور جان لیوا تصور سے بچنے کے لئے اُس نے اپنے ذہن کا رُخ دوسری جانب موڑ دیا۔ اب اُس کی آنکھوں میں اُس کے والدین کا عکس تھرکنے لگا۔ اُسے لہریئے دار بالوں والا گھوڑے کا بچّہ دکھائی دیا وہ فرانسیسی اطالیق نظر آیا جس نے اُسے شہرہ آفاق شاعر ''والٹیئر'' کا شعری مجموعہ پڑھنے کے لئے دیا تھا۔ ایک بار پھر اُس کی نگاہوں میں پیرس، لندن، ویانا اور روم کے منظر گھوم گئے۔ اسے زندہ دل نوجوانوں کا وہ ہجوم نظر آنے لگا جس نے پولینڈ کی آزادی کے سہانے خواب دیکھے تھے اور اُن میں وہ خود بھی شامل تھا۔ بس یہیں سے شروع ہو گیا سفر۔ ایک طویل اور ختم نہ ہونے والا اکتاہٹ آمیز سفر۔ اُس کے دو ساتھیوں کو پیٹرزبرگ میں پھانسی دیدی گئی۔ ایک جلاد جیلر کے بھیانک تشدّد کی تاب نہ لا کر بے موت مر گیا۔ پھر جلاوطنی کی سزا بھگتنے کے لئے سائبیریا کا طولانی سفر شروع ہو گیا۔ یہ انسانی لہو سے رنگین اور طویل شاہراہیں نجانے کتنی انسانی ہلاکتوں کا راز اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں۔ اس مہینوں لمبی سڑک پر گذرنے والے قیدیوں کو نجانے کتنی بار قزاقستانی محافظ دستے کے جوانوں نے زدوکوب اور مجروح کیا۔ اُن مجروحین میں سے جو زخموں کی تاب نہ لا کر مر جاتے تھے انہیں وہیں سڑک کے اطراف کی برفپوش کھائیوں میں ڈھکیل دیا جاتا تھا۔ یہ کھلی جارحیت تھی، وحشت و بربریت تھی، درندگی تھی۔ جبریت، ظلم تھا، وہاں معدنیات کی کھدانوں کے یخ زدہ تاریک تہہ خانوں میں سُپینکو کے بہت سے ساتھی نمونیہ کا شکار ہو کر لقمہ اجل بن گئے تھے۔ اُس کے کچھ ساتھیوں نے فرار ہونے کی بھی کوشش کی جو کامیاب نہ ہو سکی اور اس کے کئی ساتھی اس کوشش میں محافظوں کی گولیوں کا نشانہ بن

گئے۔ان بدنصیبوں میں اکیلا سُینکو ہی کسی نہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔ جو محافظ دستے کے سپاہیوں کی نظروں سے بچتا بچاتا ''کمچا تکا'' کے بر فیلے بندگاہ پہنچ گیا تھا۔اس دوران اپنی جان بچانے کی خاطر اُسے ایک انسانی قتل کا مرتکب بھی ہونا پڑا۔اس نے ایک مسافر کو قتل کر کے اس کے پاسپورٹ اور نقدی پر قبضہ جمالیا تھا۔ ''کمچا تکا'' کے پیچھے ہزاروں سال لمبی شاہراہیں سائبیریا اور سارے روس میں پھیلی ہوئی تھیں جن سے بچ کر نکل جانا کسی طور بھی ممکن نہ تھا۔اب جنوب میں جانے کا مطلب ہوتا پھر سے کسی کھان کے مقبرے میں زندہ دفن ہو جاتا۔ بچ نکلنے کا اب واحد راستہ بحر منجمد شمالی ہی تھا جہاں سے ''ایلاسکا'' کا رخ اختیار کیا جا سکتا تھا۔مگر آگے کا راستہ بھی خالص وحشت و بربریت اور جبر و استبداد کا راستہ تھا۔بحری لٹیرے بھی ایک طرح سے وحشی جانور ہی تھے جو دور دراز آباد انسانی بستیوں کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا کر دیتے تھے۔گاؤں کے گاؤں قتل گاہوں میں تبدیل کر دیتے تھے اور عورتوں کی سال بھر اکٹھی کی ہوئی جانوروں کی کھالیں لوٹ کر اپنے جہازوں پر لادنا کبھی نہیں بھولتے تھے۔کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ بستی والے ان پر حملہ آور ہو کر چمڑی چوروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا کرتے تھے۔دوران سفر سمندر میں ان کی مڈبھیڑ کمپنی کے جہازوں سے بھی ہو جایا کرتی تھی۔جس میں عام طور پر یہ بحری قزاق مارے جاتے تھے۔ ان لٹیروں کے جہاز بھی سڑے گلے اور بڑی خستہ حالت میں ہوتے تھے۔ان جہازوں میں کھانے پینے کا سامان کبھی ہوتا تھا اور کبھی نہیں۔یہ بھوک فاقوں اور موسموں کی بے رحمی کے شکار بھی ہوتے رہتے تھے۔

سُینکو نے ان بحری قزاقوں کے ساتھ ''کمچا تکا'' سے تین بار مشرق کا سفر کیا اور تینوں بار موسم کی ستم رانیوں سے مجبور ہو کر جہاز کو واپس لوٹ کر ''کمچا تکا'' میں پناہ لینی پڑی۔ سُینکو کو سخت مایوسی ہوئی۔ دوبارہ گرفتاری کے خطرے سے محفوظ ہونے کے لئے یہاں سے جلد از جلد نکل جانا بے حد ضروری تھا لہٰذا چوتھی بار وہ پھر مشرق کے رُخ پر جانے والے جہاز پر سوار ہو گیا۔ یہ جہاز بھی بحری قزاقوں کا ہی تھا۔آگے کافی مال غنیمت ہاتھ لگنے پر جب چمڑی چوروں نے واپس ''کمچا تکا'' جانے کا اعلان کیا تو سینکو وہیں ایک ویران جزیرے پر اُتر گیا تا کہ دوسرے کسی جہاز سے وہ آگے کا سفر جاری رکھ سکے۔دوسرے جہاز کی آمد کا اُسے زیادہ وقت انتظار نہیں کرنا پڑا۔اب وہ جس جہاز پر سوار ہوا تھا اُس میں ''سلوانیا'' کے شکاری، روسی مہم جو، منگول، تاتار اور ایورگینز سوار تھے۔ یہ سب بھی سفاک قسم کے چمڑی چور تھے جو لوٹ کے بعد بستیاں کی بستیاں تباہ و برباد کر دیا کر دیتے تھے۔ان لوگوں نے اپنے اس بحری سفر میں قتل و غارتگری لوٹ مار اور زنا بالجبر کے سارے رکارڈ توڑ دیئے تھے۔انہوں نے راستے میں آنے والے نجانے کتنے گاؤں اور بستیوں کو لاشوں کے قبرستان میں بدل دیا تھا ساتھ ہی وہ لوگ ہرنوں اور بلاؤں، گیدڑوں، خرگوشوں، لومڑیوں اور بھیڑوں کی کھالیں لوٹ کر اپنے جہاز پر منتقل کرتے رہے تھے۔ وہاں سے آگے چل کر یہ جہاز کمپنی کے جہازوں کے نشانے کی زد پر آ گیا۔اس مڈبھیڑ میں جہاز کے سبھی چمڑی چوروں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دیا گیا۔ اس تباہ شدہ جہاز میں صرف دو افراد ہی اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو سکے۔ان میں ایک تو سینکو تھا اور دوسرا فن لینڈ کا باشندہ۔ان دونوں نے پورا موسم سرما ایک ''ایلیوشن'' نامی ویران اور غیر آباد جزیرے پر فاقہ زدگی کے عالم میں محض گھاس پھوس کھا کر گذار دیا۔موسم بہار آ چکا تھا۔اب یہاں سے نکلنے کے لئے جروی کے جہاز کے ادھر سے ہو کر گزرنے کی توقع بمشکل ایک

فیصدی تھی۔ جو قسمت سے جہاز مل جانے پر پوری ہوگئی۔

اس سمندری سفر کے دوران سینکو نے ابتک نجانے کتنے جہاز بدل دیئے تھے۔ جب بھی جہاز واپسی کا اعلان کرتے وہ جہاز سے جہاں بھی زمین ملتی اُتر جاتا کیونکہ واپسی کا راستہ جنوب میں سیدھا سائبیریا کی طرف جانکلتا تھا جہاں اس کے لئے قید و بند کی صعوبتوں اور دردناک موت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اُسے بار بار نئے نئے جہازوں پر سوار ہونا پڑتا تھا تا کہ وہ اپنی منزل مقصود کی جانب مسلسل آگے بڑھتا رہے۔ کبھی جہاز بحری قزاقوں اور چمڑی چوروں سے بھرے ہوتے تھے۔ سفر کے دوران سینکو کو وحشت و بربریت اور انسان درندگی کے انسانیت سوز ایسے نجانے کتنے خونی منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنے پڑے جن کے تصور سے بھی اُس کی روح لرز لرز اُٹھتی تھی۔

خدا خدا کر کے سینکو کو اب وہ جہاز مل گیا جسے ''ایلاسکا'' کے ساحل پر لنگر انداز ہوتا تھا۔ جہاز اپنی سمت مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ راستے میں جنگجو قبیلے والوں اور جنگلی وحشیوں کے جگہ جگہ ان پر قاتلانہ حملے بھی ہوئے۔ نیز جزیروں کے ساحل اور بلند چٹانوں کے دامن میں جہاز کو لنگر انداز کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ادھر موسمی طوفانوں کا قہر بھی ان کے جہاز کے اوپر برف کا مقبرہ تعمیر کر سکتا تھا۔ خود سمندر میں ادھر سے ادھر بہنے والے سیکڑوں فٹ لمبے گلیشیرؤں کے لئے جہاز کو نیست و نابود کر دینا ذرا بھی مشکل نہ تھا۔ علاوہ ازیں اطراف و اکناف میں آباد وحشی جنگجوؤں کی آبادیاں بھی جان لیوا ثابت ہو سکتی تھیں مگر ان سب سے بے نیاز جہاز اپنے راستے پر مسلسل رواں دواں تھا۔ سینکو کے خیال کے مطابق اسے ''ایلاسکا'' کے ساحل پر ''میکسیکو'' کے مہم جوؤں کا جہاز مل جانا چاہیئے تھا جہاں سے سال دو سال کے عرصے میں اس کا وطن پہنچ جانا کوئی مشکل نہ تھا۔ طویل اکتاہٹ آمیز اور تھکا دینے والے سفر کے بعد جب جہاز ''ایلاسکا'' کے ساحل سے چند ہی میل کے فاصلے پر تھا کہ ناگاہ ''ڈینی رینی'' نامی جنگجو وحشی قبائل نے گھات لگا کر اس پر منظم حملہ بول دیا۔ چند ہی منٹ میں وحشیوں نے جہاز پر سوار مسافروں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ جہاز کے کپتان نے سوجھ بوجھ سے کام لیکر جہاز کو واپسی کے لئے موڑ دیا۔ اب جہاز کو واپسی کے راستے جاتا دیکھ کر انہوں نے جہاز کے کپتان اور سینکو کو تختہ مشق ستم بنانا ضروری نہ سمجھا۔

سمندر میں ادھر سے ادھر بھٹکتے ہوئے برسوں گزر گئے۔ سینکو نے اب جہاز کے کپتان ''بیتنکوف'' کی ماتحتی اختیار کر لی تھی۔ اس نے دو سال ''کسکوکوِم'' نامی ایک جزیزے میں گزار دیئے۔ پھر جون سے جون یعنی پورے ایک سال کے بحری سفر کے بعد وہ ''کورٹ ریبو ساؤنڈ'' پہنچ گئے۔ یہ ایک تجارتی مرکز تھا جہاں Barter System لاگو تھا یعنی اشیاء کا تبادلہ اشیاء سے کیا جاتا تھا۔ انھوں نے وہاں رک کر کھالوں کے بدلے میں ضروریات زندگی کا سامان حاصل کیا اور جہاز کو آگے بڑھا دیا۔ آگے چل کر اُنہیں ایک ''یوکون'' نامی ایک ندی بہتی نظر آئی جو آگے جا کر ''کومک پیک'' نامی وسیع دریا میں مدغم ہو جاتی تھی۔ اس دریا کا پاٹ کہیں کہیں دس میل تک پھیلا ہوا تھا۔ اس دریا میں ایک سال تک سفر کرنے کے بعد سینکو ''مائیکلو وسکی'' پہنچ گیا آگے چل کر ''بتینکوف ملوف'' نے ''نلیٹو'' پر سفر موقوف کر دیا کیونکہ موسم سرما کی آمد آمد تھی چنانچہ آگے کے سفر کے لئے یہاں رک کر موسم گرما کا انتظار ضروری تھا۔ بات معقول تھی اس لئے سینکو کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوا۔

موسم سرما شکار کے لئے بہترین موسم مانا جاتا ہے۔نلیٹو کے باشندے لگاتار شکار میں مصروف تھے۔وہ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے تھے۔ان کے مکانات اور جھونپڑیاں جھگیاں جانوروں کی کھالوں سے پٹی پڑی تھیں۔موقع غنیمت جان کر ملکوف اور اس کے تمام ساتھیوں نے مقامی آبادی نلیٹو پر حملہ کر دیا۔مال غنیمت اکٹھا کیا جانے لگا۔جس نے ذرا بھی مزاحمت کی اسے فوراً ہی تہہ تیغ کر دیا گیا۔عورتوں کو یرغمال بنا کر کھلے میں ان کی اجتماعی طور پر آبرو ریزی کی گئی۔ہر طرف ہو ہو اور ہاہا کار مچی تھی کہ ناگاہ مقامی باشندوں نے منظم ہو کر ان پر جوابی حملے بول دیا۔تھوڑی ہی دیر میں نقشہ پلٹ چکا تھا۔نلیٹو کا قلعہ جس پر ملکوف کے آدمیوں نے قبضہ جما رکھا تھا اور جہاں لوٹ کا ذخیرہ بھرا پڑا تھا نذر آتش ہو چکا تھا ملکوف کے گروہ کے آدھے ساتھی قتل ہو چکے تھے اور بقیہ آدھے بچے قید کر لئے گئے تھے اُنہیں طرح طرح کے تشدد اور ایذا رسانیوں کے مراحل سے گذار کر فنا کے گھاٹ اتار دیا جا چکا تھا۔اب چمڑی چوروں کے اس گروہ میں صرف دو افراد ہی زندہ بچے تھے۔اُن میں ایک سینکو تھا اور دوسرا ابوانوف۔ جہاں تک ایوانوف کا تعلق ہے وہ تو اب موت کی آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ایک طرح سے اب سینکو ہی باقی بچا تھا جسے اپنی موت صاف صاف نظر آ رہی تھی۔

''یکاگا'' اسے اس طرح گھور رہا تھا جیسے وہ اُسے کچا ہی چبا جائے گا اس کے لبوں پر زہر خند مسکراہٹ رنگ رہی تھی۔ سینکو کی چابک سے اُس کے چہرے کی ادھڑی کھال کا روشن نشان نمایاں طور پر چمک رہا تھا۔اب صورتحال کچھ اور ہی تھی۔''یکاگا'' اقتدار میں تھا اور سینکو کو زندگی اس کے رحم و کرم کی محتاج تھی۔اُس کے رحم و کرم کی شکل کیا ہوگی؟ سینکو اس سے بخوبی واقف تھا۔موت کا وقت نزدیک آ چکا تھا روٹھ کر جانے والی زندگی کے قدم سینکو روک لینا چاہتا تھا۔زندگی سے بچھڑتے وقت اسے زندگی پر پیار آنے لگا تھا۔اُس نے سوچا کیوں نہ دشمن سردار ''مکامک'' سے وہ معافی طلب کرے لیکن فوراً ہی اُسے یقین ہو گیا کہ معافی کی درخواست قبول نہیں کی جائے گی۔مایوس ہو جانے کے باوجود بھی اُس نے سوچنا ترک نہیں کیا۔سوچ کی کسی منزل پر پہنچ کر اُس نے ایک ترجمہ نگار کے ذریعے دشمن سردار ''مکامک'' کو پیغام دیا کہ وہ کچھ'' کچھ کہنا چاہتا ہے۔مکامک نے اُسے استفہامیہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو۔؟''

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں مرنا نہیں چاہتا ہوں۔''سینکو نے کہا۔

''میں ایک غیر معمولی انسان ہوں۔میری موت آسان نہیں ہے۔میرے پاس ایک حیرت انگیز دوا ہے جو میں نے ہی ایجاد کی ہے۔اسے صرف میں ہی تیار کر سکتا ہوں۔یہ بڑی حیرت انگیز اور کرشمہ ساز بیش قیمتی دوا ہے۔میں اس دوا کے بدلے میں تم سے اپنی جان بخشی کا طالب ہوں۔''

''کیسی دوا۔؟'' مکامک نے پوچھا۔''یہ کس مرض کی دوا ہے۔؟''

''ابھی بتاتا ہوں۔''سینکو نے کہا۔

''دوا کی اہم خوبی اور اس کی تاثیر یہ ہے کہ اگر اسے گردن پر ملا جائے تو گردن کی کھال اس قدر سخت ہو جاتی ہے کہ اس پر تیز دھار کا ہتھیار موتھرا اور بے اثر ہو جاتا ہے۔اس پر تیز دھار چاقو کام نہیں کرتا۔اور گردن پر خراش تک نہیں آتی۔بولو اس جادوئی دوا کے بدلے میں تم مجھے کیا دے سکتے ہو۔؟''

''تو پہلے تم پشت پر بندھے میرے ہاتھ کھلواؤ۔ تبھی میں تم سے ڈھنگ سے بات کروں گا۔''
مکا مک نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور اُس کے ساتھ ہی اُس کے بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیئے گئے۔ سینکو نے سگریٹ رول کر کے سُلگائی اور دم لگانے لگا۔
مگر یہ بے وقوفی کی بات ہے۔'' مکا مک نے کہا۔ ''میرے لئے اس پر یقین کرنا مشکل ہے۔'' دنیا میں آج تک کوئی دوا ایسی ایجاد نہیں ہوئی ہے جو دھار دار ہتھیار پر غالب آ سکے۔ دھار دار ہتھیار کو ہر قسم کی دوا پر فوقیت حاصل ہے۔''
سردار پس و پیش میں مبتلا تھا۔ وہ جانتا تھا ان چمڑی چوروں کے پاس عام طور سے دواؤں کے بڑے بڑے کارگر اور نادر نسخے موجود ہوتے ہیں۔ ان کی بعض دوائیں اچوک اور تیر بہدف ثابت ہوتی ہیں۔ وہ سینکو کی بات کو پوری طرح مسترد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بہر کیف اُس نے فیصلہ کن انداز میں بآواز بلند کہا۔
''ٹھیک ہے مجھے تمہاری جان بخشی اور آزادی دونوں ہی منظور ہیں۔''
''مگر مجھے منظور نہیں ہے۔'' سینکو نے بڑی لاپروائی سے کہا۔
''اس کے بدلے میں مجھے اور بھی کچھ چاہیئے۔ میری دوا بہت قیمتی ہے۔ میرا یہ بھی مطالبہ ہے کہ مجھے برف پر پھسل کر چلنے والی گاڑی کھینچنے طاقتور کتے اور چھ عدد شکاری بھی دیئے جائیں جو میرے ساحلی سفر میں میری حفاظت پر تعینات رہیں گے۔''
''ضرور دیئے جائیں گے مگر اس سے پہلے تمہیں اپنی دوا کی عملی حیثیت ہم پر ثابت کرنی ہوگی۔''
مکا مک کی بات پر سینکو نے کندھے اچکا کے اور لاپروائی سے دھوئیں کے مرغولے کہر آلود فضا میں اُچھالنے شروع کر دیئے۔ اسی دوران مکا مک کی نظر اچانک ہی سینکو کی گردن پر مرکوز ہو گئی جہاں چاقو کی دھار کا نشان بنا ہوا تھا۔ یہ نشان کچا تکا میں ایک وحشی کے چاقو نے اس کے گلے پر ثبت کر دیا تھا۔
مکا مک نے مشتبہ ہو کر فوراً ہی کہا۔
''تمہارے گلے پر چاقو کا یہ نشان اپنے آپ میں ایک نمایاں ثبوت ہے کہ تمہاری دوا ایک ڈھکوسلہ ہے۔ دھار دار لوہے کے سامنے ہر دوا بے معنی ہو جاتی ہے۔ تمہاری دوا کمزور تھی جو چاقو کی دھار کا مقابلہ نہ کر سکی تھی تمہیں زخم آیا ہے۔''
''وجہ یہ نہیں جو تم نے بیان کی ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ جس شخص نے مجھ پر چاقو کا وار کیا تھا وہ تم سے اور تمہارے تمام طاقتور شکاریوں سے بھی زیادہ طاقتور جوان تھا اور دوا بھی کچھ کمزور تھی۔ کیونکہ دواسازی کے لئے جو جڑی بوٹیاں لازمی ہوتی ہیں اُن میں سے کچھ اس خطے میں نایاب تھیں جبکہ اس خطے میں ان کی بہتات ہے۔ اب جو دوا یہاں تیار کی جائے گی وہ اپنے آپ میں ہر طرح سے مکمل اور زود اثر ثابت ہوگی۔''
''ٹھیک ہے تو پھر۔'' مکا مک کی گونجدار آواز میں جوش و خروش تھا۔
''ساحلی راستے سے ہمیں تمہاری رخصتی منظور ہے۔ ہم تمہیں گاڑی کتے اور چھ شکاری ضرور دیں گے۔''

''مگر تم نے منظوری میں دیر کر دی۔ فیصلہ لینے میں وقت لینا۔ یہ میری دوا کی توہین ہے۔ اب تمہیں اس کا معاوضہ بھی چکانا ہوگا۔ اب میں کچھ اور بھی مانگوں گا۔ اب تم مجھے اود بلاؤ کی سو کھالیں اور سو پونڈ سوکھی مچھلیاں بھی دو گے۔''

مچھلیاں سستی تھیں اور ان کی یہاں بہتات تھی چنانچہ مکا مک نے اثباتی انداز میں فوراً ہی سر ہلا کر اس کی یہ شرط بھی قبول کر لی۔ سینکو نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''اور گاڑیاں ایک نہیں دو ہوں گی۔ ایک پر مچھلیاں اور کھالیں لادی جائیں گی اور دوسری میرے استعمال کے لئے ہوگی اس کے ساتھ میری رائفل بھی مجھے واپس کی جائے گی۔ اور یاد رکھو شرط منظور کرنے میں اگر اس بار بھی تاخیر سے کام لیا گیا تو پرانی سبھی شرطیں منسوخ ہو جائیں گی۔ میں پھر از سر نو شرطیں پیش کروں گا۔''

اتنا سن کر ''یکا گا'' نے خود کو حرکت دی اور سردار کے قریب پہنچ کر اس کے کان میں سرگوشیاں کرنے لگا۔ مکا مک نے یکا گا کو الگ کر کے بآواز بلند سوال کیا۔

''مگر مجھے یہ کیسے پتہ چلے گا کہ دوا جھوٹی نہیں ہے۔؟''

''بہت آسان ہے۔'' سینکو کی آواز پُرسکون تھی۔ ''سب سے پہلے تو مجھے جنگل میں جانا ہوگا۔''

یکا گا نے مکا مک سے سرگوشیوں میں پھر شکوک کا اظہار کیا۔

''اب میں آپ سے چھ کے بجائے بیس شکاری محافظ طلب کرتا ہوں۔ میں کہہ رہا تھا کہ میں پہلے جنگل جا کر دوا سازی میں کام آنے والی ضروری جڑی بوٹیاں حاصل کروں گا۔ تب تک آپ دونوں گاڑیاں تیار رکھیں گے۔ جن میں سے ایک گاڑی میں مچھلیاں اور کھالیں لدی ہوں گی اور رائفل بھی میری گاڑی میں رکھی ہوگی۔ ساتھ ہی شکاری محافظ بھی مجھے مستعد کھڑے ملنے چاہئیں۔ جنگل سے واپسی پر میں جڑی بوٹیوں سے دوا تیار کروں گا۔ پھر اس دوا کو اپنی گردن پر لیپ کر کے اپنا گلا لکڑی کے لٹھے پر رکھ دوں گا اس کے بعد آپ کے شکاری ایک تیز دھار والی کلہاڑی سے میری گردن پر پے در پے تین وار کریں گے۔ اور آپ چاہیں تو یہ وار آپ خود بھی کر سکتے ہیں۔''

مکا مک حیرت اور جوش میں بھر گیا۔ اس کی آنکھوں میں پُرمسرّت چمک عود کر آئی۔

''اور ہاں کلہاڑی کے ہر وار کے بعد مجھے ہر بار گردن پر دوائی ملنے کا موقع بھی دیا جائے گا۔ کلہاڑی وزنی ہو اور اس کا پھل دھاردار۔ میں نہیں چاہتا اس عمل میں کوئی چوک ہو۔''

سنیکو۔ بڑے نازک دور سے گذر رہا تھا۔ وہ کہیں کوئی کمی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے پھر سے تیور بدل لئے۔

''تم نے فیصلہ سنانے میں پھر سے دیر کی ہے سردار! یہ میری دوا کی توہین ہے اب تو میں تم سے تمہاری یہ بیٹی بھی مانگتا ہوں۔ اس لئے بھیڑ میں کھڑی ایک قبائلی لڑکی کی طرف اشارہ کیا جو انتہائی بدہیئت مخلوق تھی جس کی ایک آنکھ جنم سے ہی بند تھی۔ اس کے جبڑے لنگور کی طرح آگے کو ابھرے ہوئے تھے ساتھ ہی بھیڑ یئے جیسے بڑے بڑے دانت ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے تھے اور وہ کوئی اور نہیں سردار مکا مک کی اپنی ہی بیٹی تھی۔

اس شرط کو سن کر مکا مک کا چہرہ فرط غیض سے لال ہوا ٹھا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں

برسنے لگیں جبکہ بینکو اس طرف سے ایک دم بے نیاز سگریٹ کے مرغولے برابر فضا میں اچھالے چلا جا رہا تھا پھر اچانک ہی اس نے ہموار لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''جلدی کیجئے۔ جلدی ورنہ میں نئی شرطوں کی فہرست پیش کر دونگا۔''

اچانک نلپٹو کے اس ویران خطے کی دھند اس کی نگاہوں کے سامنے سے چھٹتی چلی گئی اور اس کے وطن کے خوشنما مناظر اس کی آنکھوں میں رقص کرنے لگے۔ اسے فرانس کا دارالخلافہ پیرس یاد آ گیا اور وہیں کی مقامی وہ حسین لڑکی بھی جو اس بھیڑیا نما لڑکی سے قطعاً مختلف تھی۔ رقص میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا اور وہ گاتی بھی بہت اچھا تھی۔ جب وہ اپنے عالم شباب میں پہلی بار پیرس پہنچا تو حسن و شباب کا پیکر اور گہری جھیل جیسی نیلی نیلی آنکھوں والی یہ کافر حسینہ اس کے بہت قریب آ گئی تھی۔

''تم لڑکی کس لئے مانگتے ہو۔؟''

مکا مک کی گونج دار آواز سنیکو کو پیرس سے ہزاروں میل دور پھر سے اسی دور افتادہ ویران خطے میں لے آئی جہاں جہنمی عذاب تھے۔ اذیتیں تھیں، موت تھی، اور ان سے بچ نکلنے کی بھی راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ سینکو نے مکا مک کو جواب دیا۔

''میں ساحلی سفر میں اسے اپنے ساتھ رکھونگا۔ یہ میرے لئے ایک اچھی بیوی ثابت ہوگی ساتھ ہی آپ سے رشتے داری میرے لئے کسی (اعزاز سے کم نہیں ہے۔''

''مجھے یہ بھی قبول ہے۔ تمہیں لڑکی ساتھ لیجانے کی اجازت ہے۔ لیکن یاد رہے تمہاری گردن پر کلہاڑی کے تین وار میں خود کرونگا۔''

''اور ہر وار کے درمیانی وقفے میں مجھے دوا لیپ کرنے کے موقع بھی دو گے۔'' سینکو کے بے لاگ مطالبات اور بیباک لب و لہجے سے مکا مک اب پوری طرح مطمئن تھا۔ ایک بدشکل کانی بیٹی کے مقابلے میں اسے چمتکاری دوا زیادہ عزیز تھی۔ پروگرام کے مطابق جب چھ حفاظتی شکاریوں کے ساتھ سنیکو جڑی بوٹیوں کی تلاش میں جنگل چلا گیا تو یکا گا نے مکا مک سے سازشی رنگ کی سرگوشی میں کہا۔

''دوا ملتے ہی ہم بڑی آسانی سے اسے ختم کر دینگے۔''

''بے وقوف!۔ مکا مک جھنجھلا اُٹھا۔ ''اس کے پاس دوا ہے ہم اسے ختم نہیں کر سکتے۔''

''مگر دوا ہر جگہ تو نہیں لگائی جاتی۔'' یکا گا نے بڑے حکیمانہ انداز میں کہا۔

''ناک کان آنکھ سوراخ ہی تو ہیں ہم ان میں میخیں ٹھونک دینگے۔''

''یکا گا آفرین ہو تم پر۔'' مکا مک نے خوش ہو کر اس کی پشت تھپتھپائی۔

''تم تو واقعی بڑے قابل نکلے۔ تم سچ کہتے ہو۔ واقعی انسانی جسم میں بہت سے سوراخ ہوتے ہیں، ہم دوا حاصل کر کے اس کے ہر سوراخ میں لوہے کی لمبی لمبی کیلیں ٹھونک دینگے۔''

سینیکو نے پہرے کی حالت میں جنگل سے کچھ پھل کچھ جڑی بوٹیاں کچھ درختوں کی چھالیں کچھ ننھے جنگلی بیر اور کچھ پھلیوں کے دانے جھولے میں ڈالے اور واپس پڑاؤ پر پہنچ گیا۔

چولہے پر رکھی پتیلی میں جب پانی کھول چکا تو سینیکو نے کہا۔

''سب سے پہلے اس میں جنگلی پھل ڈالو۔'' پھل ڈال دیئے گئے۔ اس نے پھر کہا۔

''اب اس میں انسانی انگلی پڑے گی۔ یکا گا اپنا ہاتھ ادھر دو تمہاری ایک انگلی کاٹنی ہے۔'' یکا گا نے خوفزدہ ہو کر تیزی سے اپنا ہاتھ پیچھے کی طرف کھینچ لیا۔

''یکا گا پلیز! صرف ہاتھ کی چھوٹی والی انگلی چاہئیے۔'' مکا مک کو غصہ آ گیا اس نے درشت لہجے میں کہا۔'' یکا گا! کیوں منع کرتے ہو کاٹنے دو اسے اپنی انگلی۔''

''ان لاشوں سے جو میدان میں جا بجا بکھری پڑی ہیں ہمیں سینکڑوں انگلیاں مل سکتی ہیں پھر میں ہی کیوں اپنی انگلیوں کٹواؤں۔؟'' یکا گا نے لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

''مجھے مردوں کی انگلیاں نہیں زندہ آدمی کی انگلی چاہیے۔'' سینیکو نے اصرار کیا۔

''ٹھیک ہے۔'' کہہ کر یکا گا نے خنجر تھاما اور پاس کھڑے ساتھی کی جھٹ سے انگلی تراش دی۔ پھر وہ انگلی سینیکو کی طرف اچھال کر بولا۔

''یہ تمہاری شرط پوری ہوئی۔ یہ زندہ آدمی ہی کی انگلی ہے۔ کافی لمبی موٹی اور تندرست بھی ہے۔''

سینیکو نے ہاتھ میں آئی انگلی کو کھولتے ہوئے برتن میں ڈالدیا اور آنکھیں بند کر کے وہی گیت گانے لگا جو کبھی اس کی فرانسیسی دوست نے اسے سکھایا تھا۔

''یہ تم گانا کیوں گا رہے ہو۔؟ مکا مک نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ گانا نہیں ہے۔ کراماتی بول ہیں جن سے دوا میں قوت اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ ان کے بغیر دوا کام نہیں کرتی۔'' سینیکو نے توضیح پیش کر دی۔

''لیجئے دوا بن کر تیار ہے۔''

''ان بولوں کو دھیرے دھیرے دہراؤ۔'' مکا مک نے کہا۔'' تا کہ میں ان کو یاد کرلوں۔''

''ابھی نہیں۔'' سینیکو نے کہا۔'' جب آپ کلہاڑی سے وار کر چکیں گے تب بتلا دونگا۔''

''اور اگر دوا ناکام ہوگئی تب۔؟'' مکا مک نے تشویش کا اظہار کیا۔

''میری دوا اچوک ہے جو کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ اگر یقین نہ آئے تو ٹھیک ہے میں حاضر ہوں۔ یکا یک اس نے جانکنی کے عالم میں تڑپتے ہوئے ایوانوف کی طرف اشارہ کیا۔

جس طرح آپ لوگوں نے اس کی جسم سے بوٹیاں تراشی ہیں، آنکھین پھوڑی ہیں اس کے جسم میں میخیں ٹھونکی ہیں آپ مجھ سے بھی اسی طرح پیش آسکتے ہیں۔ میں حاضر ہوں۔''

اسی دوران ایوانوف جس کا دم ابھی تک اس کے جسم میں اٹکا ہوا تھا کے منہ سے بڑی دلدوز چیخیں بلند ہوا ٹھیں۔ اس پر سینیکو نے جھنجھلا کر کہا۔

''ایسے شور و غل کے عالم میں تو میں کچھ بھی نہ کر سکونگا۔ اگر چاہتے ہو کہ دوا کا لیپ گلے پر لگا کر دوا کو کارگر ثابت کروں تو پہلے اس کمبخت کو ختم کر دو۔'' مکا مک کے سر کے ایک ہلکے سے اشارے پر یکا گا آگے بڑھ گیا اور اس نے اپنے خنجر سے بلا تامل اس کا سر اس کے دھڑ سے جدا کر دیا۔ اور اسے دنیاوی عذاب سے رہائی مل گئی۔

دوا جو اب تک پک کر ٹھنڈی ہو چکی تھی سینیکو نے اسے اپنے گلے پر اچھی طرح مل لیا پھر وہ مکا مک سے مخاطب ہوا۔

''مکا مک! کیا بھرپور وار کرنے کے لئے تم تیار ہو۔ وار پوری طاقت ومہارت کے ساتھ ہونے چاہئیں تاکہ تمہیں دوا کی اصلیت کا بھرپور اندازہ ہو سکے۔ سب سے پہلے تم مجھے لکڑی کے لٹھے پر خالی وار کر کے دکھاؤ تبھی مجھے تمہاری طرف سے اطمینان نصیب ہوگا۔''

مکا مک نے لکڑی کے لٹھے پر کلہاڑی کے دو زبردست وار کر کے دکھا دیئے جن پر سینیکو نے اطمینان کا اظہار کیا۔

''ٹھیک ہے مکا مک! اب میں اپنا سر لکڑی کے لٹھے پر رکھتا ہوں۔ تم پوزیشن لے لو جیسے ہی میں اپنے ہاتھ اپنی پشت پر اٹھا کر تمہیں اشارہ کروں تم میرے گلے پر کلہاڑی کا وار کر دینا اور دھیان رہے تمہارے پیچھے کوئی اور نہ ہو کیونکہ میری گردن سے ٹکرا کر کلہاڑی تمہارے ہاتھ سے چھوٹ جائے گی اور دور جا کر گرے گی۔

سینیکو نے نظریں دوڑا کر آس پاس کا جائزہ لیا۔ دو دو کتوں سے جتی ہوئی گاڑیاں سوکھی مچھلیوں اور کھالوں سے لدھی تیار کھڑی تھیں۔ سامان کے اوپر رائفل بھی رکھی تھی اور چھ شکاری محافظ بھی کوچ کے لئے مستعد کھڑے تھے کہ سینیکو نے اچانک ہی گہری تشویش کا اظہار کیا۔

''لڑکی کہاں ہے؟ لڑکی کہاں ہے؟ اس سے پہلے کہ میں دوا کا تجربہ پیش کروں لڑکی کو گاڑی میں سوار کرا دیا جائے۔''

سینیکو کی فرمائش پر فوری طور پر عمل کیا گیا۔ لڑکی گاڑی میں سوار کرا دی گئی تھی۔

اب سینیکو چھاتی کے بل فرش پر اوندھا لیٹ گیا اور اپنا سر لکڑی کے لٹھے پر ٹکا دیا بالکل اس طرح جس طرح کوئی معصوم تھکا ہارا بچہ اپنی ماں کی چھاتی پر سر ٹکا دیتا ہے۔ یوں بھی ہزاروں میل کے برسوں لمبے سفر سے وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ اس نے مکا مک کو ڈھنگ سے وار کرنے کے لئے آخری بار اور تنبیہ کی اور ساتھ ہی چھاتی کے بل لیٹے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اپنی پشت کی طرف بلند کر دیئے۔

مکا مک نے کلہاڑی کو سر کی طرف بلند کیا اچانک کلہاڑی کے پھنے پر برق سی لہرائی اور پھر کلہاڑی کا پھنا بھرپور قوت اور رفتار کے ساتھ نیچے کی جانب اترتا ہی چلا گیا جو کھال گوشت اور ہڈیوں کے درمیان جگہ بناتا ہوا لکڑی کے لٹھے میں دھنس گیا اس کے ساتھ ہی سینیکو کا سر فضا میں فٹ بال کی طرح اچھل کر دور جا پڑا۔

چاروں طرف ایسا گہرا سناٹا چھا گیا کہ سانسوں کی آوازیں بھی صاف طور پر سنائی دیے رہی تھیں۔ حیرت واستعجاب نے لمحے بھر کے لئے سبھی کو پتھر کی مورتیوں میں تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ مگر حقیقت کا راز منکشف ہوجاتے پر اب ہر طرف قہقہوں کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ مگر مکا مک کا چہرہ سیاہ پڑ چکا تھا۔ وہ جان گیا کہ سینیکو اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اور اسے جل دیکر آسان موت مرنے میں کامیاب ہو چکا تھا مگر جاتے جاتے وہ اس کے چہرے پر ایسی کالک مل گیا جو اس کی موت کے بعد بھی اس کے چہرے سے نہ چھوٹ سکے گی۔ وہ احمق اور بے وقوف ثابت ہو چکا ہے۔ اس کی سرداری بھی گئی اور عزت بھی۔ اب سب کی نظروں میں وہ محض مذاق کا نمونہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی بے وقوفی کی یہ مضحکہ خیز داستان اس کی موت کے بعد بھی گاؤں گاؤں قبیلہ قبیلہ اور گھر گھر دہرائی جایا کرے گی اور لوگ قہقہے لگایا کریں گے۔

☆......انتون چیخوف
☆......رفیق شاہین

طوفانی موسم کے شکار بدنصیب مسافروں کی ایک المیہ روسی کہانی

طوفانی موسم کے مُسافر

گریگری پیتروف جو پیشے سے ٹرنر تھا اپنے فن میں ماہر شمار کیا جاتا تھا ساتھ ہی قصبہ ''گالچینسک'' میں اس سے زیادہ نکما بھی کوئی نہ تھا۔

پیتروف اپنی بیمار بوڑھی بیوی کو ''زیمستوف'' اسپتال لئے جا رہا تھا۔ اسپتال یہاں سے تیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا اور درمیانی راستے کا یہ سفر انتہائی دشوار گذار اور تکلیف دہ سفر تھا۔ وہ جس طرف بھی رُخ کرتا یخ بستہ ہوا کے سرد جھونکے اس کے چہرے پر طمانچے رسید کر دیتے۔ برف کے ننھے ننھے ذرات سفید سفید بدلیوں کی شکل میں تبدیل ہو کر ادھر سے ادھر قلا بازیاں کھاتے اور ساتھ ہی بپھری ہوئی غضبناک ہواؤں کی ہاتھی جیسی چنگھاڑ سے سارا ماحول گونج اُٹھتا۔ برف آلود بدلیوں کا آندھی کے ساز پر ناچے جانے والا یہ بھیانک رقص دیکھ کر یہ اندازہ لگانا آسان نہیں تھا کہ ان الہڑ اور شوخ بدلیوں کا رُخ آسمان سے زمین کی طرف ہے یا زمین سے آسمان کی طرف۔ برف آلود دھند جو فضا میں سفید چادر کی طرح تنی ہوئی تھی اسکے پیچھے کے سارے منظر دائرۂ نگاہ سے اوجھل تھے۔ کچھ بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا نہ کھیت نہ میدان نہ تار گھر کے اونچے اونچے کھمبے نہ جنگل نہ درخت۔ یہاں تک کہ سردی سے تھر تھر کانپتے ہوئے جب گریگری پیتروف گاڑی پر سوار ہوا تو اسے گاڑی کا ''شیفٹ بو'' تک کہرے میں گم نظر آیا۔ گاڑی میں جتی نحیف و نزار گھوڑی جس کا سارا جسم بری طرح کانپ رہا تھا اس کی تمام تر جسمانی قوت یا تو اپنے نیچے بچھی ہوئی گہری برف سے پاؤں باہر نکالنے میں صرف ہو رہی تھی یا دوڑتے وقت سر ادھر اُدھر ہلنے میں۔ ٹرنر گریگری عجلت میں تھا۔ وہ گاڑی میں اپنی بلند نشست پر بیٹھا لگاتار ہچکولے کھا رہا تھا اور مسلسل گھوڑی کی پشت پر چابک برسائے چلا جا رہا تھا۔

''مت رو میتر یونا مت رو۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''ذرا صبر و تحمل سے کام لو ہم لوگ جلد ہی اسپتال پہنچ جائیں گے۔ خدا نے چاہا تو وہاں پہنچتے ہی ڈاکٹر پویل ایوانچ تمہیں ہاتھوں ہاتھ لے گا۔ وہ تمہیں دوا پلائے گا اور بھی مہربان ہوا تو ممکن ہے وہ اسپرٹ سے تمہارے بدن کی مالش بھی کر دے۔ بس چٹکیوں میں تمہاری پسلیوں کا درد غائب ہو جائے گا۔ ڈاکٹر بڑا ذمے دار انسان ہے وہ تمہارے علاج میں ذرا سی بھی کسر باقی نہیں چھوڑے گا۔ مگر حسب عادت وہ چیخ و پکار نہ مچائے ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ چلائے گا زمین پر پاؤں بھی پٹکے گا مگر علاج بہتر سے بہتر ہی کریگا۔ وہ بڑا نیک اور شریف انسان ہے۔ خدا اسے تندرست اور سلامت رکھے۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی وہ اپنے کمرے سے نکل پڑیگا اور فوراً ہی مجھے بے بھاؤ کی سنانا

شروع کر دیگا۔ مجھے اچھی طرح آڑے ہاتھوں لے گا۔

''کیا ہے؟ میں کہتا ہوں یہ سب کیا ہے؟''۔ وہ گلا پھاڑ کر چلائے گا۔

''کیا تم وقت پر نہیں آسکتے ؟ کیا میں کُتا ہوں؟ تمہارا پالتو جانور ہوں کہ تم مجھے ستاتے رہو اور میں اُف بھی نہ کروں۔ تمہیں سے کہہ رہا ہوں ابلیس! تم سے تم صبح کیوں نہیں آئے؟ بھاگو... بھاگو یہاں سے ...دفع ہو جاؤ اب کل آنا۔'' اُس کی ڈانٹ پھٹکار سُن کر میں پھر سے کچھ کہنے کی کوشش کرونگا۔ ''حضور والا ڈاکٹر پویل ایوانچ'' وہ میری بات درمیان میں ہی کاٹ دیں گے اور اپنے ڈانٹ جاری رکھتے ہوئے کہیں گے۔ ''مجھے اپنی شکل مت دکھا اور یہاں سے فوراً ہی دفع ہو جاؤ۔'' میں کہونگا۔ ''یور آنر! میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں، قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہم لوگ صبح تڑکے ہی گھر سے نکل پڑے تھے۔ مگر جب خدا کو ہی منظور نہ ہو اور وہ کہرے کی دیوار ہمارے راستے میں کھڑی کر دے اور برفیلا طوفان ہمیں چاروں طرف سے گھیرے تو آپ خود ہی سوچئے ہم ایسے میں وقت پر کیسے آسکتے ہیں؟ ایسے بگڑے موسم میں تو بڑے بڑے اعلیٰ نسل کے گھوڑے بھی پناہ مانگ جائیں گے جب کہ ہماری مریل گھوڑی کو تو گھوڑی کہنا بھی گھوڑی کی توہین ہے۔ گھوڑی کیا ہے یہ تو آنکھ کا ناسور ہے ناسور۔'' اتنا سن کر ڈاکٹر پویل اور بھی بھڑک اٹھیں گے۔ وہ چلا کر کہیں گے۔ ''جانتا ہوں...اچھی طرح جانتا ہوں... بہانے بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔ گریگری! میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ دعویٰ سے کہتا ہوں یہاں آتے ہوئے کم از کم پانچ شراب خانوں پر تم نے گاڑی روکی ہوگی۔'' اب میں کہونگا ''حضور والا آپ نے تو مجھے ایک بے دین کافر اور پھانسی دینے والا ایک جلاّد ہی سمجھ لیا۔ جبکہ میری بیوی کی روح اپنے خالق کے پاس جانے کے لئے پر تول رہی ہے کیا میں ایسے میں کلافی بیٹھ کر شراب پیوں گا؟ ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ چولہے میں جائے شراب اور بھاڑ میں جائیں شراب خانے۔'' اب پویل ایوانچ حکم دیگا کہ مریضہ کو اسپتال میں داخل کر لیا جائے اب میں بڑے ڈرامائی انداز میں لپک کر اس کے قدموں میں گر پڑونگا اور کہوں گا۔

''یور آنر! ہم آپ کے تعبیدار اور شکر گذار ہیں ہم پر تو بس کرم کرتے ہیں رہیئے ویسے ہم جاہل دہقانی کوڑوں سے پٹنے لائق ہیں مگر آپ انتہائی مشفق اور دردمند انسان ہیں۔ ہمارے محسن ہیں کہ ہماری خاطر اتنا دردسر مول لیتے ہیں۔ ہمارے لئے اپنے گرم پاؤں ٹھنڈے برف پر رکھتے ہیں۔'' اتنا سن کر وہ مجھے کچھ اس طرح گھور کر دیکھیں گے جیسے کہ وہ اب مجھ پر ہاتھ چھوڑنے والے ہوں۔ وہ ڈانٹ کر کہیں گے۔ ''فوراً میرے پاؤں چھوڑ دو اور اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ جی چاہتا ہے تمہاری ننگی پشت پر کوڑوں کی برسات کر دوں۔ بے عقل انسان اپنی بوڑھی بیوی کے حال پر ترس کھاؤ اور شراب پینا چھوڑ دو۔'' اس پر میں فوراً بول پڑونگا ڈاکٹر صاحب! آپ ہمارے محسن ہیں۔ سچے دل سے کہہ رہا ہوں جیسے ہی میتر یونا صحتیاب ہو کر گھر پہنچے گی میں آپ کی پسندیدہ چیز تیار کر کے آپ کو بطور تحفہ پیش کرونگا اگر آپ اجازت دیں گے تو میں ''کریلین برچ'' جیسی قیمتی لکڑی سے ایک شاندار سگار کیس بنا کر آپ کی خدمت میں پیش کرونگا۔ ماسکو شہر کے بازاروں میں ایک سگار چار ''روبل'' میں بکتا ہے مگر میں آپ سے ایک ''کوپک'' بھی لینا منظور نہیں کرونگا۔'' اتنا سن کر وہاں موجود سبھی لوگ بیساختہ ہنس پڑیں گے۔ ''ٹھیک ہے... ٹھیک ہے... میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ بس تم میں سب سے بڑی بُرائی یہی ہے کہ تم ایک عادی قسم

کے شرابی ہو۔"

"اے بوڑھی لڑکی! سنی تو نے میری باتیں۔ بڑے لوگوں کو مٹھی میں لینے کا ہنر تو کوئی مجھ سے سیکھے اس فن میں تو میں پوری طرح طاق ہوں۔ مگر موسم کا مزاج تو بگڑتا ہی چلا جا رہا ہے۔ برف آلود کہرا اور بھی گھنا ہو گیا ہے۔ خدا رحم کرے ہمارے حال پر ایسے طوفانی موسم میں کہیں ہم راستہ نہ بھٹک جائیں۔ دھند نے میری تو آنکھیں بند کر دی ہیں۔" اور گریگری پیتروف پھر خود کلامی کا سلسلہ چھیڑ دیتا ہے۔ اس کا دماغ لگاتار گردش کرتا رہتا ہے اور انگنت الفاظ اس کی زبان سے ٹپکتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اسے یادیں گھیر لیتی ہیں۔

پیتروف کی بدبختی اور مصیبت کا آغاز شام سے کچھ دیر قبل اس وقت ہوا جب وہ شراب کے نشے میں چور جھومتا اور لڑکھڑاتا ہوا شراب خانے سے گھر پہنچا۔ وہاں اس کی بیوی نے اپنے جلاد کو کچھ ایسی عجیب وغریب نظروں سے دیکھا کہ اس سے پہلے اس طرح کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی مدقوق آنکھوں میں اس وقت اجنبیت، مظلومیت کرب اور خاموش احتجاج کے ملے جلے رنگ تیر رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا احتجاج تھا جو کم خوراک ملنے اور زیادہ پیٹے جانے والے کتے کی آنکھوں میں پایا جاتا ہے۔ اس وقت وہ بے حس و حرکت تھی اور غیر معمولی طور پر سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ اس وقت اس میں اور دیوار پر آویزاں مقدس شبیہ میں بڑی حد تک مماثلت نظر آ رہی تھی۔ وہ ساکت و صامت تھی یعنی ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کوئی دم میں دم توڑنے والی ہے۔ مرنے والی ہے۔ غرض کہ اس کی بیوی کی غیر ہمدردانہ معتوب نفرت انگیز بڑا احتجاج اور شکوہ سنج نگاہوں کے ساتھ ہی اس کی مصیبتوں اور پریشانیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی پڑوس سے برف پر پھسل کر چلنے والی گاڑی یعنی سلیج کا بندوبست کیا اور اب وہ اسی گاڑی میں اپنی بیوی کو ساتھ لئے اس امید پر اسپتال جا رہا تھا کہ وہاں ڈاکٹر پویل ایوانچ مریضہ کا ڈھنگ سے علاج کر کے اس کی آنکھوں کے موجودہ عجیب وغریب تاثر کو دور کر کے اس کی صحت بحال کر دیگا۔

"سُنا تم نے میتریونا۔؟" اس نے کھکھار کر گلا صاف کیا اور پھر سے بڑبڑانے لگا۔ "میتریونا اگر پویل ایوانچ تم سے یہ پوچھ بیٹھے کہ کیا میں تمہیں مارتا پیٹتا ہوں تو تم منع کر دینا آئندہ اب کبھی بھی میں تم پر ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا۔ تمہیں بتاؤ کیا کبھی میں نے تمہیں برے جذبے سے پیٹا ہے؟ کبھی نہیں۔ پھر بھی اپنے کئے پر مجھے افسوس ہے۔ شرمندگی ہے۔ دیکھو نا میں تمہیں اسپتال لے کر جا رہا ہوں۔ وہاں جلد از جلد پہنچے کی برابر کوشش میں لگا ہوں مگر موسم؟ یہ برفباری تو بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ یا مالک! ہمارے حال پر رحم فرما۔ ہم پر اپنا کرم کر۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بینائی پر پردہ ڈال دینے والے اس طوفانی کہرے میں راستہ بھٹک کر کہیں کے کہیں پہنچ جائیں۔

میتریونا! کیا تمہاری پسلیاں کچھ زیادہ ہی درد کر رہی ہیں؟ تم بولتی کیوں نہیں؟ میں تمہیں سے پوچھ رہا ہوں کیا تمہاری پسلیوں میں زیادہ درد ہو رہا ہے؟" جواب نہ ملنے پر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میتریونا کا چہرہ دیکھ کر اس کے دل پر ہیبت سی طاری ہو گی۔ مریضہ کے چہرے پر جمی برف کی باریک تہہ ابھی پگھلی نہیں تھی اور شفاف برف کی نقاب تلے جھانکتا ہوا اس کا چہرہ ایک دم ساکت و صامت کھنچا کھنچا اور اکڑا اکڑا سا دکھائی دے رہا تھا۔ چہرے کی تبدیل شدہ رنگت بھی اب کچھ نیلی پیلی اور مٹمیلی سی نظر آ رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے تمہیں؟ بوڑھی بے وقوف عورت! میں تمہیں سے بات کر رہا ہوں۔ میں نے جو کچھ بھی کہا ہے کتنے سچے دل سے کہا ہے۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہا ہے کہ میں اب تجھے کبھی نہیں پیٹو نگا مگر تجھے تو میری بات پر یقین ہی نہیں ہے۔ بڑی پاگل عورت ہے۔ مجھے تو تجھے اسپتال بھی نہیں لے جانا چاہئے تھا۔

گریگری پیتروف نے گھوڑی کی لگام چھوڑ دی۔ اس کا دل ایک بے ن ام سی دہشت سے اندر ہ اندر بیٹھا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ پیچھے مڑ کر بیوی کو دیکھنے کی ہمت بھی اس کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ بیوی کی پڑ اسرار خاموشی بھی بذات خود تشویش اور سراسیمگی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ جس نے اسے خوف و دہشت کے غار میں ڈھکیل دیا تھا۔ حقیقت کی بازیافت کی خاطر اور اچانک ہی دل میں جاگ اٹھے وسوسوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے ساتھ ہی انجانی سے ددہشت کے زیر اثر اس نے اپنا رخ پیچھے کی طرف گھمائے بغیر ہی اپنا ہاتھ پیچھے کی رف دراز کر دیا اور بالآخر اس کے ہاتھ میں مریضہ کا ہاتھ آ ہی گیا۔ بناوٹ اور ساخت کے اعتبار سے تو یہ ہاتھ ہی تھا مگر اس میں انسانی ہاتھ جیسی کوئی بات سرے سے تھی ہی نہیں۔ پیتروف کو ایسا لگ رہا تھا جیسے ٹھوس برف کا ٹکڑا اس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہو۔ پھر برف کا یہ ٹکڑا اس کے ہاتھ سے پھسل کر آواز کے ساتھ نیچے گر پڑا۔ بڑی دیر کے بعد پیتروف کے گلے میں پھنسی آواز آزاد ہو کر ایک آہ کی طرح سنائی پڑی۔

''اے مالک! یہ کیا ہوگا؟ یہ تو میرا ساتھ چھوڑ کر چلی گئی۔ میری میتر یونا مر گی اور میں ابھی تک اس کی لاش سے باتیں کئے جا رہا ہوں۔'' اب وہ بے اختیار ہو کر زار و قطار رونے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا دیتا کے اسٹیج پر زندگی سے متعلق سارے واقعات ایک کے بعد ایک کس تیزی سے گذرتے چلے جاتے ہیں اور آخر میں پردہ گر جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں بھی سبھی کچھ بڑی عجلت کے ساتھ انجام پذیر ہوا تھا۔ ادھر مصیبت کا آغاز ہوا اور ادھر اس موڑ پر اس کا اختتام بھی ہو گیا۔ ابھی کچھ ہی لمحوں پہلے وہ عورت جس کے ساتھ اس نے از سر نو شریف بن کر رہنے کا عہد کیا۔ ندامت کا اظہار بھی کیا اس نے یقین نہیں کیا اور نہ آزمائش کے لئے اسے مہلت دی۔ وہ اس کی دنیا میں اسے اس کے حال پر تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ مر گئی اور ایک نئی دنیا بسالی اس نے۔

پورے چالیس سال اس نے مرحومہ کے ساتھ گذارے تھے۔ مگر ازدواجی زندگی کا یہ طویل عرصہ پلک جھپکتے یوں گذر گیا جیسے کہ ذرا سی دیر میں کہرا چھٹ جاتا ہے۔ اس کی حقیقی زندگی کے آرام وسکون کو اس کی مے نوشی کی زیادتی نے تباہ و تاراج کر کے رکھ دیا تھا۔ پیشے اور کام سے لاپروائی اور شراب کی فضول خرچی سے مفلسی گھر میں ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئی تھی۔ ہر دم ہاتھ تنگ رہنے سے اس کے مزاج میں غصہ اور چڑچڑاہٹ جیسی کیفیات در آئی تھیں۔ اب وہ بات بے بات اپنا غصہ اپنی بیوی پر اتارنے لگا تھا۔ وہ کسی بے دردی سے پیٹتا تھا اسے۔ غصے میں وحشی درندہ ہو جاتا تھا وہ۔ وہ خاموشی پٹتی رہتی۔ لہولہان ہو جاتی مگر غریب نے کبھی زبان نہ کھولی اور اب جب کہ اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہوا کہ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ برا سلوک کیا ہے اور اب جب کہ اس نے عہد کر لیا کہ اب وہ اس سے مہذب انسانوں کی طرح پیش آئے گا۔ اس پر ہاتھ نہیں چھوڑے گا۔ اس کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا سلوک کیا کریگا تو وہ خود

ہی نہیں رہی۔ چلی گئی۔ کبھی واپس نہ آنے کے لئے اس نے تشدد کا سہارا لیکر اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ سارے قصبے میں دردر جا کر بھیک مانگے تا کہ پیٹ کے جہنم کے لئے ایندھن مہیا ہو سکے۔ وہ اس کے لئے تیار نہیں تھی مگر میری مار پیٹ سے لہولہان ہو کر آخیر میں اس نے میرے آگے اپنے گھٹنے ٹیک ہی دیئے۔ وہ دردر کی خاک چھان کر پونٹی میں جو کچھ کھانے کا سامان لے کر آتی میں اس پر بھوکے کتے کی طرح ٹوٹ پڑتا اور اس کے آنچل کی گانٹھ سے سکے نکال کر سیدھا کلالی کے راستے پر چل پڑتا۔ اُف کس حد تک گر گیا تھا میں۔ اگر میں نے اس سے انسانوں جیسا سلوک کیا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ وہ آج بھی زندہ ہوتی۔ اے مقدس ماں! گمراہ ہو گیا تھا میں۔ میں شیطان کے پھیکے جال میں پھنس گیا تھا۔ مگر یہ گاڑی میں کہاں ہانکے لئے جا رہا ہوں؟ میرے ساتھ میری بیوی کی لاش ہے جو علاج کے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اب مجھے اس کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کرنا ہوگا۔ چلو اب واپس چلو۔''

اس نے گھوڑی کی باگیں کھینچ کر گاڑی کو واپسی کے راستے پر ڈال دیا اور گھوڑی کی پشت پر چابکوں کی جھڑی لگا دی۔ اب سفر دشوار سے دشوار ترین ہوتا چلا جا رہا تھا۔ دھند اور بھی گاڑھی ہو گئی تھی اور گاڑی کو گھوڑی سے جوڑنے والی ''شیفٹو'' تک آنکھوں سے اوجھل تھی۔ بے تکان دوڑتی گاڑی برفپوش صنوبر کے بچہ درختوں کی جھاڑیوں کے اوپر سے گذرتے ہوئے بار بار اُچھل اُچھل پڑتی تھی۔ اور اکناف و اطراف سے یک بیک نمایاں ہو اٹھنے والی جھاڑیاں اس کے جسم پر خراشوں کے نشانات چھوڑ جاتی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر میں اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کی سیہ پتلیاں سفید ہو گئی ہیں اور سفید چادر کے اس پار کے نہ صرف منظر بلکہ ان کے سائے تک آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ اسے لگ رہا تھا وہ ایک سفید مٹی کی قبر میں زندہ دفن ہو چکا ہے اور باقی دنیا سے اس کا تعلق ہر طرح سے منقطع ہو چکا ہے۔

کاش! کہ مجھے ایک موقع ملتا اور میں اپنی زندگی از سر نو شروع کرتا! اس کے دماغ کی روانی چالیس سالہ زندگی کے ابتدائی ایام کی طرف مڑ گئی۔ ان دنوں جب اس کی شادی میتر یونا کے ساتھ انجام پائی تھی کتنے خوبصورت تھے وہ دن! خود میتر یونا بھی حسن و شباب کا ایک حسین پیکر تھی۔ وہ سلجھی ہوئی شخصیت کی ایک انتہائی خوش مزاج اور پرکشش لڑکی تھی جو ایک کھاتے پیتے خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے گھر والوں نے اس کی پیشہ ورانہ لیاقت سے متاثر ہو کر میتر یونا کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیا تھا۔ ازدواجی زندگی کے یہ ابتدائی دن ہر طرح سے خوشگوار تھے کہ ایک عظیم المیے کا آغاز اس طرح عمل میں آیا کہ اسے پینے کی لت پڑ گئی اور اس طرح خوشیوں سے بھرے پڑے گھر کو دیکھتے ہی دیکھتے آگ لگ کر رہ گئی۔ اپنی شادی کے دنوں کی خوشگوار یادوں میں کھو کر اسے اچانک ہی ایسا لگا جیسے اس کے دماغ کا دیا گل ہو گیا ہے اور وہ مر چکا ہے۔ اس کے دماغ نے اب کام کرنا بند کر دیا تھا۔ اب تو بس اسے اتنا ہی یاد تھا کہ وہ رات دن شراب میں غرق ہے۔ بیوی سے جھگڑ رہے۔ پیٹ پیٹ کر اسے لہولہان کئے دے رہا ہے۔ مجروح و مضروب ہو کر اس غریب کے لئے چلنا بھی دوبھر ہے مگر وہ اسے دھمکا رہا ہے۔ مزید زدوکوب کر رہا ہے اور وہ لاچار ہو کر دردر بھیک مانگتی پھر رہی ہے۔ ایسے ہی نامساعد حالات میں دردناک زندگی بسر کرتے ہوئے اس کی زندگی کے چالیس سال ضائع ہو کر رہ گئے تھے۔

ہر طرف چھائے ہوئے برفانی ذرات کے اڑتے ہوئے بادل اب بھورے رنگ میں تبدیل

ہو گئے تھے جو اس بات کا اشارہ یہ تھے کہ شام ہو چکی ہے اور شفق پھول رہی ہے۔

"مگر میں جا کہاں رہا ہوں"؟ وہ اچانک ہی جیسے گہری نیند سے جاگ پڑا۔ "مجھے واپس گھر پہنچ کر مرنے والی کو کفنا کر قبرستان پہنچانا ہوگا مگر میں اسپتال کی طرف کیوں جا رہا ہوں؟ مجھے یاد ہے میں نے گاڑی کا رخ واپسی کے راستے پر موڑ دیا تھا۔ پھر بھی گاڑی اسپتال کی طرف بھاگی جا رہی۔ وہ سخت حیرت زدہ ہوا اٹھا تھا۔ "اے میرے مالک یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ واپس جانے کے بجائے گاڑی اگے کی طرف جا رہی ہے۔ یہ نجانے کب دھیرے دھیرے گھوم کر پھر سے اسپتال کی رخ پر چل پڑی اور مجھے پتہ بھی نہ چلا لگتا ہے میں پاگل ہوتا جا رہا ہوں۔ میرے حواس مجھے دھوکہ دیے رہے ہیں۔"

اس نے پھر سے گاڑی موڑ کر واپسی کے راستے پر ڈال دیا اور جنونی انداز میں گھوڑی کو چابک سے پیٹنے لگا۔ گھوڑی نے ہنہنا کر شدید طور پر احتجاج کیا اور تیز تر دوڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ دیوانہ وار اب بھی گھوڑی کو پیٹ پیٹ کر گھائل کئے جا رہا تھا۔ اس دوران اسے بار بار محسوس ہوا کہ کوئی شئے گاڑی کے فرش سے ٹکرا کر بڑی پُر اسرار اور ہیبتناک آوازیں پیدا کر رہی ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر ہی یہ راز اس پر خود بخود منکشف ہو گیا کہ یہ آوازیں اس کی بیوی کے یخ آلود سر کے فرش سے ٹکرانے کے سبب پیدا ہو رہی تھیں۔

شام نے اپنا بھورا آنچل ہوا کے دوش پر لہرا دیا تھا۔ آسمان سے اترتے اندھیرے نے اپنے سُرمئی پر پھیلا دیئے تھے اور تاریکی اب اور بھی دبیز ہوتی چلی جا رہی تھی۔ طوفانی ہواؤں کی چنگھاڑ بار بار سنائی دے رہی تھی۔ فضا میں خنکی اپنے نقطۂ عروج پر تھی "کاش! کہ میں ایک بار صرف ایک بار اپنی زندگی کی شروعات ایک نئے ڈھنگ سے کر سکتا! سب سے پہلے میں چند ضروری اوزار خرید تا اور پھر ٹھیکے پر ملنے والے اپنے کام میں بری طرح جٹ جاتا۔ پھر محنت کے بدلے میں جو بھی دھن ملتا سب میتر یونا کی ہتھیلی پر رکھ دیتا اور شراب کو تو چھوتا بھی نہیں۔ کتنی خوش ہوتی مری میتر یونا کو

گریگری پیتروف ایسے ہی خیالات کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا اسے یہ پتہ ہی نہ چلا کہ گھوڑی کی لگام کب اسکے ہاتھ سے چھٹ گئی۔ اس نے چاہا وہ پھر سے لگام اپنے ہاتھ میں تھام لے مگر اس کا جسم اس قدر الکسایا ہوا تھا کہ چاہ کر بھی وہ لگام کو اپنی گرفت میں نہ لے سکا۔ اس کے ہاتھوں نے شاید اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔" اس نے سوچا۔ "اب گھوڑی کو لگام دینے کی ضرورت ہی کیا ہے گھوڑی خود بھی گھر کے راستے سے بخوبی واقف ہے۔ اس نے سوچا گھر پہنچتے ہی اسے جنازے کی تیاری میں مصروف ہونا پڑیگا لہذا یہی مناسب ہے کہ وہ یہیں تھوڑا آرام کر لے اور ایک آدھ نیند کی جھپکی لے لے۔ اس نے اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا اور نیند کی جھپکیاں لینے لگا۔ پھر اچانک ہی اسے محسوس ہوا گھوڑی رک گئی ہے۔ اس نے ہڑ بڑا کر فوراً ہی آنکھیں کھول دیں۔ اسے سامنے کی طرف ایک جانے پہچانے سے مکان کا ہیولا سا نظر آیا۔ اس نے سوچا وہ گاڑی سے اتر کر معلوم کرے کہ کیا معاملہ ہے۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس کے سارے جسم میں اس قدر الکساہٹ اور آلسی پن بھرا ہوا تھا کہ بدن کو حرکت دینے کے بمقابلے اسے برف میں جم کر مر جانا کہیں بہتر معلوم ہوا۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور وہ نیند کی گہرائیوں میں ڈوبتا ہی

چلا گیا۔

اور جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ وہ کسی ہال میں ہے۔ ہال کی دیواریں روغنی رنگ سے پینٹ تھیں اور سورج کی زرنگار کرنیں کھڑکی کے راستے ہو کر ہال میں اُجالا بکھیر رہی تھیں۔ اُس نے دیکھا کہ چند افراد جو بڑے مہذّب اور دردمند معلوم ہوتے تھے اس کے سامنے کھڑے تھے مگر وہ بول نہیں رہے تھے لہٰذا اسی نے بولنا شروع کر دیا۔

''فادر سے کہو مرحومہ کے جنازے کی مذہبی رسومات سے جلد ہی فارغ ہونے کی کوشش کریں۔'' ''ٹھیک ہے..ٹھیک ہے...اسی طرح خاموش لیٹے رہو۔'' کسی نے اسے یونہی لیٹے رہنے کی تلقین کی۔

''کیا؟۔'' اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ''ڈاکٹر پویل ایوانچ اور یہاں؟ اوہ میرے محسن اعلیٰ میں کن الفاظ میں آپکا شکریہ ادا کروں۔''

اس نے چاہا وہ بستر سے چھلانگ لگا کر اپنے محسن کے قدموں پر گر پڑے تبھی ناگاہ ایک حیرت انگیز اور خوفناک راز بڑی بے رحمی کے ساتھ اس پر منکشف ہوا۔ اس کے ہاتھ پاؤں حرکت سے معذور تھے۔ وہ چیخ پڑا۔

''ڈاکٹر صاحب! کہاں ہیں میرے ہاتھ؟ کہاں ہیں میری ٹانگیں؟''

''بھول جاؤ...اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں...تمہارے پاؤں یخ آلود کہرے کی نذر ہو چکے ہیں۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ تم اب بھی سلامت ہو...حیات ہو تم زندگی کی تقریباً ساٹھ بہاریں تو دیکھ ہی چکے ہو۔ بس اب کیا کرنا ہے۔ کافی ہے۔''

''یہ تو ظلم ہے مجھ پر ڈاکٹر! ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ خدا کے لئے میرے ہاتھ پاؤں مجھے واپس لوٹا دو مجھے ان کی بے حد ضرورت ہے۔''

''کیوں۔؟''

''میں نے کسی سے مانگے کی گھوڑا گاڑی لی ہوئی ہے جو واپس لوٹانی ہے اور مجھے اپنی بیوی کا جنازہ بھی قبرستان پہنچانا ہے۔ اس کے علاوہ سگار کیس بنا کر آپ کو تحفے میں پیش کرنا بھی باقی ہے۔''

ڈاکٹر نے ہوا میں ہاتھ لہرا کر جانے کا اشارہ کیا اور وارڈ سے باہر نکل گیا۔ اپنے معاون ڈاکٹر کے یہ پوچھے جانے پر کہ یہ کیسی گاڑی کیسا سگار کیس اور کس مرحومہ کا نام لے رہا تھا؟ ڈاکٹر پویل ایوانچ نے کہا۔

''ہذیان بک رہا ہے۔ آثار اچھے نہیں ہیں۔''

☆......رابرٹ استادینو
☆......رفیق شاہین

(نازک ترین لمحوں کی سنسنی خیز سوئز کہانی)

ہائی جیکرز سے سودے بازی

جیل کی نیم تاریک کال کوٹھری میرے داخل ہوتے ہی جیل کے محافظ نے دروازہ مقفل کر دیا۔ تھوڑی دیر تک تو وہاں مجھے کچھ بھی دکھائی نہ دیا لیکن جیسے ہی میری نگاہیں اندھیرے سے مانوس ہو گئیں مجھے سب کچھ نظر آ گیا۔ میں نے دیکھا خونخوار قاتل اور وحشی دہشت گرد ''درگاس'' اپنے بستر پر دراز مجھے بڑی متجسس نظروں سے گھور رہا تھا۔ نو ماہ سے قید میں پڑے پڑے وہ اب کافی حد تک فربہ ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بھی زردی مائل نظر آ رہا تھا۔ مجھے پہنچانتے ہی اس کے کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ کھیلنے لگی وہ بڑے زہر خند لہجے میں بولا ''اوہ! تو یہاں مسٹر بریکنلیف تشریف لائے ہیں۔ میں تو یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ جناب سے اب کبھی ملاقات نہ ہو گی۔ خوشی ہوئی کہ برطانوی ایجنسی نے آپ جیسے مغرور و متکبر اور سفاک افسر کو یہاں بھیجنے پر مجبور کر دیا ہے۔''

جیل کے گارڈ نے جو مجھے درگاس کی کال کوٹھری میں مقفل کر کے چلا گیا تھا مجھے اس سے گفتگو کے لئے تخلیہ فراہم کر دیا تھا لہذا گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے میں اس سے مخاطب ہو گیا۔

''ودرگاس! تمہارے انداز گفتگو سے صاف ظاہر ہے کہ ریڈیو سن کر تم موجودہ صورتحال سے بخوبی واقف ہو چکے ہو پھر بھی واقعات کو اختصار سے بیان کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ واقعہ اس طرح ہے کہ صبح ٹھیک سوا سات بجے تمہاری نام نہاد حریت پسند جماعت کے چار مسلح دہشت گرد برٹش ایئر لائن کے ہیتھرو ہوائی اڈے پر کھڑے ایک طیارے میں اس وقت داخل ہو گئے جبکہ یہ طیارہ مسافروں کو لیکر پیرس کے لئے پرواز کرنے ہی والا تھا۔ تمہارے ان دہشت گرد ساتھیوں کو اس بات کا سراغ مل چکا تھا کہ برطانوی وزیر اعظم کی بھتیجی بھی اسی طیارے میں سوار ہے۔ لہذا انہوں نے باقی تمام مسافروں سے الگ کر لیا ہے۔ البتہ وزیر اعظم کی بھتیجی کو چھوڑ کر بقیہ سبھی مسافروں کو آزاد کر دیا ہے۔ مسافر اپنے اپنے ٹھکانوں پر جا چکے ہیں۔ اب صورتحال یہ ہے کہ ہمارے محافظ دستے نے طیارے کو محاصرے میں لے رکھا ہے اور رن وے پر طیارہ ابھی تک جام کھڑا ہے'' ''مجھے معلوم ہے۔'' درگاس جو لیٹا ہوا تھا اب اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''میں نے یہ سب ریڈیو پر سن رکھا ہے۔''

کل رات سے مسلسل بھاگ دوڑ کے سبب مجھے ایک پل کے لئے بھی بیٹھنا نصیب نہ ہوا تھا۔ اب کال کوٹھری کی سلاخوں سے پشت ٹکا لینا بھی مجھے غنیمت معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''رات ہمیں کنٹرول ٹاور سے پیغام ملا ہے کہ تمہاری قید سے بعافیت رہائی کے عوض وزیر اعظم کی بھتیجی کو رہا کرایا جائے۔ لہذا تمہارے گروہ کے کمانڈوز کے حکم کی تعمیل میں ہمیں یہاں سیلے جا کر تمہیں ہوائی اڈے پر پہنچانا ہوگا۔ وہاں ہوائی جہاز پر سیڑھی لگی ہوگی۔ تم کو اس سیڑھی پر چڑھنا ہے۔ تم جیسے ہی آخری سیڑھی پر قدم رکھو گے لڑکی سیڑھی سے نیچے کی طرف اترنا شروع کر دیگی اور پھر لڑکی کے خطرے سے باہر ہوتے ہی تمہارے طیارے کو پرواز کی اجازت دیدی جائے گی۔ ہمارے طیارے کا عملہ بھی تمہاری حفاظت میں تمہارے ساتھ ہی جائے گا پھر اپنے محفوظ ٹھکانے پر پہنچنے کے بعد تم ان پر سے قبضہ ہٹا لو گے اور وہ اسی طیارے کے ساتھ یہاں واپس آجائیں گے۔''

''لیکن یہ بھی تو بتایئے کہ یہ جہاز کس ملک میں لینڈ کریگا۔؟''

''انجان او بھولے بننے کی کوشش مت کرو۔'' میں نے اپنے غصے پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو دنیا بھر میں صرف ایک ہی ملک ایسا ہے جو تمہاری پشت پناہی کرتا ہے اور جس نے تم جیسے دہشت گردوں کو جنم دینے کے لئے کمانڈوز کے تربیتی کیمپ قائم کر رکھے ہیں تمہیں وہیں جانا ہے۔ اس ملک نے انسانی جانوں کے تحفظ کے نام پر ہماری سرکار کو پیغام بھی بھیجدیا ہے کہ وہ تمہارے طیارے کو اپنے ملک میں لینڈ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔''

حالات کو اپنے حق میں پلٹا کھاتے دیکھ کر درگاس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دوڑ گئی۔ اس نے بڑے ہی جوش و مسرت کے ساتھ پوچھا۔ کیا یہ کاروائی آج شام کو عمل پذیر ہوگی۔؟''

''نہیں۔ کل صبح۔'' میں نے دیکھا اس کا جوش ٹھنڈا گیا۔ وہ مجھے پُرشکوک نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ ''منصوبے کو عملی شکل دینے سے متعلق بہت سے معاملات وقت کے متقضی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''سفارتی اور مواصلاتی سطح پر ہمیں بہت سے انتظامات کر کے اس مشن کی کامیابی کو بہر صورت یقینی بنانا ہے تاکہ تم لوگ بحفاظت اپنے ٹھکانے پر پہنچ سکو۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے طیارے کے عملے کی بعافیت واپسی کا دارومدار بھی تم لوگوں کی سلامتی میں مضمر ہے ہم اپنے اسٹاف کی خاطر آپ لوگوں کی حفاظت اور سلامتی میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑیں گے۔ سب سے بڑا مسئلہ تو ہمارے سامنے یہ ہے کہ ہم تمہیں کس طرح بحفاظت ایئرپورٹ پر پہنچائیں یا پیغامات ہدایات احکامات اور مسلسل رابطے ہمارے لئے سر درد بنے ہوئے ہیں۔ اب کیا کیا جائے ان میں وقت تو صرف ہوگا ہی۔ ہم نے اسے لئے کاروائی کے لئے کل صبح کا وقت متعین کیا ہے۔

میری ہر طرح کی یقین دہانی کے باوجود بھی درگاس کے چہرے سے شکوک کا کہرا چھٹا نہیں تھا۔ اس کے اس ردعمل کی وجہ بھی غیر فطری نہیں تھی کیونکہ وہ کوئی اور نہیں صرف میں ہی تھا جس کی وجہ سے درگاس آج قیدی بن کہ قید میں پڑا تھا۔ میں نے ہی بڑے منصوبہ بند طریقے سے اس وحشی درندے کو جال میں پھانس لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں اس کا کوئی مخلص اور ہمدرد دوست نہیں ہوں بلکہ اس کا جانی دشمن ہوں۔ میں نے ہی اسے جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بھیجا ہے۔ اسے مجھ سے خطرہ لاحق تھا کہ میں پھر سے کوئی شاطرانہ چال چل کر اسے کسی نئی مصیبت میں ڈال دونگا۔

''مجھے بے وقوف مت سمجھو۔'' درگاس نے غصے سے دانت پیس کر کہا۔ ''میں جانتا ہوں

کاروائی میں تاخیر تم اس لئے کر رہے ہو کہ ہمارے ساتھیوں پر کمانڈو ایکشن کے لئے تمہیں وقت مل جائے تم میرے ساتھ بھی اسی طرح کی بدعہدی کر چکے ہو۔''

''پاگل مت بنو۔'' میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ ''عقل سے کام لو عقل ہے۔ اس بار معاملہ مختلف ہے جو ہر طرح سے تمہارے حق میں جاتا ہے۔ وزیر اعظم کو تمہارے دہشت گرد ساتھیوں کی ہلاکت سے زیادہ اپنی بھتیجی کی رہائی میں دلچسپی ہے۔ وہ کبھی پسند نہیں کریں گے کہ تمہارے خلاف کاروائی کر کے ان کی بھتیجی کی زندگی کو خطرے میں ڈالا جائے۔ اب جہاں تک میرا تعلق ہے جھوٹ نہیں بولونگا میں انفرادی طور پر تو یہی چاہتا ہوں کہ اس مہلت کی آڑ میں تم پر کمانڈو ایکشن ہو اور تم اور تمہارے ساتھیوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے مگر معاملہ اس بار وزیر اعظم کا ہے اور اسی بات نے مجھے بے دست و پا کر کے رکھ دیا ہے۔ خیر! اس بات کو یہیں چھوڑ دو۔ اب تو میرا فرض بنتا ہے کہ اس سودے بازی کے عمل کو باحسن وخوبی انجام دوں اور یہ معاملہ ہر طرح کی گڑ بڑ سے پاک رہے۔

''اگر تمہارا بیان واقعی صداقت پر مبنی ہے پھر تو تمہارے سینے پر سانپ لوٹ رہے ہونگے۔ بڑے درد و کرب کا احساس ہو رہا ہوگا۔ تمہاری بے دست و پا سنگدلی اب تو تمہارے ہی قلب وجگر پر نشتر چلا رہی ہوگی۔ اب تمہیں انسانی لاشوں کا منظر دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ تمہیں مجھے قیدی بنانے میں دو سال لگے تھے اب میری رہائی تمہاری محنت پر پانی پھیر دیگی۔ بریک صاحب! اب آپ کے دل پر آرے چل رہے ہونگے۔ کیسا لگ رہا ہے؟ کچھ تو بولو۔ ابت و میں آزاد ہو کر بڑی بڑی ہستیوں کو موت کے گھاٹ اتارونگا۔ بھیڑ والے علاقوں میں طاقتور بم نصب کر کے لاشوں کے چیتھڑے فضا میں بکھیرونگا۔ بلند و بالا عمارتوں کو ملبے کے ڈھیر میں بدل دونگا۔ طیارے ہائی جیک کر کے مسافروں کو یرغمال بناؤنگا۔ اب تم اتنا تو بتادو اخبار و، میں میرے یہ کارنامے پڑھ کر تم سینہ کوبی کرو گے یا سر کے بال نوچو گے۔؟''

درگاس مجھے چرکوں پر چرکے لگا رہا تھا۔ جی چاہتا تھا اسی وقت اس کا گلا گھونٹ دوں مگر موقع محل اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ میں نے خون کے گھونٹ پی کر کہا۔ ''کیوں مجھ سے میری زبان کھلوانا چاہتے ہو جبکہ یہ بات تم خود بھی جانتے ہو کہ میں تمہیں زندہ دیکھنا نہیں چاہتا ہوں کیونکہ تم ایک جنونی وحشی ہو۔ جانے کتنے خون تمہاری گردن پر ہیں۔ مگر میں اس وقت مجبور ہوں۔ جب تک لڑکی رہا نہیں ہو جاتی اور طیارہ مع عملے کے تمہیں چھوڑ کر بعافیت واپس نہیں آجاتا میرے لئے تمہیں زندہ رکھنا از حد ضروری ہے۔ اب اس سے زیادہ میری بد بختی اور کیا ہوگی کہ اس مشن کی نگرانی مجھے ہی سونپی گئی ہے۔ اس طرح میں جو تمہارے خون کا پیاسا ہوں اب تمہارا ہی محافظ بن گیا ہوں۔'' درگاس کا قہقہہ بلند تھا۔ پھر اچانک ہی اس نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ''خیر مسٹر بریک! یہ تو آپ بھی جانتے ہیں میں نے بہت سے دشمن بنالئے ہیں۔ تمہیں ایسے جنونی اور انتہا پسند بہت سے مل جائیں گے جو لڑکی کی جان کی پروا کئے بغیر میری جان لینے پر تلے بیٹھے ہیں۔ اس لئے میرے تحفظ کے معاملے میں تمہیں بہت زیادہ چوکسی برتنی پڑیگی۔''

''میرے افسران اس خطرے سے پہلے ہی آگاہ ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے خلاف ان کے پاس بہت سی دھمکیاں پہنچ چکی ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے بحیثیت نگران میرا انتخاب کیا ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ میرے انتظامات ہمیشہ ہی فول پروف ہوتے ہیں۔ پہلا حفاظتی اقدام تو میں نے یہ کیا ہے

کہ جیل کے اندر اور باہر میں نے مسلح محافظ تعینات کر دیئے ہیں جو سادہ وردی میں ہیں۔ دوسری احتیاطی تدبیر میں یہ بھی کر رہا ہوں کہ تمہیں ملنے والا کھانا پہلے میں چیک کیا کرونگا تبھی یہ تم تک پہنچے گا۔ اس کے علاوہ ایک جھوٹی خبر یہ بھی نشر کروائی جائے گی کہ تمہیں بذریعے ہیلی کاپٹر جیل سے ہوائی اڈے پہنچایا جائے گا۔ اتنا ہی نہیں لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے واقعی ایک ہیلی کاپٹر جیل سے پرواز کر کے ہوائی اڈے پر پہنچے گا جبکہ حقیقتاً تم بلٹ پروف کاروں کے ایک قافلے کے ساتھ ہوائی اڈے پہچائے جاؤ گے۔ اور جب تم ہیتھرو ہوائی اڈے پر کار سے اتر کر ہوائی جہاز کی سیڑھیاں طئے کر رہے ہوگے۔ اس وقت مسلح محافظوں کا ایک جھرمٹ تمہیں اس طرح محصور کرے گا کہ کوئی تمہاری جھلک تک نہ دیکھ سکے گا۔ گولیاں آئینگی بھی تو محافظ انہیں اپنے اوپر لے لینگے مگر تم پر آنچ بھی نہ آنے دینگے۔ میں نے ایسے ہی نجانے کتنے انتظامات کر رکھے ہیں مجھے کامل یقین ہیکہ تم بخیریت جہاز میں داخل ہو کر کل دوپہر تک اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاؤ گے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ میری محافظت کا فریضہ ایک تجربے کار اور لائق افسر کو سونپا گیا ہے میں پکا وعدہ کرتا ہوں کہ رہائی کے بعد میرا پہلا نشانہ آپ ہی ہونگے۔" وہ مشتعل کر رہا تھا اور میں خود سے خوف کھا رہا تھا کہ اشتعال میں آ کر میں کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھوں۔ ادھر میرے ذمے اور بھی بہت سے کام تھے اس لئے وہاں مزید رکنا میں نے مناسب نہ سمجھا اور واپس چلا آیا۔

☆☆☆☆

میری کلائی کی گھڑی میں پونے نو بجے تھے اور جیل سے قیدی کی روانگی میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں وزیر اعظم کے چیف سیکریٹری مسٹر گراہم کو رپورٹ دینے کے لئے ہوائی اڈے پر کھڑی ان کی کار میں داخل ہو کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گراہم تھے تو پستہ قد مگر چہرے مہرے سے ذہین نظر آتے تھے۔ وہ ہاتھ میں خوبصورت سی چھڑی تھامے ہوئے تھے وہ مجھے دیکھتے ہی متبسم ہو کر میرے قریب تر ہو گئے۔

"بتایئے کیا رپورٹ ہے؟"۔ میں نے انہیں پہلے بری ہی خبریں سنانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کہا۔ "جیل کے آس پاس ہمارے محافظوں نے دو اجنبی افراد کو گرفتار کیا ہے ان کے قبضے سے ایک راکٹ لانچر برآمد ہوا ہے۔ وہ ہیلی کاپٹر کو نشانہ بنانے کی تاک میں تھے۔ ان کا تعلق درگاس کے مخالف گروہ سے ہے اور انہوں نے ہمارے ایک آدمی کو بری طرح مجروح کر دیا ہے۔ نصف گھنٹے قبل ایک اور بھی شخص ہوائی اڈے کے قریب گرفتار کیا گیا ہے۔ اس نے ایک مقام پر دور تک مار کرنے والی ایک رائفل چھپا رکھی تھی۔ لگتا ہے وہ کوئی فلم زدہ شہرت کا بھوکا نوجوان ہے اس سے پوچھ تاچھ جاری ہے اور ابھی اس نے اپنی زبان نہیں کھولی ہے۔"

اب اچھی خبر میں نے انہیں یہ سنائی کہ۔ "کاروں کا قافلہ بحفاظت ہوائی اڈے پر پہنچ چکا ہے اور درگاس کو وہاں اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ محفوظ ہے۔"

دفعتاً ہم دونوں نے ہی اپنی نگاہیں ہوائی اڈے پر مرکوز کر دیں۔ آگے بڑھتا ہوا کاروں کا قافلہ رن وے پر جام طیارے کے قریب پہنچ کر رک گیا تھا۔ پھر جیسے ہی ایک کار سے درگاس نمودار ہوا چوکنا اور چوکس مسلح محافظوں نے اسے فوراً ہی اپنے نرغے میں لے لیا اور اب وہ اسے جہاز کی

سیڑھیوں کے پاس لئے جارہے تھے۔

''اب سنگین صورتحال کے سنسنی خیز لمحات قریب آ چکے ہیں۔'' گراہم نے کہا۔ تبھی جہاز کا دروازہ کھلا اور اس میں ایک میانہ قد کا دہشت گرد جس کے ہاتھ میں گن مشین تھی آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے نیچے کھڑے محافظ دستے اور وہاں موجود سبھی افراد کا بغور جائزہ لیا۔ اب باقاعدہ طور پر تبادلے کی کاروائی کے نازک ترین سنگین اور پرخطر لمحات کا آغاز ہونے جارہا تھا۔ اندازے کی ذراسی غلطی ذراسی بے احتیاطی اور ذراسی بدگمانی خون خرابے کی شکل اختیار کر سکتی تھی جس سے لڑکی کی رہائی کا منصوبہ ناکام ہوسکتا تھا۔ میں جانتا تھا یہ دہشت گرد خونخوار بھیڑیئے تھے اور خون خرابہ انکا دلچسپ ترین مشغلہ تھا۔ لہذا یہ نازک ترین لمحات میرے اعصاب پراثر انداز ہورہے تھے اور غیر یقینی اگلے لمحوں کے تصور نے میرے دل کی ڈھڑکنوں میں اضافہ کیا ہوا تھا۔ مجھے کان بجنے سے محسوس ہورہے تھے۔

جہاز کے کھلے دروازے میں کھڑا دہشت گرد غالباً مطمئن ہو چکا تھا۔ اسنے پیچھے مڑکر کسی کو اشارہ کیا جس کے نتیجے میں ایک سنہرے بالوں والی یورپین عورت اور ایک گھٹے ہوئے جسم کا لیشین مرد دونوں ہاتھوں میں بارودی ہینڈ گرنیڈ تھامے دروازے پر آ کر کھڑے ہو گئے ان دونوں کے درمیان ایک بارہ سالہ بچی سہمی سی کھڑی تھی۔ ہیتھرو ہوائی اڈے پر موجود اس وقت سبھی افراد پر جیسے سناٹے کی کیفیت طاری ہوچکی تھی۔ سبھی کے دل دھڑک رہے تھے۔ تبادلے کے عملی عمل کا آغاز ہو چکا تھا جسے انجام تک پہچانے کے لئے درگاس اور لڑکی دونوں ہی ایک دوسرے کے قریب سے ہوکر سیڑھی پر سے گذر گئے اور جیسے ہی درگاس جہاز کے اندر داخل ہوا فوراً دروازہ بند کر دیا گیا۔ ادھر جیسے ہی لڑکی نے رن وے پر قدم رکھا محافظ دستے نے اسے اپنی تحویل میں لے کر بحفاظت اسے وہاں سے دور بھیجدیا۔ اب کوئی مسئلہ نہیں تھا لہذا طیارے کا محاصرہ توڑ کر محافظ دستے کو واپسی کا حکم دے دیا گیا۔ دفعتاً جہاز کا انجن گھڑگھڑا اٹھا۔ پھر وہ رن وے پر دوڑ لگا کر اور فضا میں بتدریج بلند ہوکر سب کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

گراہم کی توجہ جہاز سے ہٹی تو انہوں نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ ہمارا مشن کامیاب ہوا اور لڑکی کو بحفاظت رہا کرالیا گیا لیکن ذاتی طور پر مجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ ہمارے جال میں پھنسا وہ وحشی درندہ پھر سے آزاد ہو گیا اب یہ سفاک قاتل نہ جانے کتنے معصوموں کو ان کے جینے کے حق سے محروم کر دئے گا۔''

''فکر نہ کیجئے وہ اب ایسا کچھ نہیں کریگا۔''

''اچھا تو وہ آپ کا کہنا ماننے لگا ہے۔ گراہم نے طنز کہا۔ کیا آپ اس کے بڑے بھائی بن گئے ہیں۔؟'' میں ے کہا۔ ''نہیں'' انہوں نے کہا۔

''تو پھر یہ بات تم کس طرح کہہ سکتے ہو۔؟'' میں نے کہا۔

''اس طرح کہ بغیر سردار کے اس کا گروہ کم زور پڑ جائے گا پھر ان پر قبضہ حاصل کرنا ہمیں آسان ہو جائے گا۔''

''درگاس کے بغیر؟۔'' گراہم نے حیرت زدہ ہوکر کہا۔ ''جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو۔؟۔''

''یہی کہ اب درگاس دنیا میں زندہ نہیں رہے گا۔''

''کیا اسے بددعا دیدی ہے۔؟ گراہم کا لہجہ سراسر طنزیہ تھا۔

''نہیں میں نے اسے زہر دے دیا ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔؟''۔ گراہم نے میرا بازو تھام کر مجھے جھنجھوڑ دیا تھا۔

''میں نے درگاس کے کھانے میں ملا کر اسے ایسا زہر دیا ہے جو بیس گھنٹے کے بعد یک بیک اثر انداز ہو کر اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''مگر ہمارے منصوبے میں تو زہر شامل نہیں تھا۔؟''

''نہیں تھا۔ اسے میں نے اپنی مرضی سے زہر دیا ہے۔''

''واہ! تم نے تو کمال کر دیا۔'' گراہم جوش مسرت سے بے قابو ہوا ٹھے تھے۔

''لڑکی بھی رہا کرالی اور دہشت گردوں کے سرغنہ کو بھی نہ چھوڑا۔ اسی کو تو کہتے ہیں ایک پنتھ دو کاج۔ تم نے تن تنہا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ میری سفارش پر تمہیں نہ صرف ملازمت میں ترقی ملے گی بلکہ سرکاری انعام واکرام سے مالا مال بھی کر دیا جائے گا میں تمہیں ایک ہفتے کی چھٹی دیتا ہوں۔ تھک گئے ہو گئے اب اچھی طرح گھر میں رہ کر آرام کرو۔''

تیسرے دن مجھے سرکاری میمو ملی جس میں لکھا تھا۔

تم انتہائی غیر ذمے دار انسان ہونے کے سبب سرکاری ملازمت کے اہل نہیں ہو لہذا تمہیں سرکاری ملازمت سے برطرف کیا جاتا ہے۔

☆......فیودور دوستوئیفسکی
☆......رفیق شاہین

(اس کا احساس ہی اس کی جان کا دشمن بن گیا المیہ روسی کہانی)

پر ٹوٹ گئے پروانے کے

ایک ہی عمارت کے چوتھے مالے کی ایک ہی چھت کے نیچے دو دوست ''واسیا'' اور ''ارکاشا'' اقامت پذیر تھے۔ وہ دنوں ہی یتیم تھے۔ ان کی دوستی بے مثال تھی اور وہ آپس میں دو جسم ایک جان تھے۔

آج رات بارہ بجے سے نئے سال کی شروعات ہونے جا رہی تھی۔ شام کے پانچ بجے کے بعد جب واسیا گھر واپس آیا تو وہ شہری طرز کا فیشن ایبل فراک کوٹ زیب تن کئے ہوئے تھا جس کے نیچے سے اس کی سفید رنگ کی بے داغ قمیض چمک رہی تھی۔ بستر پر دراز ارکاشا نے اس کی اس خوشگوار تبدیلی سے متجسس ہو کر سوچا۔ ''آخر یہ کہاں گیا ہوگا جبکہ دوپہر میں یہ کھانے پر بھی غیر حاضر تھا۔'' اس کے اصرار پر واسیا نے بتایا کہ وہ اپنی شادی کی بات پکی کرنے گیا تھا۔ اتنا سنتے ہی ارکاشا جوش میں آ گیا۔ اس نے فوراً ہی واسیا کو گود میں اٹھا لیا اور اس کے چہرے پر دوستانہ بوسوں کی جھڑی لگا دی۔ پھر اسے کرسی پر بٹھا کر اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''اب ذرا جلدی سے یہ بتاؤ کہ ہماری ہونے والی بھابی کا نام کیا ہے؟''

''لزانگا'' واسیا نے جواب دیا اور ارکاشا کی اس شکایت پر کہ یہ بات اس نے اپنے دوست سے کیوں چھپا کر رکھی اس نے اس کی اس بات کا مفصل اور واضح جواب ان الفاظ میں دیا۔

''دوست! میری خاموشی کی اصل وجہ یہ بھی کہ حالات بڑے غیر یقینی تھے۔ وہ ایک سال سے اپنے منگیتر سے منسوب تھی۔ ایک دن اس کا منگیتر بغیر کچھ کہے سنے کہیں غائب ہو گیا۔ پھر کچھ دن کے بعد اس کے خطوط بھی آئے لیکن یہ مکتوب نگاری کا سلسلہ بھی کچھ دن چل کر ختم ہو گیا اور وہ منظر سے خارج ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گیا۔ اس کے اس رویے پر سبھی حیران رہ گئے۔ انہوں نے اس کی واپسی کا بہت انتظار کیا۔ پھر گمشدگی کے چوتھے ماہ قطعاً غیر متوقع طور پر وہ عالم ظہور میں آ گیا۔ اور اس کا ظہور کچھ اس طرح ہوا کہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کی نوخیز دلہن بھی اس کے ساتھ تھی اور اس نے پھر کبھی لزانکا کے مکان کی دہلیز پر قدم نہیں رکھا۔ اس غریب لڑکی کا دل فرط الم سے چکنا چور ہو گیا۔ وہ بہت روئی کہ وہاں پہنچ کر میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ ویسے بھی اپنے دل ہی دل میں اسے میں بہت چاہتا تھا۔ میں نے اسے تسلی دلائی اور ہر ممکن طریقے پر اس کی دلجوئی کی اور اس کے دکھ درد سے متاثر ہو کر لڑکی کے ساتھ خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور روتے روتے اسے بتا دیا کہ میں اس سے دلی محبت کرتا ہوں۔ میں نے اپنے حالات بھی اسے بتا دیئے۔ اس پر اس نے بغور میرے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر میرے شانے پر سر رکھ کر کہنے لگی۔

''واسیا مجھے بھی تم سے محبت ہے۔ میں تمہاری محبت قبول کرتی ہوں۔ مگر اتنا خیال رکھنا کہ مجھے دھوکہ نہ دینا میں بغیر باپ کی بے آسرا غریب اور مظلوم لڑکی ہوں''

''تو دیکھا تم نے کس طرح حالات نے ہمیں محبت کے رشتے باندھ دیا ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ کیوں نہ اس معاملے میں اس کی مما کی رضامندی حاصل کرلی جائے۔ اس پر اس نے مجھے یہ کہہ کر روک دیا کہ منگنی ٹوٹ جانے پر ماں کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے اس لئے تھوڑا انتظار کیا جائے مگر میں نے اس کی بات نہ مانی اور ان سے اپنا دلی مدعا بیان کر دیا اس کے بعد میں اور لزانکا ان کے آگے دوزانو ہوکر بیٹھ گئے اور مما نے ہم دونوں کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس رشتے کو منظوری دیدی۔

''ارکاشا! شادی کے بعد بھی ہم اسی طرح ایک ساتھ رہیں گے۔ زندگی کے سبھی دکھ سکھ مل جل کر بانٹینگے اور زندگی میں کبھی جدا نہیں ہونگے۔ ارکاشا خدا کے لئے خاموش نہ رہو۔ مجھے بتاؤ کیا تم بھی ایسا ہی سوچتے ہو؟ میرا دل بہت کمزور ہے۔ بہت حساس ہوں میں۔ میں اپنوں کی قربت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہم یتیم ہیں۔ غریب ہیں مگر ایک ساتھ رہ کر دنیا بھر کی خوشیاں اپنے دامن میں سمیٹ سکتے ہیں۔ پھر غم تو کیا غم کی پرچھائیں بھی ہم پر نہ پڑیگی۔''

''واسیا! مجھے غلط مت سمجھنا'' ارکاشا نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھ نہیں پارہا ہوں تم ازدواجی زندگی کی گاڑی چلاؤ گے کیسے؟ یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ تمہاری شادی سے میں کتنا خوش ہوں مگر یہ بھی تو بتاؤ گھریلو اخراجات پورے کیسے ہونگے۔؟''

''ارکاشا! یہ تم کیا پوچھ رہے ہو؟''۔ واسیا نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ''میں نے مما سے کچھ نہیں چھپایا انہیں اپنے سارے حالات بتادیئے ہیں۔ انہیں تو کوئی اعتراض نہ ہوا۔ اصل میں ان کے معاشی حالات بہت ہی ابتر ہیں، مرحوم شوہر کی معمولی پینشن میں ہی ان کی گذر بسر ہوتی ہے۔ گھر میں تین ہی فرد ہیں۔ یہ تیسرا فرد لزانکا کا چھوٹا بھائی ہے۔ ان کی آمدنی کا ایک حصہ تو اس کے اسکول کی فیس میں ہی چلا جاتا ہے جبکہ انکی کل آمدنی پانچ سو صرف پانچ سو روبل سالانہ ہے۔ تم تو بلا وجہ ہی پریشان ہوا ارکاشا!۔ ہم لوگ تو ان کی نظر میں امیروں جیسے ہیں۔ ہماری آمدنی سات سو روبل سالانہ تو ہے ہی۔ کیا نہیں؟ تم پریشان نہ ہوا ارکاشا! سب ٹھیک ٹھاک ہے۔''

پیتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔'' ارکاشا بدستور سنجیدہ تھا۔ ''کیا تم بھول گئے کہ تمہاری سالانہ آمدنی صرف تین سو روبل سالانہ ہے۔''

اور پارٹ ٹائم جاب؟۔ واسیا پرجوش تھا اس نے یاد دلایا۔ ''کیا مستکوچ کو بھول گئے؟''

''مستکوچ مانا کہ ایک نیک اور ہمدرد انسان ہے مگر اس پر تکیہ کرنا غلط ہوگا۔'' ارکاشا نے بحث کی۔ ''میں یوں بھی اس کی عزت کرتا ہوں کہ وہ تمہارا قدرداں ہے اور کیوں نہ ہو سارے پیٹرس برگ میں خطاطی کے فن میں تمہارا جواب نہیں ہے۔ وہ تمہیں کتابت کے کام کا معاوضہ پیش کرتا ہے مگر کل وہ تم سے ناخوش بھی ہوسکتا ہے۔ وہ یہ کام چھوڑ کر کوئی دوسرا کام شروع کرسکتا ہے۔ اس کا کام ٹھپ بھی ہوسکتا ہے۔''

''تم تو بلا وجہ پریشان ہورہے ہوارکاشا!''۔ واسیا نے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''غور سے سنو! میں اس کا کام بڑی لگن مستعدی اور تن دہی کے ساتھ انجام دیا

کرتا ہوں۔ وہ میرا مطیع ہے۔ فیاض اور دریا دل بھی ہے۔ اس نے میرے کام سے خوش ہو کر مجھے پچاس چاندی کے روبل دیئے ہیں۔ اور جانتے ہو وہ کیا بولا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''تمہیں پانچ مہینے سے کچھ نہیں ملا۔ آخر محنت سے کتابت کرتے ہو۔ لو یہ پچاس روبل اپنے پاس رکھ لو'' اس کی مہربانی پر میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔''

''واسیا کیا تم نے اس کا مسودہ کتابت کر دیا تھا۔؟'' ارکاشا نے پوچھا۔

''ابھی تو نہیں کیا۔ دو دن باقی ہیں کر دونگا۔''

''تم کام نبٹانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے جبکہ تم شادی کا ارادہ بھی رکھتے ہو۔''

''کونسی قیامت آ گئی۔'' واسیا نے کہا۔ ''کر لونگا بابا کر لونگا۔ ناراض نہ ہو۔ ابھی بیٹھک جماتا ہوں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے واسیا! کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ کام سے غفلت اچھی بات نہیں ہے۔''

''تم فکرمند نہ ہو۔ آج ساری رات اور کل ساری رات جم کر کتابت کرونگا اور کام ختم۔''

ارکاشا بستر پر دراز ہو گیا اور واسیا نے بیٹھک جمالی۔ مگر اس کا دماغ کام سے اچاٹ تھا۔ وہ بار بار قلم بدلتا کھکھارتا کرسی کھسکاتا اور ارکاشا کی طرف دیکھنے لگتا اور پھر جب یہ دیکھتا کہ ارکاشا کی نگاہیں اسی پر مرکوز ہیں تو جھنپ کر قلم کو حرکت میں لے آتا۔ دراصل شادی کی خوشی کے ہنگامی جذبات اس کی ذہنی یکسوئی پر اثر انداز ہو رہے تھے۔

''واسیا! میں دیکھ رہا ہوں تمہارا دماغ کام میں نہیں کہیں اور ہے تم سب باتیں بھول کر کام پر توجہ دو۔''

''میں نے کہا نا میں ساری رات کام کرونگا۔''

''نہیں کرو گے۔'' ارکاشا نے کہا۔ ''رات میں تم سو جاؤ گے۔ خیر! تم اس وقت سو جاؤ میں تمہیں آٹھ بجے جگا دونگا۔ کل نئے سال کی چھٹی ہے۔ سارے دن جم کر کام کرنا اور جو بچ رہے اسے رات کو مکمل کر لینا۔''

''ارکاشا! ایک بات کہوں؟ واسیا نے بڑے پر اُمید لہجے میں کہا۔ ''چلو باہر چلتے ہیں۔ بازار میں لزانکا کے لئے نئے سال کا تحفہ خریدنا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم لوگ اسے یہ آج ہی دے آئیں۔''

''مگر وقت بھی تو ضائع ہوگا۔'' ارکاشا نے کہا۔ ''خیر اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو ایسا ہی سہی۔''

''کوئی وقت ضائع نہ ہوگا۔ ہم نئے سال کے آغاز کا انتظار نہیں کریں گے اور بارہ بجنے سے پہلے ہی تحفہ دیکر واپس چلے آئیں گے۔''

''واسیا ہم لوگ یتیم ہیں ہمارا کوئی نہیں ہے جسکے ساتھ ہم نئے سال کی خوشیاں بانٹ سکیں اگر وہاں جا کر تمہیں خوشی ملتی ہے تو پھر چلے چلتے ہیں۔''

فراک کوٹ زیب تن کرنے اور تیار ہونے میں ارکاشا کو تین منٹ بھی نہیں لگے جبکہ خوشی کے نشے میں چور واسیا نے ابھی اپنا کوٹ اتارا ہی نہیں تھا۔

اب دونوں ہی دوست پیٹرس برگ کے علاقے ''کولومنا'' کی طرف بڑھتے ہی چلے جا رہے

تھے۔ ارکاشا جس کا دل واسویا کی خوشی سے لبریز ہو کر خود بھی سرشار ہوا اٹھا تھا تیز رفتار قدموں سے راستہ طئے کر رہا تھا جبکہ واسیا کو اس کا ساتھ نبھانے میں دوڑنا پڑ رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں چھوٹی اور شانے ناہموار تھے اور اس کی اس ہیئت کذائی کو دیکھ کر ارکاشا اکثر ہی غمگین ہو جایا کرتا تھا۔

بازار کی ایک دوکان سے انہوں نے رنگارنگ مخمل سے بنا ایک خوبصورت زنانہ بونیٹ (BONNET) خرید کر پیک کرایا اور امنگوں بھرا دل لئے خوشی خوشی لزانکا کے مکان پر پہنچ گئے۔

میزبان لوگ ان کا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو چلے تھے۔ لزانکا نے تو اداس ہو کر کہہ بھی دیا تھا لگتا ہے وہ لوگ نہیں آئیں گے۔ مگر مما کا کہنا تھا ضرور آئیں گے۔

اتفاق سے دروازہ لزانکا نے ہی کھولا۔ اچانک ہی ان لوگوں کو نگاہوں کے سامنے موجود پا کر لزانکا کا چہرا خوشی سے کھل اٹھا۔ ''آ و بے مروت'' کہہ کر لزانکا نے واسیا کو گلے سے لگالیا۔ پھر وہ متجسس نگاہوں سے ارکاشا کی طرف دیکھنے لگی۔

''اسے آپ اتنے غور سے کیا دیکھ رہی ہیں۔'' واسیا نے اس سے اپنے دوست کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''یہ ارکاشا ہے۔ میرا اکلوتا اور چہیتا دوست۔ میرا بھائی میری ماں میرا باپ سب کچھ اب یہی ہے۔'' لزانکا نے آگے بڑھ کر اسے بھی اپنی چھاتی کے ساتھ چپکالیا اور اس کی پیشانی کو بوسے دینے لگی۔ لزانکا نے اندر کمرے میں پہنچ کر ارکاشا سے ملاقات پر اپنی خوشی کا بھرپور اظہار کیا۔ اس نے ارکاشا کے متعلق واسیا سے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہ خوشی کے اظہار میں کھوئی ہوئی تھی کہ تبھی اس کی نظر تحفے پڑ گئی اور وہ اس خوبصورت ''بونیٹ'' کی تعریف میں بہت کچھ کہہ کر اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتی رہی یہاں تک خوشی آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے چھلک پڑی اور ان آنسوؤں کی نمی کو بونیٹ نے اپنے اندر جذب کر لیا۔ واسیا لزانکا کے پہلو سے سٹ کر بیٹھا ہوا تھا جبکہ ارکاشا کی نشست مما کے پہلو میں تھی۔ بات چیت کا سلسلہ چل پڑا تھا۔ ارکاشا جو فطرتاً کم گو تھا خوشی کے نشے میں مخمور اس وقت لگاتار بولے چلا جا رہا تھا۔ اس کا اول موضوع تو واسیا ہی تھا جب وہ اس کے بارے میں کافی کچھ کہہ چکا تو پھر وہ واسیا کے محسن ''یولین مستکوچ'' اور اس کی فیاضی کے افسانے سنانے لگا اور اس ایک گھنٹے کی ملاقات میں اسنے گفتگو میں کمی یا ٹوٹ نہیں پڑنے دی۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں مما پر یہ بھی واضح کر دیا کہ واسیا کے پاس وقت کم ہے کیونکہ اسے اپنے محسن پاس کا کام وقت پر تیار کر کے دینا ہے۔ مما اس کی دلچسپ باتوں کی جادونگری میں گم ہو کر رہ گئی تھیں انہوں نے واسیا سے کہا۔ ''سچ مچ ہی تم بڑے خوش نصیب ہو کہ تمہیں ارکاشا جیسا نیک مخلص دردمند اور وفادار دوست ملا ہے۔ یہ واقعی بڑا دلچسپ اور شاندار نوجوان ہے۔'' واسیا اپنے دوست کی تعریف سن کر خوشی سے ہنستا اور قہقہے لگاتا رہا۔ اس کے بعد مما واسیا کو بہانے سے دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ وہاں انہوں نے اسے ایک خوبصورت بٹوہ دکھایا جس پر سنہری دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی اور اس پر جابجا موتی اور ستارے ٹکے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا یہ نئے سال کے موقعے پر اسے پیش کیا جانے والا تحفہ ہے اور اسے لزانکا تیار کر رہی ہے۔ یہ سن کر تو واسیا خوشی کے ساتویں آسمان پر ہی پہنچ گیا۔

دوسرے کمرے میں لزانکا ارکاشا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے اسے شکر و عقیدت کی

نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ارکاشا کی شفقت و محبت اور دلداری و وفاداری کے بارے میں واسیا سے اب تک وہ بہت کچھ سنتی رہی تھی۔ وہ واسیا سے ارکاشا کا پیار دیکھ کر جذباتی ہو اٹھی تھی۔ وہ ارکاشا سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر بے بس تھی کہ اپنی محبت و عقیدت کے سمندر کو الفاظ کے کوزے میں سمیٹنے کا ہنر اسے نہیں آتا تھا پھر بھی اس نے اس کا بار بار شکریہ ادا کیا اور بڑے عزم و حوصلے کے ساتھ کہا۔

''ہم سبھی ایک ساتھ رہیں گے۔ کبھی جدا نہ ہونگے۔ میں واسیا کی صحت کا ہر حال میں خیال رکھونگی اور ہم تینوں تین قالب اور ایک روح بن کر رہیں گے۔'' اتنا کہہ کر اس کے جذبات بڑی طرح مشتعل ہو اٹھے اور وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ پھر دونوں جانے کے خیال سے جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ارکاشا نے انہیں بتایا کہ واسیا کو اپنے باس کا دیا کام مکمل کر کے پرسوں سویرے ہی پیش کرنا ہے۔ اہم کام ہے جسے مقررہ وقت پر کر کے دینا ضروری ہے لہذا اجازت دی جائے۔ یہ سن کر ممانے سرد آہ بھری اور لزانکا تو یوں چونک پڑی جیسے اسے کسی نے گہری نیند سے جگا دیا ہو۔ اس کے زرد چہرے پر قلابازیاں کھاتی ہوئی اداسیاں صاف طور پر دیکھی جا سکتی تھیں۔ بہر کیف دونوں ماں بیٹی انہیں دروازے تک چھوڑنے آئیں اور لزانکا کے وداعی بوسوں کے ذائقے کے ساتھ ہی وہ دونوں سڑک پر پہنچ گئے۔

گھر کی طرف قدم بڑھاتے وقت دونوں کے چہرے خوشی سے تمتماتے ہوئے تھے۔ دونوں ہی خوشی سے لبریز خاموشی کی جھیل میں غواصی کے عمل سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ایکا ایکی ارکاشا نے خاموشی کے طلسم کو پارہ پارہ کر دیا۔

''کیا تم میرے خیالات سے واقف ہو واسیا؟ ہاں میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں جیسی کہ محبت میں تم سے کرتا ہوں اسے حق حاصل ہوگا کہ وہ یکساں طور پر ہم دونوں پر راج کرے۔ تم سے جو میری دوستی ہے پیار ہے وہی اس سے بھی ہوگا۔ اب تم دونوں ہی میرے وجود کا ایک حصہ بن چکے ہو جس سے علاحدگی کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ارکاشا کی باتیں واسیا کی روح کو گدگدا رہی تھیں۔ وہ کم آمیز تھا جس کی خوابوں سے کوئی دوستی نہیں تھی لیکن اس وقت وہ بول بھی رہا تھا اور جنت نظیر خواب زاروں کی سیر سے بھی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے خوابوں کا منظر نامہ دور تک دراز تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں تم دونوں کی دیکھ بھال میں کبھی کوئی کسر باقی نہ چھوڑونگا۔ میں تمہارے بچوں کی نگہداشت بھی اس طرح کرونگا جس طرح کہ ایک گاڈ فادر یا کوئی سرپرست کیا کرتا ہے۔ واسیا! اب ہمیں پیسہ کمانا ہوگا۔ تین کمرے کا نہیں تو دو کمرے کا مکان تو ہم ضرور کرائے پر لینگے۔ تھوڑا نیا فرنیچر بھی خریدیں گے۔ پچیس روبل ماہانہ میں خاصہ مکان مل جائے گا جس میں لزانکا آرام سے رہے گی۔ ہم جم کر محنت کریں گے اور پیسہ پیسہ بچا کر رکھینگے۔

واسیا ارکاشا کی سہانی باتوں میں کھویا ہوا چلا جا رہا تھا کہ ناگاہ اسے لگا کسی نے اس کے دل میں زور سے چٹکی بھر لی ہے۔ زور کی ایک ٹیس کے ساتھ ہی اس کے آگے بڑھتے قدم جام ہو کر رہ گئے اور وہ لڑکھڑ گیا۔ ارکاشا نے اسے چونک کر دیکھا اور گھبرا اُٹھا۔ ''کیا ہوا؟ کیا ہوا واسیا! تم خیریت سے تو ہو۔؟'' واسیا کے لئے فوری طور پر جواب دینا ممکن نہ تھا۔ اس پر ارکاشا خود ہی بول پڑا۔

''مجھے معلوم ہے واسیا تمہاری یہ حالت کام کے دباؤ کی وجہ سے ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ تم ایک تیز

رفتار کاتب ہو۔ کام آرام سے پورا ہو جائے گا۔ پریشان مت ہو۔''
گھر پہنچتے ہی واسیا کام لے کر بیٹھ گیا۔ ارکاشا جس کا جوش اب ٹھنڈا پڑ گیا تھا لباس تبدیل کر کے بستر پر دراز ہو گیا اور واسیا پر نظریں مرتکز کر دیں۔ ''آخر اسے کیا پریشانی ہے۔؟'' ارکاشا نے سوچا۔ 'چہرہ ٹمٹمایا ہوا، آنکھوں میں خوف یہ تو عجیب سی اضطراری کیفیت میں نظر آرہا ہے۔ اس کے تو ہاتھ بھی کانپ رہے ہیں۔ کیا اسے تھوڑی دیر کے لئے آرام کرنے دیا جائے۔؟'' واسیا کا ایک صفحہ مکمل ہو گیا تھا اس نے ایک نظر ارکاشا کی طرف دیکھا اور پھر سے قلم متحرک کر کے اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔
''واسیا! تم تھوڑ دیر آرام کرلو۔'' ارکاشا نے کہا۔ ''لگتا ہے تمہیں بخار چڑھا ہے۔'' واسیا نے جھلا کر ایک نگاہ ارکاشا کی طرف دیکاھ مگر کچھ کہا نہیں۔
''واسیا! کیوں نہ ہم چائے کا وقفہ رکھ لیں۔ نیند کا غلبہ دور ہو جائے گا۔'' ارکاشا نے کہا۔
''ٹھیک ہے چائے کا وقفہ میرے لئے کافی ہوگا۔ مگر مجھے سونے کا مشورہ نہ دینا میں ساری رات جاگ کر کام کرنے کا تہیہ کر چکا ہوں۔''
''ٹھیک ہے تو پھر۔ ''ماروا'' تو جاگنے والی نہیں ہے۔ تم بیٹھو تمہارے لئے چائے بنا کر میں لاتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر ارکاشا رسوئی گھر میں گھس گیا جہاں چائے ک سماوار تیار کرنے میں اسے پندرہ منٹ لگ گئے اس دوران واسیا اپنے کام میں مشغول رہا پھر دونوں ہی چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔ واسیا جو کھویا کھویا سا نظر آرہا تھا ارکاشا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کل نئے سال کی مبارکباد دینے کے لئے میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔'' ارکاشا نے فوراً ہی کہا۔ کوئی ضرورت نہیں ہے جانے کی۔''
''نہیں بڑے بھائی مجھے نہ روکو میں جاؤنگا۔''
''تم کل گھر پر ہی رہو اور جم کر اپنا کام کرو۔ میں صبح پانچ بجے تمہیں جگا دونگا اور کہو تو ٹھیک آٹھ بجے میں تمہیں اٹھا دوں۔ تم اب آرام کرلو۔ اور مجھے یہ تو دکھاؤ اب تک تم کتنا کام کر چکے ہو۔؟ یہ جانے بغیر میں سو نہ سکونگا۔'' اس پر واسیا نے جن نگاہوں سے ارکاشا کو دیکھا وہ ایسی تھیں کہ ارکاشا کانپ کر رہ گیا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ واسیا اس سے کیا کہنا چاہتا ہے۔
''واسیا! کیوں ایسی نظروں سے دیکھتے ہو۔ بتاؤ نا کیا کہنا چاہتے ہو۔؟'' ارکاشا نے پوچھا۔
''ارکاشا مجھے وہاں جا کر مستکوچ کو نئے سال کی مبارکباد پیش کرنی چاہیئے۔'' اس نے کہا۔
''ٹھیک ہے چلے جانا۔'' ارکاشا نے بڑے تردد اور تذبذب کے عالم میں کہا۔
''میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں واسیا! کہ میں تم سے کہوں تو کیا کیوں۔ تم اپنی عجیب وغریب اور مایوس کن حالت سے مجھے مارے ڈال رہے ہو۔''
''فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔'' واسیا نے ارکاشا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ 'میرے اوپر اُداسی کا دباؤ بنا ہوا ہے اور ایسا کیوں ہے اس سے میں خود بھی ناواقف ہوں۔ آپ کوئی اور بات کرو اور مجھے بار بار کام کی یاد مت دلاؤ۔''
''سمبھالو واسیا اپنے آپ کو سمبھالو۔ کام مکمل ہو جائے گا اور اگر کسی وجہ ادھورا بھی رہ جائے تو یہ کوئی سنگین جرم تو نہیں ہے۔ تم کیوں خود کو ہلاک کرنے پر تلے ہوئے ہو۔؟''

''ارکا شا میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟ میں یہ کبھی برداشت نہیں کرسکتا کہ اپنے محسن اعلیٰ کے احسان کا بدلہ ناشکری سے چکاؤں۔ حکم عدولی کروں اور ان کی توقعات پر پانی پھیر دوں۔ ایک غفلت شعار اور غیر ذمے دار انسان کی شکل میں انکے سامنے جا کر کھڑا ہو جاؤں۔ یہی سوچ یہی فکر اور یہی خوف میری جان لئے لے رہا ہے۔'' اتنا کہہ کر واسیا کا گلا رندھ گیا۔

''واسیا! تم وقت پر کام دے پاتے ہو یا نہیں اس کا ناشکری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سوچو واسیا۔''

''ٹھیک ہے'' واسیا نے بحث سے بچنے کے لئے کہا۔ ''میں کام کرتا ہوں تم دھیان رکھنا کہیں میں سو نہ جاؤں۔''

واسیا اپنے کام میں مشغول ہو گیا اور ارکا شا اپنے بستر پر چلا گیا اور بات کرنے کی کوشش ان میں سے کسی نے بھی نہیں کی۔ واسیا کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتے ہوئے بالآخر وہ اسی حالت میں سو گیا۔ پھر صبح ساڑھے سات بجے جب وہ نیند سے بیدار ہوا اس نے دیکھا واسیا کرسی میں دھنسا گہری نیند سویا پڑا تھا۔ اس کا چہرہ تھکن سے زرد تھا۔ موم بتی روشن تھی اور وہ اب بھی ہاتھ میں قلم تھامے ہوئے تھا۔

رسوئی گھر میں پانی کھولنے کی آواز باہر بھی سنائی دے رہی تھی۔ شاید مار وا چائے کا سماوار تیار کرنے میں مصروف تھی۔ ''واسیا! واسیا! تم کب سو گئے۔'' ارکا شا نے اسے جھنجھوڑ دیا۔

''واسیا اُچھل پڑا اور گھبرائی ہوئی خوف زدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''توبہ ہے۔'' واسیا نے آہ بھر کر کہا۔ ''مجھے صبح چھ بجے نیند نے دبوچ لیا تھا۔ ہوا میں خنکی ہے بہتر ہے چائے پی کر گرم ہولیں اسکے بعد پھر سے کام میں لگ جاؤں گا۔''

''کیا کچھ حالت بہتر ہوئی۔؟'' واسیا نے جواب دیا۔ ''ہاں کچھ کچھ افاقہ ہے۔'' ارکا شا نے مسکرا کر کہا۔

''واسیا تمہیں نیا سال مبارک ہو۔'' واسیا نے بھی وہی الفاظ دہرا دیئے۔ ''اور تمہیں بھی مبارک ہو'' اور اس کے ساتھ ہی کھڑے ہو کر وہ آپس میں بغلگیر ہو گئے۔ واسیا کی آنکھ کے آنسو ارگا شا کے شانے میں پیوست ہو گئے جنہیں دیکھنے سے ارکا شا محروم ہی رہا۔ اب دونوں کرسیوں پر بیٹھے چائے کے ذریعے بدن میں گرمی پہنچانے کی کوشش کرنے لگے۔ چائے سے فارغ ہوتے ہی ارکا شا نے کہا۔

''اب نئے سال کی مبارکباد پیش کرنے مستکوچ اور لزا نکا کے یہاں میں جاؤں گا اور تم گھر میں بیٹھ کر اپنا کام انجام دو گے۔''

''تو پھر میں لزانکا کے لئے رقعہ لکھ لوں۔؟ واسیا نے پوچھا۔

''ضرور تو میں تیار ہوتا ہوں جب تک تم لکھ کر تیار کرلو۔''

''کیا مسٹر واسیا یہیں رہتے ہیں۔؟'' زینے میں کسی بچے کی آواز سنائی پڑی۔

''ہاں۔ یہیں رہتے ہیں۔ پیارے بچے اندر آجاؤ۔'' یہ دوسری آواز خادمہ مار وا کی تھی جو بچے کو اپنے ساتھ کمرے میں لے آئی تھی۔

"پتینز کا تم؟"۔ واسیا نے جوش مسرت کا اظہار کیا۔
"میں آپ کو نئے سال کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔" نو دس سال کا پیارا سا بچہ جس کے بال گھنگھریالے تھے اور آنکھیں سیاہ جن میں اپنائیت اور محبت کی خوشی چمک رہی تھی اس نے میٹھی سی آواز میں کہا۔ "میری مما اور میری باجی نے نئے سال کی خوشی می نیک خواہشات آپ کو نذر کی ہیں اور باجی نے کہا ہے کہ میں ان کی طرف سے آپ کو بوسہ دوں۔" واسیا نے بچے کو سر سے اونچا اٹھالیا اور پھر اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ ثبت کر دیئے جو اس کی بہن کی ہی طرح خمیدہ اور خوبصورت تھے۔ پھر اس نے ارکاشا سے کہا۔ "ارکاشا اس کو پیار کرو۔" لڑکا بھاگ کر ارکاشا کی باہوں میں سما گیا۔ ارکاشا نے کہا۔ "اے پیارے خوبصورت لڑکے! کیا تم چائے پینا پسند کرو گے۔؟
"شکریہ! نہیں۔" لڑکے نے کہا۔ "میں گھر سے چائے پی کر ہی نکلا ہوں۔ بہن نے کہا تھا کہ ان کو بوسہ دینے کے بعد یہ ضرور پوچھنا کہ جو اہم کام انہیں انجام دینا تھا کیا وہ مکمل ہو گیا؟"
"تم اپنی باجی سے کہنا میں اسی کام میں لگا پڑا ہوں۔ وہ مطمئن رہیں میں جلد ہی اسے نبٹا دونگا۔"
"اور ہاں میں بھول گیا باجی نے آپ کے لئے ایک رقعہ اور ایک تحفہ بھی بھیجا ہے۔"
"تو پھر دیر کس بات کی۔" واسیا جوش مسرت سے بے قابو ہو گیا۔ "لاؤ جلدی لاؤ میرے پیارے فرشتے۔" لڑکے نے رقعہ پیش کر دیا۔ اس میں لکھا تھا بٹوہ تو بطور تحفہ اس لئے نہیں بھیجا ہے کہ ابھی اس میں کچھ کام باقی رہ گیا ہے۔ وہ بعد میں پیش کیا جائے گا۔ آپ کو اس وقت پیش کرنے کے لئے میرے پاس صرف میرے بالوں کی لٹ ہے جسے تراش کر آپ کی نذر کر رہی ہوں۔ امید ہے ایک غریب کی محبت کا یہ ادنی تحفہ قبول فرمائیں گے۔ آپ کی لزانکا۔"
"یہ تو بہت ہی پیارا اندرانہ ہے، ہم ایک لاکٹ خرید کر یہ لٹ اس میں محفوظ کرینگے۔"
ارکاش کا یہ مشورہ واسیا کو بہت اچھا لگا۔ لڑکے نے ارکاشا کے اصرار پر چائے قبول کر لی تھی۔ اس نے چائے کا آخری گھونٹ حلق کے نیچے اتار کر خالی پیالی ایک طرف رکھدی اور پھر لزانکا کے لئے واسیا کا دیا رقعہ اور اس کے بوسوں میں چھپے پیار کو اپنے ساتھ لے کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔
"کولومنا" میں جب ارکاشا لزانکا سے محو گفتگو تھا اس وقت بھی اس کا دھیان واسیا میں پڑا ہوا تھا اور کسی انجانے سے خوف و دہشت سے اس کا دل اندر ہی اندر ڈوبا جا رہا تھا۔ خوف کے سائے لزانکا کی آنکھوں میں صاف طور پر تیرتے نظر آ رہے تھے۔ آنے والی کسی مصٰبت کے احساس سے اس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ لزانکا کے گھر سے رخصت ہو کر ارکاشا پُر فضا ماحول کی نظارگی سے لطف اندوز ہونے کے ارادے سیدھا "نیوسکی" کے پل پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں کھڑے ہوئے اسے تھوڑا ہی وقت گزرا ہو گا کہ واسیا کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ ارکاشا کی نظر میں آ جانے پر واسیا جھنپ کر رہ گیا۔
"واسیا! تمہاری یہاں موجودگی اس بات کا اشاریہ ہے کہ تم لزانکا سے ملنے کولومنا جا رہے تھے۔؟" واسیا نے کہا۔ "نہیں بس سیر و تفریح کی غرض سے ادھر آ نکلا ہوں" اس پر ارکاشا نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ روہانسا ہو کر بولا۔ "مجھے نہیں معلوم ارکاشا! پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔"

''میں سب جانتا ہوں واسیا! سب جانتا ہوں۔ محبت اور شادی کی خوشی نے تمہیں بوکھلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ تم سہہ نہیں پا رہے ہو اور تمہاری یکسوئی پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ تمہیں یہ خوف بھی اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے کہ کام مکمل نہ ہونے کی صورت میں تم اپنے محسن کی نظر سے گر جاؤ گے۔ خیر یہ ساری باتیں اپنے دل سے نکال دو۔ تم اپنا کام ضرور پورا کر لو گے فکر مت کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

گھر آ کر واسیا پھر سے کام میں جٹ گیا۔ صبح ہوئی تو ماروا نے ارکاشا کو بتایا کہ واسیا ساری رات لکھتے ہی رہے ہیں۔ اس پر ارکاشا واسیا کے قریب پہنچا تو اس کی حالت دیکھ کر چونک پڑا۔ واسیا چہرے سے بیمار سا نظر آ رہا تھا۔ وہ واسیا کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا اور وہاں سے میز پر نظر ڈالی تو اسے لگا کہ اب چند صفحات کی ہی کتابت باقی بچی ہے۔ اس نے بڑے جوشیلے انداز میں واسیا کی پیٹھ ٹھونک کر اسے شاباشی دیتے ہوئے کہا۔ ''واہ میرے شیر! کیا کہنے آخر تم نے پھالہ مار ہی لیا۔'' یکا یک ہی واسیا اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگا اور روتے روتے کہنے لگا۔ ''دھوکہ دیا ہے۔ میں نے تمہیں اپنے بڑے بھائی کو دھوکہ دیا ہے۔ مجھے معاف کر دو'' پھر اس نے ڈیسک سے چھ عدد نوٹ بکس کا ڈھیر میز پر رکھ کر روتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو یہ بھی ہیں جن کی کتابت باقی ہے۔''

''کیا؟ ارکاشا کی حیرت زدہ آواز کسی نکیلے خنجر کی طرح اس کے دل میں پیوست ہو کر رہ گئی۔

''ابھی ان موٹی موٹی کاپیوں کی بھی کتابت باقی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اتنے تھوڑے وقت میں تمہیں اتنا سارا تو کام نہیں سونپا جا سکتا۔ اتنا کام تو تمہیں کافی پہلے ملا ہوگا۔''

''ہاں یہ مجھے پندرہ دن پہلے دیا گیا تھا۔ میں روزانہ لزانکا سے ملنے جاتا رہا اور کام التوا میں پڑ گیا۔'' ارکاشا نے ماتھا پیٹ لیا۔ وہ رندھے ہوئے گلے سے بڑے دردناک لہجے میں بولا۔

''واسیا تم مجھے نہیں چھوڑو گے۔ مار ڈالو گے مجھے۔ خیر تم فکر مند نہ ہو بس اب ایک ہی راستہ ہے بچنے کا میں مستکوچ کے پاس جا کر تمہاری طرف سے معافی مانگ لوں گا وہ رحم دل ہیں معاف کر دینگے۔'' اس پر واسیا کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ارکاشا کی بات سن کر وہ خوف زدہ ہوا تھا ہے اور اپنے ردعمل کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے ٹوٹے سے لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے قصور میرا ہے اس لئے معافی میں ان سے خود ہی طلب کرونگا۔'' اب تم ایسا کرو آرام سے جتنا لکھ سکو لکھو جتنا ہو جائے انہیں وہی پیش کر دینا مگر تمہیں یہ ہو کیا رہا ہے لگتا ہے رو پڑو گے۔'' واسیا سسکنے لگا۔

''دوست میں بے حد حساس ہوں اور میرا دل بہت نازک ہے میرے لئے تمہاری ضد سے زیادہ شفقت و محبت کو سہنا مشکل ہو رہا ہے۔ میں تمہاری عنایتیں اور کرم یاد کر کے راتوں کو چپکے چپکے آنسو بہاتا رہتا ہوں۔ میری ہیئت کذائی جسمانی نقائص اور ادھوری شخصیت کے باوجود بھی لوگ مجھ سے محبت سے پیش آتے ہیں۔ میرے دکھ سکھ کا خیال رکھتے ہیں میں یہ سوچ سوچ کر مرا جا رہا ہوں۔ دریائے نیوسکی کے پل پر میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ میں واقعی لزانکا سے ملنے گیا تھا مگر ملا نہیں۔ وہ پیانو بجا رہی تھی اور میں اس کے دروازے پر کھڑا سوچ رہا تھا یہ میری خود غرضی ہے کہ حقدار نہ ہو کر بھی لزانکا کی محبت کا حقدار بن بیٹھا ہوں کیا یہ بے ضمیری اور بے ایمانی نہیں میں اس کے دروازے پر کھڑا یہی سب کچھ سوچتا رہا اور دروازے سے ہی اُلٹے پیر واپس آ گیا۔'' ارکاشا نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور طرح طرح سے اس کی

دل جمعی اور دل جوئی کرتا رہا۔

صبح کے وقت واسیا کو مار وا کی دیکھ بھال میں دیکر ارکاشا مستکوچ کے آفس پہنچا مگر وہ غیر حاضر تھا۔ اس نے آفس کے کلرکوں سے پوچھا۔ "مستکوچ نے جو کام واسیا کو سونپا ہے کیا وہ اہم نوعیت کا ہے۔؟" اس پر کلرکوں نے لاعلمی کا مظاہرہ کیا تو تین بجے وہ گھر واپس آ گیا۔ واسیا کرسی میں دھنسا ہوا تھا۔ اس کے زرد چہرے اور بجھی بجھی سی آنکھیں دیکھ کر ارکاشا کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے لگا واسیا کو لقوہ مار گیا ہے۔ ارکاشا نے واسیا کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اس کی پیشانی سہلائی تو واسیا ہوش میں آ کر اس کے گلے سے لپٹ کر رونے لگا۔

رات کے وقت واسیا کو آرام کا مشورہ دے کر ارکاشا اپنے بستر پر چلا گیا اور جب آنکھ کھلنے پر اس نے ہڑبڑا کر واسیا کے بستر پر نظر ڈالی تو اسے غائب پا کر حیران رہ گیا۔ وہ لپک کر میز پر جھکے واسیا کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اسے یہ دیکھ کر زور کا جھٹکا لگا کہ واسیا روشنائی سے ساری قلم کو کاغذ پر مسلسل متحرک کئے ہوئے تھا اور اس گمان پر کہ کتابت ہو چکی وہ صفحے پلٹ کر ان پر بھی خشک قلم کو گردش دیئے چلا جا رہا تھا۔

ارکاشا پر بجلی سی گر پڑی۔ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے واسیا کے ہاتھ سے قلم چھین لیا۔ "کیا ہو گیا ہے؟ تجھے کیا ہو گیا ہے میرے بچے میرے کلیجے کے ٹکڑے۔ کیوں خودکشی کر رہے ہو؟ کیا میری جان ہی لے کر چھوڑو گے۔" واسیا نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں اور بڑبڑا اٹھا۔

"کیا جرم کیا ہے میں نے جس کی پاداش میں یہ لوگ مجھے فوج میں بھیج رہے ہیں۔"

"واسیا! واسیا! مجھے دیکھو میں تمہارا دوست ارکاشا ہوں۔ تم یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔"

"ارکاشا چلایا۔ واسیا بڑبڑائے جا رہا تھا۔" کیوں بھیجا جا رہا ہے مجھے فوج میں؟ کیوں وہ میری محبت کو میری لزانکا کو قتل کرنے پر تلے ہیں...؟"

ارکاشا اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"دوست الوداع! لزانکا الوداع! رونا دھونا بے کار ہے۔ مجھے فوج میں جانا ہی ہوگا۔" میز پر قلم بنانے والا چاقو پڑا تھا ارکاشا نے احتیاطاً اسے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور دوڑ کر گھر سے باہر نکل پڑا۔ سویرے سات بجے مریضوں میں گھرے ہوئے ڈاکٹر گھر پر جا کر مریض کو دیکھنے کے لئے کسی طور بھی رضا مند نہ تھے۔ ارکاشا نے ہمت نہ ہاری اور کسی رحمدل ڈاکٹر کے مل جانے کی امید میں جگہ جگہ مایوس ہوتا ہوا دور نکل گیا اور نو بج جانے پر بھی جب کوئی ڈاکٹر اسے نہ ملا تو لاچار ہو کر وہ گھر واپس آ گیا۔

گھر پہنچ کر اسے ایک دھکا اور لگا۔ واسیا وہاں نہیں تھا۔ ماروا نے بتایا وہ ارکاشا کے گھر چھوڑنے کے دوسرے منٹ میں ہی بنا کچھ بتائے گھر سے نکل گیا تھا۔

یہ نو کے بعد کا وقت تھا۔ سڑک پر بے تحاشہ دوڑ لگاتے ہوئے ارکاشا پسینہ پسینہ ہوا تھا اس کے دل کی رفتار بڑھی ہوئی تھی اور ذہن میں سناٹے گونج رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پتنگے ناچ رہے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آنکھوں میں خوف تھا اور ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور وہ لزانکا اور اس کی مما کے سامنے کھڑا تھا ان کے چہرے تکے جا رہا تھا۔ بدقت اس کے منہ سے آواز نکلی۔

"کیا واسیا یہاں آیا تھا۔؟"

''نہیں تو'' لزانکا کی آواز کی تھرتھراہٹ کسی تیز دھار والی چھری کی طرح اسے اپنے دل پر چلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ''کیا ہوا ہے میرے واسیا کو؟ کیا ہو گیا اسے۔ چپ کیوں ہیں؟ آخر کچھ بتاتے کیوں نہیں۔؟'' وہ بیتابی سے سوال پر سوال کئے جا رہی تھی اور وہ لب بستہ مبہوت سا کھڑا ان کے چہروں کو تکے جا رہا تھا اور وہ دونوں اس کے چہرے کو۔ یکا یک مما کے گھٹنے کانپ اٹھے اور وہ وہیں زمین پر اپنا سر تھام کر بیٹھ گئیں اور زور زور سے سانسیں لینے لگیں۔ لزانکا کا سارا بدن کانپ رہا تھا اور اس کی آنکھ کے آنسوؤں سے اس کے رخسار تر ہو چکے تھے۔ ارکاشا نے ان کی تسلی کے لئے کہہ دیا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے جس پر انہوں نے بالکل بھی یقین نہیں کیا۔ پھر وہ اچانک ہی وہاں سے پلٹ پڑا۔ لزانکا کی آوازیں اس تعاقب میں ناکام ہو چکی تھیں۔

اب اس کی دلی تمنا یہ تھی کہ کاش وہ واسیا سے پہلے دفتر پہنچنے میں کامیاب ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ معاملات بگڑنے سے پہلے ہی سنبھال لے گا۔ مستکوچ کے آفس پہنچنے کی جلدی میں اس نے اپنے قدموں کی رفتار اور بھی تیز کر دی تھی۔

جیسے ہی وہ آفس پہنچا اسے ایک اور گہرا دھکا لگا اور اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اس کے دفتر پہنچتے ہی دفتر کے سارے کلرکوں نے اسے نرغے میں لے لیا اور وہ سب اپنی اپنی زبان میں اسے بتا رہے تھے کہ واسیا پاگل ہو گیا ہے۔ اس کے دماغ میں یہ خناس بیٹھ گیا ہے کہ وہ مجرم ہے اور اسے جبراً فوج میں بھیجا جا رہا ہے۔ وہ سب کے سب واسیا کے حال زار پر کف افسوس مل رہے تھے۔ آنسو بہا رہے تھے۔ اس کے اچھے خصائل اور بہتر طور طریقوں کی تفصیل بیان کر رہے تھے۔ ساتھ ہی وہ ارکاشا سے بھی طرح طرح کے سوال کئے جا رہے تھے۔ ارکاشا ان کے سوالات کو نظر انداز کر کے مستکوچ کے چیمبر پہنچ گیا مگر دروازے پر تعینات چپراسی نے اسے اندر جانے کی اجازت نہ دی اس پر بھی وہ وہاں سے ہٹا نہیں اور وہیں کھڑا رہا۔ دروازے کے پٹ تھوڑے سے کھلے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں کے درمیان نظر دوڑائی تو وہاں اسے واسیا دکھائی پڑ گیا۔ جو مستکوچ کے سامنے فوجی سیلیوٹ دینے کے انداز میں مستعد کھڑا تھا۔ مستکوچ نے ارکاشا کو اندر بلوا لیا۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور وہ واسیا کی حالت زار کو دیکھ کر بہت متاثر اور متاسف تھے۔ ارکاشا نے ان کے ہر سوال کا تشفی بخش جواب دیا اس پر وہ اور بھی آبدیدہ ہو کر بولے۔

''بہت بُرا ہوا۔ بہت بُرا ہوا۔ ایک محنتی ایماندار اور بہت ہی پیارا شخص تباہ ہو گیا۔ برباد ہو گیا اگر کام نہیں مکمل ہوا تھا تو مجھے بتا دیتا۔ اگر کام اہم ہوتا تب بھی میں اسے کچھ نہ کہتا اور اسے اس کی کوئی مجبوری مان کر صرف نظر کر دیتا جبکہ جو کام اسے دیا تھا وہ تو بالکل بھی اہم نہ تھا۔ اس پر وقت کی پابندی بھی لازم نہ تھی۔ افسوس کہ اس کی حد سے زیادہ نیکی اور اس کا غیر معمولی حساس دل ہی اس کو لے ڈوبا۔''

اچانک ہی واسیا کی نظر ارکاشا سے ٹکرا گئی اور وہ فوراً تین قدم پیچھے کی طرف پلٹ کر اسے فوجی سیلیوٹ پیش کرتے ہوئے بولا۔

''ہز ہائینیس! جسمانی نقائص اور پست قامت ہونے کے سبب میں فوجی ملازمت کا اہل نہیں ہوں۔'' اس کے ان الفاظ سے چیمبر میں موجود سبھی کے کلیجے پھٹنے لگے۔ وہاں جتنے بھی تھے سبھی

زاروقطار رونے لگے ان میں مستکوچ بھی تھے۔ انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''اب ان کو یہاں سے لے جاؤ۔''

واسیا ''کوئک مارچ'' کہہ کر فوجی انداز میں مڑا اور اپنے دفتر کے ساتھیوں کے ساتھ پریڈ کے انداز میں چلنے لگا۔ اس کی ساتھیوں نے اسے ہال میں لے جا کر اپنے پاس ہی بٹھالیا۔ اس دوران گفتگو کا موضوع واسیا ہی بنا رہا۔ اس کی تعریفوں میں قصیدے پڑھے جانے لگے۔ سبھی کو اس کی نیکیاں اور اچھی عادتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس کی بربادی پر سبھی کی آنکھیں نمناک تھیں۔ ایک نے یہ بھی بتایا کہ مستکوچ نے اس کی انکساری وقت کی پابندی اور کام میں اس کی بہتر کارکردگی سے متاثر ہو کر بطور پروموشن فوج میں اس کے لئے جانے کی سفارش کی تھی پتہ نہیں باس کی سفارش کو واسیا نے مثبت طور پر لیا یا منفی طور پر مگر اتنا تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ فوج کا خناس اسی سبب سے اس کے دماغ میں بیٹھ گیا ہے۔ غالباً وہ اپنے دل میں یہی سمجھتا رہا کہ وقت پر کام پورا نہ ہونے کی پاداش میں اسے بطور سزا فوج میں بھیجدیا جائے گا۔

دفعتاً میڈیکل کی ایک گاڑی دفتر کے صدر دروازے کے سامنے آ کر رکی اس میں سے ایک ڈاکٹر اور اس کا اردلی برآمد ہوئے جنہیں ایک کلرک اپنے ساتھ ہال میں لے آیا۔ ڈاکٹر نے واسیا کے چہرے کو غور سے دیکھا اور کہا۔ ''چلئے وقت ہو چکا ہے۔''

واسیا جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور فوجی انداز میں ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ کچھ دور چل کر وہ رک گیا اور اس نے پیچھے مڑ کر کچھ اس طرح دیکھا جیسے اسے کسی کی تلاش ہو۔

''واسیا'' ارکاشا کی چیخ بڑی دلدوز اور جگر شگاف چیخ تھی۔ اس کا دل اس چیخ کے ساتھ ہی اچھل کر اس کے حلق میں آ گیا تھا۔ ادھر سے ارکاشا بھاگا اور ادھر سے واسیا اور زندگی کے اس سفاک اور المناک موڑ پر دو دوست آخری بار ایک دوسرے سے بے اختیار اور دیوانہ وار لپٹ گئے پھر فوراً ہی چونک کر ایک لفافہ ارکاشا کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے واسیا نے کہا۔

''دوست! یہ میری زندگی کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ ساری دنیا کے خزانے بھی اس کا بدل نہیں ہو سکتے میری یہ امانت تم حفاظت سے اپنے پاس رکھنا ورنہ یہ لوگ اسے مجھ سے چھین لینگے۔ میں یہ واپس آ کر تم سے لے لونگا۔'' اتنا کہہ کر وہ پھر پلٹ گیا اور تیزی سے چلنے لگا اور صدر دروازے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ وہاں سے ہاتھ کے اشارے سے اس نے سب کو الوداع کہا اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔ انجن کی گھڑ گھڑاہٹ کے ساتھ ہی گاڑی حرکت میں آ گئی اور چند پل میں ہی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

گاڑی نظر سے اوجھل ہو جانے کے باوجود بھی ارکاشا ادھر ہی دیکھتا رہا۔ واسیا کا چہرہ اس کی آنکھوں میں ابھی تک بسا ہوا تھا۔ پھر خیالات کا تانا بانا ٹوٹتے ہی اسے واسیا کی امانت وہ لفافہ یاد آ گیا جو اس کے ہاتھ میں تھما ہوا تھا۔ اس نے لفافے کو کھول کر دیکھا تو وہ لزانکا کی تراشیدہ لٹ تھی۔ وہی لٹ جو لزانکا نے اپنے چھوٹے بھائی پتینکا کے ہاتھ واسیا کو نئے سال پر بطور تحفہ پیش کی تھی اور جسے واسیا سینے سے لگائے لگائے پھر رہا تھا۔

ارکاشا کو چکر آ گئے وہ سر تھام کر زمین پر وہیں اُکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کے منہ سے بڑی دردناک کراہ نکلی۔ ''ہائے واسیا! ہائے لزانکا! ہائے تیرہ بختی!''

اصولاً تو کہانی یہیں ختم ہو جاتی ہے کیونکہ لزانکا کے پچھاڑیں کھاتے مما کے بے ہوش ہو جانے اور پتینزکا کے رونے کے المناک واقعات کے ذکر سے دکھی قائین کو مزید دکھی کرنا ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ البتہ یہ بات بتانے میں کوئی حرج نہیں کہ واسیا کے حادثے کے دو سال بعد ارکاشا کو چرچ میں جب لزانکا ملی تو وہ شادی شدہ تھی اور اس کی گود میں ایک خوبصورت سا بچہ تھا۔ کہا تو اس نے یہی تھا کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے بہت خوش ہے مگر یہ بات ارکاشا کی سمجھ میں آج تک نہیں آئی کہ خوشگوار زندگی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی آنکھیں کیوں چھلک پڑی تھیں؟ آخر کیوں؟

(ختم شد)۔(غیر مطبوعہ)

☆☆☆

☆......او ہنیری
☆......رفیق شاہین

''بیس سال بعد''

(ایک سپینس سے بھرپور دلچسپ امریکی کہانی)

گشت لگاتے وقت وہ پولس والا بڑا تازہ دم چوکنا اور چوکس نظر آ رہا تھا۔ اس کی چوکسی کو دکھاوا تو اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں اس کی مستعدی اور چوکسی کی داد دینے والے راہگیر تو موجود ہی نہیں تھے لہٰذا یہی کہنا صحیح ہوگا کہ پھرتی اور چوکسی اس کی عادت ہی نہیں بلکہ فطرت بن چکی تھی۔ ابھی رات کے دس ہی بجے تھے کہ یخ آلود ہوا کے طوفانی جھونکوں کو بارش کی علامت خیال کر کے علاقے کے لوگ سر شام ہی اپنے اپنے گھروں میں جا کر محفوظ ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ علاقے کے بازار اور گلی کوچے ویران و سنسان نظر آ رہے تھے۔

وہ اِدھر اُدھر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے اور دکانوں کے بند دروازوں کو اپنے ڈنڈے سے طبلے کی طرح بجاتے ہوئے کبھی یہاں تو کبھی وہاں بڑی مستعدی سے گشت لگا رہا تھا۔ تاریکی اور نیم تاریکی میں ڈوبے اس خاموش اور پُرسکوت ماحول مین دھندلی سی روشنی یا تو ایک سگار اسٹور میں نظر آ رہی تھی یا پھر اس چھوٹے سے لنچ کاؤنٹر میں جو ساری رات کھلا رہتا تھا۔ ورنہ تو سبھی دروازے جو تاجروں کی دکانوں کے تھے کبھی کے بند ہو چکے تھے۔

وہ پولس والا گشت لگاتے ہوئے ابھی ایک بلاک کے وسط تک ہی پہنچا ہوگا کہ خودکار طور پر اس کے قدموں کی رفتار سُست پڑ گئی۔ اس نے دیکھا کہ تاریکی میں ڈوبے ایک ہارڈ ویر اسٹور کے پاس کوئی شخص کھڑا ہوا تھا جس کے ہونٹوں میں بجھا ہوا سگار دبا تھا۔ پولس مین جیسے ہی اس اجنبی کے نزدیک پہنچا اس نے خود ہی بولنا شروع کر دیا۔

''آفیسر! آپ ضرور سوچ رہے ہونگے کہ یہاں اندھیرے میں تنہا کھڑا میں کیا کر رہا ہوں۔؟ آپ اطمینان رکھئے میں ایک شریف آدمی ہوں اور یہاں اپنے ایک خاص دوست کا انتظار کر رہا ہوں۔ ایک ایسے دوست کا انتظار جس نے مجھ سے یہاں ملنے کا وعدہ آج سے بیس سال پہلے کیا تھا۔ یہ بات آپ کو عجیب ضرور معلوم ہوگی لیکن اگر آپ سننا پسند کرینگے تو میں آپ کو ہر بات بتا دونگا۔''

''دراصل یہ جو ہارڈ ویر اسٹور ہے یہ آج سے بیس سال پہلے ''بگ جو بریڈی'' کا ریسٹورینٹ ہوا کرتا تھا۔''

پولس مین نے تائید کی۔

''ہاں بعد میں یہ مسمار کر دیا گیا اور اس کی جگہ ہارڈ ویر اسٹور نے لے لی۔ اور ہاں یہ بات پانچ ہی سال پہلے کی ہے۔''

اجنبی راہگیر نے اتنا سن کر لائٹر روشن کیا اور منہ میں دبا سگار سلگانے لگا۔ اس دوران پولس مین نے لائٹر کی روشنی میں دیکھا کہ بھاری جبڑوں والا اس کا چہرہ زردی مائل تھا۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی اور اس کی دائیں آنکھ کے نیچے ایک سفید داغ بھی تھا۔ اس نے اپنے گلے میں جو اسکارف لپیٹ رکھا تھا اس میں لگی پن میں ایک بڑے سائز کا ہیرا جگمگا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

آج سے بیس سال پہلے، ایک رات آخری بار ''بگ جو بریڈی'' کے اسی ریسٹورینٹ میں میں نے اپنے سب سے چہیتے اور پیارے دوست جمی ویلس کے ساتھ ڈینر لیا تھا۔ وہ میری آنکھ کا تارا میرے جگر کا ٹکڑا اور میری جان تھا۔ جمی ویلس جیسا پیارا اور وفادار و جاں نثار دوست تو دنیا میں دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ نیویارک میں جنمے ہم دونوں دوست آپس میں سگے بھائی سے بھی زیادہ تھے۔ میں اٹھارہ برس کا تھا اور جمی بیس سال کا۔ اگلی صبح ہم دوستوں کے آپس میں بچھڑنے کی صبح تھی۔ کیوں کہ دولت کمانے کے لئے کل سویرے ہی مجھے امریکہ کے مغربی شہروں کے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ مگر جمی کے لئے تو یہ نیویارک ہی جیسے اس کی مکمل دنیا تھی۔ وہ یہ شہر چھوڑ کر کہیں بھی جانا نہیں چاہتا تھا۔ ہم نے ہوٹل میں ایک ساتھ کھانا کھاتے ہوئے آپس میں یہ پختہ عہد کیا تھا کہ ہم دنیا میں کہیں بھی کیوں نہ ہوں مقررہ وقت اور ٹھکانے کے مطابق ٹھیک بیس سال کے بعد اسی ریسٹورینٹ میں ایک دوسرے سے ملاقات کریں گے اور اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کرینگے کہ اس بیس سالہ عرصے میں ہماری قسمتوں نے ہمارا کتنا ساتھ دیا ہے؟ ہم نے کتنی دولت کمائی ہے اور معاشرے میں اب ہمارا مقام کیا ہے؟۔ اور یہ بھی کہ مستقبل کو مزید تابناک بنانے کے لئے ہمارا اگلا اقدام کیا ہونا چاہیئے۔

''آپ کی روداد تو واقعی بے حد دلچسپ ہے۔'' پولس مین نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات بھی تو بتایئے کہ جدا ہونے کے بعد کیا آپ لوگوں نے آپس میں رابطہ قائم نہیں رکھا۔؟''

''رکھا تھا۔'' راہگیر نے کہا۔ ''دو ایک سال تک تو ہم لوگ ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرتے رہے پھر یہ سلسلہ آپ ہی آپ منقطع ہو گیا۔

مغربی امریکہ کے مصروف ترین ماحول میں دولت کمانے اور ثروت مند بننے کی ترنگ میں آکر میں اپنے آپ کو بھی بھول گیا تھا۔ مگر مجھے یقین واثق تھا کہ جمی اگر زندہ ہوا تو وہ مقررہ وقت اور ٹھکانے پر آکر مجھ سے ملاقات کرنے ضرور ہی آئے گا کیونکہ وعدہ کر کے ایفانہ کرنا تو اسے آتا ہی نہیں تھا۔ وعدہ نبھانے میں وہ اپنی مثال آپ تھا۔ وہ بھول ہی نہیں سکتا کہ آج کا دن ہماری طئے شدہ ملاقات کا آخری دن ہے۔ اگر وہ آجاتا ہے اور ہماری ملاقات ہو جاتی ہے تو ہزاروں میل کا سفر طئے کر کے میرے یہاں آنے کی تھکن آپ ہی آپ اتر جائیگی۔''

اتنا کہ کر اس نے ہیرے جڑی سوئیوں والی گھڑی اپنی جیب سے نکال کر وقت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''دس بجنے میں صرف تین منٹ کی کسر باقی ہے۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ رات کے ٹھیک دس بجے ہی ریسٹورینٹ کے اسی مقام پر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہا تھا۔''

''ایسا لگتا ہے مغرب کا سفر آپ کو راس آگیا اور وہاں جا کر غالباً آپ کے خواب شرمندہ تعبیر

ہو گئے ہیں۔ کیا غلط کہا ہے میں نے؟'' پولس مین نے دریافت کیا۔

''غلط کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک دم بجا فرمایا ہے آپ نے۔'' منتظر شخص نے بڑے فخریہ اور پُر جوش لہجے میں کہا۔

''یہاں رہ کر جمی نے خواہ کتنی بھی ترقی حاصل کیوں نہ کر لی ہو میرے مقابلے میں تو وہ حقیر ہی ہوگی۔ دولت کمانے اور ترقی حاصل کرنے کے معقول ذرائع اور بہترین مواقع تو مغرب میں ہی میسر آسکتے ہیں۔ مگر میرا دوست تو بڑا سیدھا سچا اور بھولا بھالا انسان ہے۔ مغرب میں تلوار کی دھار پر چلنے کا ہنر تو اس میں تھا ہی نہیں اس لئے نیویارک سے بہتر جگہ تو اس کے لئے دنیا بھر میں کہیں ہو ہی نہیں سکتی۔''

''اچھا تو اب مجھے گشت پر نکلنے کی اجازت دیجئے۔ آپ کے دوست کے آنے کا وقت نزدیک آچکا ہے۔ دوست سے ملاقات پر میری پیشگی مبارکباد قبول فرمائیے۔'' پولس مین نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جی شکریہ!'' منتظر شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہماری ملاقات میں تو کوئی شبہ ہی نہیں۔ میں ساڑھے دس بجے تک اس کا انتظار کرونگا۔ مجھے کامل یقین ہے کہ جمی اگر زندہ ہے تو خواہ روئے زمین پر وہ کہیں بھی موجود کیوں نہ ہو وہ مجھ سے ملنے یہاں دیوانہ وار کھنچا چلا آئے گا۔'' ''شب بخیر'' کہہ کر پولس مین آگے بڑھ گیا اور بند دکانوں کے شٹروں پر ڈنڈے بجا بجا کر اپنی ڈیوٹی انجام دینے لگا۔

دفعتاً بادلوں سے پھوار برسنی شروع ہوگئی اور یخ آلود آندھی کے طوفانی جھونکوں نے شور وغل مچانا شروع کر دیا۔ اس پر جو چند ایک راہگیر سڑکوں پر نظر آرہے تھے انہوں نے کوٹ کے کالر کھڑے کر کے اپنے ہاتھ اپنے کوٹ کی جیبوں میں ٹھونس لئے اور موسم کی غضبناکی سے خائف ہو کر اپنے قدموں کی رفتار ایکا ایکی تیز کر دی تا کہ اپنے گھروں کو پہنچ کر خود کو محفوظ کر سکیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے سڑکیں ویران اور سنسان ہوگئی تھیں مگر وہ شخص جو اپنے بچھڑے دوست سے ملاقات کے لئے ہزاروں میل کا سفر طئے کر کے یہاں آیا ہوا تھا وہ اب بھی ہارڈ ویر اسٹور کے سائے میں سگار پھونکتے ہوئے اپنے دوست کی آمد کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

انتظار کرتے ہوئے اسے دس بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے کہ تبھی ایک شخص جس نے اور کوٹ کے کھڑے کالروں میں اپنے کان چھپا رکھے تھے گلی کی ایک سمت سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سیدھا اسی منتظر شخص کے سامنے آکر رکا اور دریافت کیا۔

''تم بوب ہی ہونا۔؟''

''اور تم؟... جمی ویلس ہی ہونا تم۔؟'' مارے خوشی کے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔

''جیو میرے یار جیو!'' آنے والے کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے وہ بڑی گرمجوشی سے کہہ رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ تمہیں بوب ہو۔ قسمت اور زندگی نے ہمیں پھر سے ملا دیا ہے۔ میرا ایمان تھا کہ اگر تم سلامت ہوئے تو ملاقات کا وعدہ وفا کرنے یہاں ضرور آؤ گے۔ بیس سال بہت بہت

ہوتے ہیں۔ اس طویل عرصے میں بہت کچھ تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب وہ یادگار ریسٹورینٹ بھی نہیں رہا۔ ہماری ملاقاتوں کی یادگار وہ ریسٹورینٹ اگر آج بھی ہوتا تو آج بھی ہم دوست اسی میں بیٹھ کر ڈنر سے لطف اندوز ہوتے۔ میری دلی تمنا تھی کہ یہ ریسٹورینٹ ہمیشہ ہی قائم رہے۔ مگر یہ ممکن نہ ہوسکا خیر! چھوڑو ان باتوں کو اور مجھے یہ بتاؤ کہ مغرب کی ہجرت نے تمہیں کیا دیا ہے؟''

''سب کچھ دیا ہے دوست! سب کچھ دیا ہے۔'' اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر بڑے تعریفی انداز میں کہا۔

میری سارے خواب سچ ہوئے ہیں۔ میں نے جو چاہا مجھے ملا ہے۔ میری ہر تمنا پوری ہوئی ہے۔ میری قسمت کا ستارہ آجکل بلندی پر ہے۔ مگر جمی اس عرصے تم خاصے بدل گئے ہو۔ تمہارا قد بھی دو انچ تو بڑھ ہی گیا ہے۔ آواز میں بھی مردانگی پیدا ہوگئی ہے۔ مگر ان باتوں کو چھوڑو اور مجھے تو تم اپنی معرکہ آرائیوں اور فتوحات کے بارے میں بتاؤ اور یہ بھی کہ معاشرے میں اب تمہاری حیثیت کیا ہے۔؟

''اپنی حیثیت کو میں اوسط درجے کی ہی کہنا مناسب سمجھتا ہوں۔ مطلب یہ کہ ایک خاص شعبے میں ملازم ہوں۔ اسٹاف کے لوگ میری عزت کرتے ہیں۔ میں اسی سے مطمئن ہوں۔ اب کب تک یونہی کھڑے رہ کر باتیں کروگے۔ چلو بوب کوئی ڈھنگ کی جگہ تلاش کریں جہاں برسوں کے بعد اکھٹے بیٹھ کر اور خوب گھٹ گھٹ کر باتیں کرینگے... پرانی یادیں تازہ کرنے میں بڑا لطف آئے گا۔''

دونوں باہوں میں باہیں ڈالے گلی میں ایک طرف چل پڑے۔ راستہ چلتے ہوئے اپنی کامیابی و کامرانی اور دولت وثروت کے نشے میں سرشار بوب اپنے دوست جمی کو اپنی معرکہ آرائیوں اور ظفر مندیوں کی داستان بڑے فخریہ انداز میں سناتا رہا۔ اور کوٹ کے کالروں میں اپنے کان چھپائے جمی اس کی ہر بات کو دلچسپی سنتا رہا۔ ہنستا مسکراتا رہا اور ساتھ ہی اپنی خوشی کا اظہار بھی کرتا رہا۔

آگے گلی کے نکڑ پر ایک ڈرگ اسٹور واقع ہوا تھا جو برقی روشنی کی وجہ سے دور سے ہی جگمگا رہا تھا۔ قدم مسلسل آگے بڑھاتے ہوئے جب وہ دنوں ڈرگ اسٹور کے قریب پہنچے اور جیسے ہی روشنی ان کے چہروں پر پڑی بیک وقت دونوں کی ہی پر تجسس نگاہوں نے ایک دوسرے کے چہروں کو دیکھا۔ ناگاہ ہی بوب نے اپنی بانہہ جمی کی بانہہ سے جھٹکے کے ساتھ الگ کر لی۔ متحیر و متعجب ہو کر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ کہہ اٹھا۔

''نہیں... نہیں... تم جمی ویلس نہیں ہو... ہرگز ہرگز بھی نہیں ہو... مانا کہ بیس سالا مدت طویل ہوتی ہے مگر اتنی بھی نہیں کہ کسی کے چہرے کے نقش ونگار اور خدوخال ہی بدل کر رہ جائیں اور ایک رومن افریقن دکھائی دینے لگے۔''

''لیکن طویل عرصہ ایک نیک انسان کو بداعمال اور برا انسان تو بنا ہی سکتا ہے۔'' سرو قد شخص نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''آپ دس منٹ سے ہماری نگاہ میں ہیں مسٹر سلکی بوب! شکاگو والوں نے وائرلیس سے ہمیں بتایا تھا آجکل نیویارک میں آپ تشریف فرما ہیں اور آپ شکاگو والوں کو مطلوب ہیں۔ وہ کسی اہم معاملے میں آپ سے گفتگو کے خواہشمند ہیں۔ تو کیا مسٹر سلی بوب آپ اس کے لئے تیار ہیں؟ اور ہاں کیا ہم

ریلوے اسٹیشن کا رخ اختیار کریں؟ میرے پاس آپ کے نام کا ایک رقعہ ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ اسے اسی وقت پڑھ لیجئے۔ یہ رقعہ پولس اسٹیشن افسر جمی ویلس کا ہے۔"

سلی بوب نے فوراً ہی رقعہ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور اس کی تہہ کھول کر اسے بڑے اشتیاق و اضطراب کے عالم میں پڑھنا شروع کر دیا۔

ایکا ایکی اس کے ہاتھ بڑی طرح کانپنے اور لرزنے لگے اور اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح جھلملا اٹھے۔

رقعہ مختصر تھا۔ لکھا تھا۔

مسٹر سلکی بوب! میں تم سے ملنے مقررہ ٹھکانے پر بروقت پہنچ گیا تھا مگر جیسے ہی تم نے سگار سلگانے کے لئے لائٹر روشن کیا میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ مجرمانہ وارداتوں کے سبب شکاگو کی پولس کو جو شخص مطلوب ہے وہ تم خود ہو۔

بذات خود اپنے ہاتھوں سے تمہیں گرفتار کرنا مجھے اچھا نہیں لگا اس لئے یہ کام انجام دینے کے لئے ایک پولس افسر کو میں نے تمہارے پاس بھیج دیا تھا۔

☆......آسکر وائلڈ

☆......رفیق شاہین

''پُراسرار ننھا فرشتہ''

(اپنے انجام پر چونکا دینے والی دلچسپ آئرش (آئرلینڈ) کہانی)

دوپہر کے وقت اسکول سے واپسی پر اسکول کے بچوں کا یہ روز کا معمول بن چکا تھا کہ وہ راستے میں واقع ایک غیر آباد قلعہ نما حویلی میں داخل ہو کر باغ میں گھومتے اور کھیل کود میں شامل ہو کر خوب دھما چوکڑی مچاتے۔ وسیع باغ کی سیر اور کھیل کود میں انہیں بڑا لطف آتا تھا۔

یہ کافی وسیع وعریض باغ تھا جس میں ہر طرف سبز گھاس کے خوشنما قالین سے بچھے تھے اور جا بجا چھوٹے چھوٹے گلزاروں میں کھلے رنگ برنگے پھول ستاروں کی طرح تاباں ودرخشاں نظر آتے تھے۔ باغ میں ایک درجن آڑو کے پیڑ بھی تھے جو موسم بہار میں گلابی رنگ کے موتی سے چمکتے دمکتے شگوفوں سے لد جاتے تھے اور موسم خزاں میں یہی شگوفے اپنا رنگ روپ بدل کر خوش رنگ وخوشنما اور میٹھے رسیلے پھلوں میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ ان درختوں کی شاخوں پر جب رنگا رنگ پرندے جھولا جھولتے ہوئے اپنی میٹھی سُریلی آوازوں میں خوشی کے راگ الاپتے تو بچے کھیل کود چھوڑ کر ان کے سحر انگیز نغمتوں کی دلکشی میں کھو کر رہ جاتے اور ایک آواز ہو کر بیساختہ ہی کہہ اٹھتے۔ ''ہم یہاں کتنے خوش ہیں... کیا خوب مزہ آرہا ہے۔''

اور پھر حویلی کا مالک لحیم شحیم فلپ حویلی میں واپس آگیا۔ وہ اپنے دوست سے ملنے ''کورنش اوگر'' گیا ہوا تھا جہاں اس نے سات سال گزار دیے اور پھر اچانک ہی اپنی حویلی میں آگیا۔ یہاں آکر جب اس نے اپنی حویلی کے باغ میں بچوں کو دھما چوکڑی مچاتے اور شوروغل کرتے دیکھا تو وہ ایکا ایکی ہر افروختہ ہوا اٹھا۔ اس نے بچوں سے بُرے تلخ لہجے میں کہا۔

''یہ کوئی سرکاری پارک نہیں ہے، یہ میرا ذاتی باغ ہے۔ جایئے یہاں سے اور کبھی دوبارہ آنے کی کوشش مت کرنا۔''

بچے خوفزدہ ہو کر وہاں سے فوراً ہی بھاگ گئے۔ وہ پھر بھی بڑبڑاتا ہی رہا۔ ''کمال ہے۔ لوگ منہ اٹھائے یہاں ایسے چلے آتے ہیں جیسے یہ ان کی نانی کا گھر ہے۔ باغ لگاؤں میں اور مزا لیں ایرا غیر نتھو خیرا۔ دیکھونگا وہ اب یہاں کیسے آتے ہیں۔''

اس نے فوراً ہی باغ کے گرد چہار دیواری تعمیر کرا کے باہر کی طرف نوٹس بورڈ ٹانگ دیا جس پر یہ لکھا تھا۔

''بلا اجازت اندر آنے والوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی''

باغ کے اردگرد چہار دیواری ایستادہ ہو جانے پر بچوں سے ان کے کھیل کود کا ٹھکانہ چھن گیا تھا چنانچہ وہ بڑے مغموم وملول رہنے لگے تھے۔ مجبوراً اگر سڑک پر کھیلنے کی کوشش کرتے تو ان کے کھیل کود میں سنگریزے اور راہ کی خاک دھول رخنہ انداز ہو جاتی۔ اسکول سے واپسی پر وہ باغ کی چہار دیواری کو حسرت

سے تکا کرتے اور کہتے۔
''ہائے! اب تو ہم اندر جا ہی نہیں سکتے۔ کیسے سنہرے اور سہانے تھے وہ دن جب ہم باغ میں خوشیاں مناتے اور مستیاں کیا کرتے تھے۔''

اور پھر جب موسم بہار آیا تو سب کے باغ شگوفوں سے لد گئے، ہر طرف رنگا رنگ پھول مہک کر فضا میں عطر گھولنے لگے۔ پھولوں بھری شاخیں ہوا میں رقصاں ہو اٹھیں۔ رنگ برنگے طائروں نے خوشی کے مست راگ الاپکر باغوں میں رسیلے نغمے بکھیر نے شروع کر دیے مگر اس مغرور بخیل فلپ کے باغ میں تو موسم سرما کی خزاں رسیدہ ویرانیاں اور اداس سناٹے ابھی تک اپنا ڈیرہ جمائے بیٹھے تھے۔ اس باغ سے بچوں کی رخصتی کے ساتھ ہی موسم بہار بھی رخصت ہو کر اور روٹھ کر کہیں دور چلا گیا تھا۔ باغ میں اب سبزہ نہیں اُگا۔ شاخوں پر پھول نہیں کھلے۔ خوش الحان نغمے بکھیر نے والے پرندوں نے بھی اب وہاں آنا ترک کر دیا تھا۔ آڑو کے پیڑ بھی شگوفوں سے محرومی کے سبب سر جھکائے اداس سے نظر آرہے تھے۔ زمردیں سبزہ زار میں ایک ہی پھول کھلا تھا مگر جب اس نے باغ میں بچوں کو غیر حاضر پایا تو اس نے بھی پتوں کی اوٹ میں اپنا چہرہ چھپالیا۔

موسم بہار اب یہاں آنا ہی بھول گیا تھا۔ اس کے بدلے میں اب یہاں کہرے اور برفباری نے اپنے خیمے گاڑ دیے تھے اور ان نئے دراندازوں نے ببانگ دہل اعلان بھی کر دیا تھا کہ ''یہ باغ اب ہماری ملکیت ہے اور اب یہاں ہمارا ہی راج چلے گا۔'' آسمان سے روئی کے گالوں کی شکل میں گرتی اور برستی برف نے زمردی گھاس کے سبزہ زار کو کفن نما سفید چادر سے ڈھک دیا تھا اور کہرے کی دبازت نے درختوں کی ہریالی چھین کر انہیں بدہیئت عفریت جیسا ہولناک روپ دے دیا۔ پھر باغ کے ان غاصب دراندازوں نے اپنے بڑے بھائی یخ آلود آندھی کے جھکڑی طوفان کو آنے کی دعوت دی تو وہ بھی سمور کا لبادہ زیب تن کئے فوراً ہی یہاں آدھمکا اور آتے ہی یہاں ہاتھی کی طرح چنگھاڑنا اور شیر کی طرح دہاڑنا شروع کر دیا۔ پھر شیر کی دہاڑ جیسی دلخراش آواز میں اپنے میزبانی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''معزز میزبان شکریہ کہ آپ نے ہمیں یہاں مدعو کیا یہ جگہ ہمیں پسند آئی۔ یہ واقعی ہمارے شایان شان ہے۔''

برفیلی آندھی کے طوفان کو ایسے میں اپنا حواری ژالہ باری کا ٹولا یاد آ گیا تو اس نے اسے بھی یہیں بلا بھیجا۔ یہ ٹولہ بھک سفید رنگ کی وردی زیب تن کئے ہوئے تھا اور اس کے منہ سے ہوا یخ آلود دھواں بن کر خارج ہو رہی تھی۔ اولے برسانے والے اس ٹولے نے حویلی کی چھت پر کم از کم تین گھنٹے لگاتار ڈرم بجاتا اپنا معمول بنالیا تھا جس سے مضروب ہو کر چھت پر لگی کئی بیلنیں چکنا چور ہو کر زمین بوس ہوگئی تھیں۔ ادھر اس ٹولے کے کچھ شرپسند ساتھی باغ میں بھی تخریب کاری کا مظاہرہ کر نے میں پیش پیش تھے جنہوں نے وزنی الوں کی مسلسل ضرب کاری سے آڑو کے پیڑوں کو زخمی کر دیا تھا اور ان کی بہت سی نرم شاخیں چٹکا کر زمین پر بکھیر دی تھیں۔ تخریب کاری کے اس عمل میں جھکڑی طوفان بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ اس نے چھت پر نصب دھوئیں کی چمنی کو اُکھاڑ کر کہیں دور پٹک دیا تھا ساتھ ہی اس نے اپنی شیر کی سی دہاڑ مسلسل جاری رکھ کر حویلی اور باغ کی فضا میں ہولناکی اور دہشت پیدا کر دی تھی۔

مغرور فلپ بالائی منزل کے دریچے کے قریب بیٹھا اپنے باغ کی اس بدحالی و بربادی کا منظر

دیکھ کر دل ہی دل میں رنجور و ملول ہو رہا تھا اور زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔

''آخر کیا ہو گیا ہے موسم بہار کو جو یہاں آنے میں تاخیر پہ تاخیر کئے جا رہا ہے۔ خیر! اسے آنا تو پڑیگا ہی۔ دیکھتے ہیں وہ باغ سے کب تک دور رہے گا''

مگر نہ تو پھر کبھی موسم گرما کی وہاں امد ہوئی اور نہ ہی موسم بہار نے باغ کو اپنی جھلک دکھانا ضروری سمجھا۔ موسم سرما کے دور خزاں میں سب کے باغوں کے پیڑ سنہرے اور رسیلے پھلوں کے بوجھ سے لچکنے لگے مگر فلپ کے باغ کے پیڑ پھل پھول سے بے نیاز ہی رہے۔ فلپ کی شکایت پر موسم سرما نے سرگوشی میں کہا۔

''اے مغرور اور تنگ دل انسان تو اسی لائق ہے۔''

غرض کہ اس کا باغ مستقل طور پر بادوباراں، کہرے، برف باری جھکڑی طوفان اور ژالہ باری کی آماجگاہ بن کر رہ گیا تھا۔ اور موسم سرما بھی یہاں فروکش ہو کر رہ گیا تھا اور اب باغ میں برف کے اڑتے ذرے یکجا ہو کر اور اپنا آنچل ہوا میں لہرا کر ادھر سے ادھر قلابازیاں کھاتے رہتے تھے۔

ایک دن صبح کے وقت جب مغرور فلپ بستر پر دراز چھت پر نگاہ مرکوز کئے تھا کہ دفعتاً اسے بڑی مترنم، نغمہ ریز اور سحر انگیز سی آواز سنائی پڑی۔ اسے اس آواز پر کسی شہنشاہ کے درباری مغنی کی منجھی ہوئی آواز کا شائبہ ہوا مگر یہ میٹھی رسیلی آواز کسی پرندے کی آواز ثابت ہوئی اس کے بعد فوراً ہی کسی بلبل کے چہکنے کی آواز سنائی دینے لگی جو بڑی نغمہ ریز تھی۔ باغ میں اس آواز کو سن کر ژالہ بارٹولے کے اجتماعی رقص میں تھرکتے قدم یکلخت ہی تھم گئے، کہرا ہوا کے اڑن کھٹولے پر سوار ہو کر فی الفور ہی باغ سے رفو چکر ہو گیا۔ نخ آلود آندھی کے طوفان نے ایکا ایکی شیر کی طرح دہاڑنا ترک کر دیا اور جب بالکونی کی طرف سے ہوا کا مہکتا ہوا عطر بیز جھونکا خوابگاہ میں چلا آیا تو فلپس کو لگا کہ باغ میں موسم بہار آ گیا ہے۔ وہ دیوانہ وار دوڑ لگا تا ہوا بالکونی میں جا پہنچا۔ وہاں سے اسے باغ کا جو عجیب و غریب منظر نظر آیا وہ بلا مبالغہ حیران کن تھا۔

اس نے دیکھا کہ باغ کی دیوار میں نقب لگا ہوا تھا اور اسکول کے بچے پھر سے باغ میں آ چکے تھے جو آڑو کے پیڑوں کی شاخوں پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھے خوش گپیوں میں محو تھے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ بچوں کی واپسی کی ۸ خوشی میں پیڑوں کا حسن دوبالا ہو گیا تھا اور وہ رنگین و حسین شگوفوں سے لدے پڑے تھے۔ اور جو بچے نیچے کھڑے تھے درختوں کی شاخیں جھک جھک کر اپنے دست شفقت سے ان کے سر سہلا رہی تھیں۔ اس موقع پر رنگ برنگے پرندوں کی واپسی بھی عمل میں آ چکی تھی۔ چڑیاں شاخ در شاخ پھدک پھدک کر چہچہا رہی تھیں۔ گانے گنگناتے طائر عالم سرخوشی میں درختوں کا طواف کر رہے تھے۔ سبزہ زار کے گلزاروں میں کھلے رنگ برنگے پھول مسکرا مسکرا کر خوشبوئیں بکھیر رہے تھے۔ گلپوش شاخیں ہوا کی نازک کمر میں اپنی باہیں حمائل کئے ہوئے مسلسل رقص کئے جا رہی تھیں۔ باغ کا خوشنما اور دلآویز و نظر افروز منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

لیکن دور باغ کا آخری آخری گوشہ باقی باغ سے مختلف ہونے کے سبب کچھ عجیب و غریب اور پُر اسرار سا نظر آ رہا تھا۔ وہاں اب بھی کہریلی دھند چھائی ہوئی تھی اور زمین کا سبزہ برف کے فرش تلے چھپا ہوا تھا اسی دھندلے گوشے میں پیڑ کے نیچے ایک چھوٹا سا بچہ تنہا کھڑا ہوا تھا۔ چھوٹا ہونے کی وجہ سے

اس کے ننھے منے ہاتھ پیڑ کی شاخوں کو چھونے سے قاصر تھے اور وہ دوسرے بچوں کی طرح پیڑ کی شاخوں پر بیٹھ کر جھولا جھولنے کا لطف بھی نہیں لے سکتا تھا اس لئے وہ بچہ پیڑ کے نیچے چہل قدمی کرتے ہوئے اپنی بے بسی پر مسلسل آنسو بہائے جا رہا تھا۔

برف اور کہرے کی دھند میں لپٹے درخت کو بچے کی حالت پر بڑا ترس آ رہا تھا مگر ہونٹوں پر برف جمی ہونے کی وجہ سے وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ بالآخر لگاتار کوشش سے جب چیخ کر ہونٹوں سے برف جھڑی تو درخت نے بڑے مشفقانہ اور دردمندانہ لہجے میں بچے سے مخاطب ہو کر کہا۔

''اے ننھے فرشتے! روتے کیوں ہو... پلیز! اپنے آنسو پوچھ لو اور اوپر چڑھ کر میری آغوش میں بیٹھ جاؤ'' اتنا کہہ کر اس نے بچے کی مدد کے لئے اپنی شاخیں نیچے کی طرف جھکا دیں۔ بچے نے شاخوں کی مدد سے پیڑ پر چڑھنے کی بہت کوشش کی مگر بہت چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ادھر باقی باغ کے برعکس اس گوشے میں یخ آلود آندھی کا جھکڑی طوفان ابھی تک اپنا قبضہ جمائے ہوئے تھا اور وہ کبھی ہاتھی کی طرح چنگھاڑ رہا تھا تو کبھی شیر کی طرح دہاڑ رہا تھا۔ ایسے گوشے کے پُراسرار ماحول میں وہ اکیلا کھڑا بچہ خود بھی پُراسرار سا نظر آ رہا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر سنگدل فلپ کا بھی دل پسیج گیا۔ اس نے کہا۔

''میں سمجھ گیا ہوں میں ایک مغرور و بے رحم قسم کا بدبخت انسان ہوں۔ میں نے ہی موسم بہار کو ناراض کیا تھا اس لئے ہی اس نے یہاں آنا چھوڑا ہے۔'' وہ اپنی خطا پر سچے دل سے نادم تھا اور بڑابڑا رہا تھا۔

''خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب اس ننھے فرشتے کو میں پیڑ پر چڑھاؤں گا اور آج ہی باغ کے گرد کھڑی دیواروں کو مسمار کر دوں گا تاکہ میرے باغ میں ان معصوم اور بھولے بھالے بچوں کو کھیلنے کودنے اور خوش ہونے کا بھرپور موقع مل سکے۔''

بچے کی مدد کے شدید جذبے کے تحت وہ برق رفتاری کے ساتھ نیچے اُتر گیا اور پھر دبے پاؤں چل کر جیسے ہی اس نے احتیاط سے باغ کا دروازہ کھولا بچوں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ خوفزدہ ہو کر پیڑوں سے نیچے کود پڑے اور بھاگ کر نقب کے ذریعے باغ سے باہر چلے گئے۔ ان کا باغ سے جانا تھا کہ تبھی پھر سے باغ پر موسم سرما مسلط ہو گیا۔ آندھیاں پاگلوں اور جنونیوں کی طرح چیخنے چلانے لگیں۔ جھکڑی طوفان نے پھر سے گرجنا اور دہاڑنا شروع کر دیا۔

باغ سے سبھی بچے چلے گئے تھے مگر باغ کے اس پراسرار گوشے میں کھڑا وہ پراسرار بچہ اب بھی وہیں موجود تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ فلپ دبے پاؤں چل کر چوری چوری بچے کے عقب میں پہنچ گیا اور پھر ایکا ایکی اسے بازوؤں میں بھر کر پیڑ کی نچلی شاخ پر بٹھا دیا۔ بچے کے پیڑ پر بیٹھتے ہی پیڑ سے ساری برف جھڑ گئی اور شگوفوں کی بہتات سے سارا درخت گلابی ہو گیا۔ اور پھر آن کی آن میں اڑ کر آنے والے پرندوں نے درخت پر اپنا قبضہ جما لیا اور پھر موسیقی کی بزم آراستہ کر کے وہ سب اپنے اپنے راگ اور اپنی اپنی راگنیاں الاپنے لگے۔ بچے کے ہونٹوں پر مدھر مسکان کھلی ہوئی تھی اور وہ خوشی میں مست اور سرشار نظر آ رہا تھا۔ اسی عالم سرخوشی میں اس ننھے فرشتے نے نیچے کھڑے فلپ کے گلے میں اپنی پھول سی نازک باہیں والہانہ حمائل کر دیں اور اسے پیار سے چوم لیا۔ نقب کے پیچھے سے اندر کی طرف جھانکنے

والے بچوں نے جب یہ منظر دیکھا تو ان کے دل سے فلپ کا خوف ہی جاتا رہا۔ وہ شور وغل کرتے اور بھاگتے دوڑتے پھر سے باغ میں آگئے اور ان کے آنے پر باغ میں پھر سے موسم بہار آگیا۔ فلپ نے بچوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

''پیارے بچو اب تمہیں کسی سے بھی خوفزدہ ہونے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ باغ تمہارا اپنا باغ ہے۔ یہاں تمہیں کھیلنے کودنے سے کوئی نہیں روکے گا۔ تم یہاں جب تک چاہو خوب کھیلا کرو۔''

اس نے باغ کے احاطے کی دیواریں گروادی تھیں۔ اب سڑک سے گزرتے راہگیر جب بڑی عمر کے فلپ کو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلتے دیکھتے تو ان کے قدموں کی رفتار خود بخود دست ہو جاتی اور وہ زیرلب بیساختہ ہی مسکرانے لگتے۔

اب وہ باغ پہلے سے بھی زیادہ نظر افروز اور پر بہار ہو گیا تھا بچے دوپہر کے وقت باغ میں آتے اور شام تک وہاں خوب دھماچوکڑی مچانے اور ہنسی ٹھٹہ کرنے کے بعد فلپ کو شام بخیر کہہ کر اپنے گھر چلے جاتے۔

آجکل باغ میں اس ننھے فرشتے کی غیر حاضری فلپ کو بری طرح کھٹک رہی تھی۔ اسے اس معصوم کا گلے میں باہیں ڈال کر بوسہ دینا بار بار یاد آرہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس سے بہت محبت کرنے لگا تھا اس کی یاد اسے مغموم کر دیتی تھی۔ آخر کار وہ اس کے بارے میں بچوں سے پوچھنے پر مجبور ہو ہی گیا۔

''بچو ننھا معصوم بچہ جسے میں نے پیڑ پر چڑھایا تھا بہت دن سے باغ میں نہیں آرہا ہے۔ کہاں ہے وہ۔؟''

''ہمیں اس کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں ہے۔'' بچوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

تو فلپ نے کہا۔

''تم لوگ اس کے بارے میں معلوم کرو کہ وہ کہاں رہتا ہے اور پھر آکر مجھے بتاؤ۔'' اگلے دن بھی بچوں نے جواب نفی میں دیتے ہوئے کہا۔

''ہم سب نے بہت کوشش کی مگر اس کا کوئی پتہ ٹھکانہ معلوم نہ ہو سکا۔ وہ ہمارے ساتھیوں میں سے نہیں ہے۔ ہم نے اسے یہاں پہلی ہی بار دیکھا تھا وہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا اور کہاں جاکر گم ہو گیا؟ ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔''

بچوں کے اس نفی جواب سے وہ انتہائی دکھی اور افسردہ ہو گیا۔

اسکول سے چھٹی کے بعد ہر دوپہر کو بچے باغ میں آکر کھیلتے مگر ان میں وہ پیارا سا بچہ پھر کبھی دکھائی نہیں دیا جس نے فلپ کو بوسہ دیا تھا۔ فلپ اب سبھی بچوں سے بڑی شفقت و محبت کے ساتھ پیش آتا تھا۔ مگر اس لاڈلے اور چہیتے کی غیر موجودگی اسے ہر دم چاٹتی اور کترتی رہتی تھی۔ اکثر بچوں سے وہ اسی کا ذکر لے کر بیٹھ جاتا۔

''بچو کچھ تم ہی بتاؤ یہ بات میری سمجھ میں تو آتی نہیں ہے کہ اس نے یہاں آنا کیوں چھوڑ دیا ہے اور وہ کہاں چلا گیا ہے۔؟ بچوں کا جواب ہوتا۔

''لگتا ہے وہ دور دراز سے آیا تھا اور اب وہ کہیں بہت دور چلا گیا ہے۔''

تیز رفتار وقت کے ساتھ سال پہ سال گزرتے ہی چلے گئے اور وہ فلپ جو کبھی قوی الجثہ اور لحیم شحیم ہونے کی وجہ سے دیوزاد سا دکھائی دیتا تھا۔ کبر سنی کو پہنچ کر اب انتہائی لاغر اور ایک نحیف و نزار سے ضعیف میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اب بچوں کے ساتھ کھیلنا اس کے بس کا نہ تھا لہٰذا اب وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھا بچوں کو ہنستے کھیلتے دیکھتا اور زیر لب بڑبڑایا کرتا۔

''یوں تو میرے باغ میں ایک سے بڑھ کر ایک پھول موجود ہیں مگر ایک وہی گل سرسبد نہیں ہے جس نے کبھی مجھے بوسہ دیا تھا اور جواب میرے قلب و روح میں آباد ہو کر رہ گیا ہے۔''

ایک دن علی الصبح لباس تبدیل کرتے وقت جب اس نے باغ میں موسم سرما کو خیمہ زن دیکھا تو اس نے کہا۔

''یہ موسم بہار محو خواب ہے اور پھول شبنمی چادر اوڑھے نیند کی آغوش میں آرام کر رہے ہیں۔'' اور پھر ناگاہ ہی وہ چونک رورطۂ حیرت میں پڑ گیا۔ متحیر و متعجب ہو کر اور بار بار آنکھیں مل کر اس نے شبہ دور کرنے کی کوشش کی کہیں وہ نیند کے عالم میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے مگر جو کچھ اس نے دیکھا وہ خواب نہیں بلکہ حقیقت اور سوفیصدی حقیقت تھا۔ اس نے دیکھا کہ باغ کے آخری گوشے میں جو آڑو کا درخت تھا وہ موسم سرما میں بھی رنگین و حسین شگوفوں سے لدا تھا اور اس کی شاخوں کے یہ شگوفے آسمان میں جڑے ستاروں کی طرح درخشندہ و تابندہ نظر آ رہے تھے اور اس پیڑ کے نیچے وہی ننھا فرشتہ کھڑا ہوا تھا جس نے کبھی اسے بوسہ دے کر اپنی معصوم و مقدس محبت کا والہانہ اظہار کیا تھا۔

وفور مسرت سے فلپ کے دل کی دھڑکن آسمان کو چھونے لگی اور خوشی کی ہیجانی کیفیت میں ہاتھ پاؤں کپکپانے لگے۔ آناً فاناً اس نے زینہ طئے کیا اور باغ میں داخل ہو کر اسی گوشے میں پہنچ گیا جہاں وہ ننھا فرشتہ کھڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کے روبرو کھڑے ہو کر اس کی سالہا سال کی مدت پر محیط اس کی غیر حاضری کا اس سے شکوہ کرتا اس کی نظر اس ننھے کی ہتھیلیوں پر جا ٹکی جہاں کیل ٹھکنے جانے جیسے نشانات موجود تھے اور ایسے ہی نشان اس کے دونوں پاؤں میں بھی تھے جنہیں دیکھ کر مصلوب یسوع کی تصویر کا عکس آنکھوں میں ابھر آنا عین فطری بات ہے۔ ان نشانوں کو دیکھ کر فلپ کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو گیا۔ اس نے بڑے غضبناک لہجے میں کہا۔

''یہ نشان کیسے ہیں؟ تمہیں کس نے زخمی کیا ہے؟ مجھے بتاؤ میں اسے ابھی تہہ تیغ کر دونگا۔''

''غصہ تھوک دیجئے۔'' بچے نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم نے میرے ہاتھ پاؤں میں جو نشان دیکھے ہیں وہ نفرت یا دشمنی کے نشان نہیں ہیں بلکہ یہ خدا سے سچی محبت کے مقدس نشان ہیں۔'' بچے کے منہ سے بڑوں جیسی بات سن کر فلپ متحیر ہو اُٹھا۔ اس نے بڑے پُرتجسس لہجے میں استفسار کیا۔

''کون ہو۔؟ بتاؤ مجھے... تم کون ہو۔؟''

بچے نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں وہی ہوں جسے ایک دن آپ نے اپنے باغ میں کھیلنے کا موقع دیا تھا اور اب تم میرے وسیع و کشادہ باغ میں کھیلا کرو گے۔

میں عتیق بشارت دیتا ہوں کہ تم عنقریب میرے پاس آنے والے ہو۔

بیرونی ممالک کے
افسانہ نگاروں کے
سوانحی خاکے

انتون چیخوف (1860-1904)

ایک زرخرید غلام کے پوتے انتون چیخوف روس کے ایک ایسے شہرۂ آفاق ادیب ہیں جنہوں نے دنیا کو بڑی تعداد میں عظیم کہانیاں پیش کی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں عہد جاریہ اور عصری تقاضوں کی جھلک کا پایا جانا ان کی انسانی حیات ونفسیات پر گہری نظر ان کی حقیقت نگاری پر دال ہے۔ آفاق ادب میں وہ بحیثیت ڈرامہ نگار بھی جانے مانے جاتے ہیں اور انہوں نے بہترین ڈرامے تخلیق کیے ہیں۔ ان کے پاس M.D. کی ڈگری تھی اور وہ زندگی بھر بحیثیت میڈیکل ڈاکٹر اپنے مریضوں کا علاج کرتے رہے۔ انہیں جدید افسانے کا امام اعظم کہا جاتا ہے۔

فیودور دوستوئیفسکی (1821-1888)

دوستوئیفسکی روس کے ایک ایسے اہم ادیب ہیں جنہیں افسانہ نگاری اور ناول نگاری میں عالمگیر سطح پر زبردست شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ نوجوانی کے دور میں انہیں بحیثیت ایک قیدی سائبیریا کے قید خانے میں کچھ وقت گزارنا پڑا۔ قید و بند کے دوران حاصل ہونے والے تجربات کو بروئے کار لا کر انہوں نے جو ناول اور افسانے تخلیق کیے ہیں ان میں انسانی دُکھ درد کا دردمندانہ اظہار قاری کو شدّت سے متاثر کرتا ہے۔ ان کی ناولوں میں The Crime and Punishment The poor people اور The Idiot ان کے بہترین ناول ہیں وہ ایک زبردست جواری تھے اور کبھی کبھی دماغی مرض ان پر غالب آجاتا تھا۔

نکولائی گوگول۔ (1809-1852)

روسی ادیب نکولائی گوگول کا جنم جنوبی روس کے صوبے یوکرین میں ہوا تھا۔ اُسے جدید روسی ادب کا بنیاد گزار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے افسانوں میں تخلیقی تنوع طرفگی، شائستگی و تازگی اور جدّت و ندرت کو بآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس کے افسانوں کو دنیا بھر میں آج بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

جیک لندن۔ (1876-1916)

جیک لندن امریکہ کے معروف و ممتاز ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے دنیا بھر میں اپنی شناخت مستحکم کر چکا ہے۔ اُس کے تخلیق شاہکار جن کی دنیا بھر میں پذیرائی نصیب ہوئی ہے درج ذیل ہیں The call of the Wild-Son of the Wolf- The Sea wolf اور White Fang وغیرہ۔

گائی دی موپاساں (1850-1893)

موپاساں وہ فرینچ ادب ہے جو دنیائے ادب میں عظیم شارٹ اسٹوری رائٹر کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہانی گھڑنے کا تکنیکی فن اُس نے فلابیر موپاساں سے مستعار لیا ہے اور وہ ''ماسٹر آف فورم'' کہلاتا ہے۔ اس کے افسانوں کا اختتام چونکنے پر مجبور کر دیتا ہے اور وہ تقریباً تین سو کہانیوں کا خالق و مالک ہے۔ ''نئے رشتوں کی نئی فصل'' اس کی چند نمائندہ کہانیوں میں سے ایک ہے۔

آسکر وائلڈ۔ (1854-1900)

آئرلینڈ میں جنما آئرش ادیب آسکر وائلڈ فنی لحاظ سے اپنے بیانیہ میں رمز و ایما اور اشاروں کنایوں کی زبان کے استعمال کی وجہ سے ادب میں منفرد اور ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اس کی نمائندہ کہانی ''پُراسرار ننھا فرشتہ'' کے آخری پیراگراف میں بھی Wit and Eccentricity کا پہلو اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ کہانیوں کے علاوہ وہ اپنے کئی ڈراموں اور اپنی اکلوتی ناول The Picture of Dorian Gray کی وجہ سے بھی شہرت رکھتا ہے۔ شعر و سخن کے حوالے سے بھی اُس نے نام کمایا اور اس کی مقبول عام نظم The Ballad of Reading Gaol ہے۔

لیو طالسطائی۔ (1828-1910)

بحیثیت ادیب طالسطائی کو تمام روسی ادیبوں پر تفوق و امتیاز حاصل ہے۔ وہ دنیا کے ایک عظیم ناول نگار ہیں اور انہوں نے ادب کو WAR AND PEACE جیسا جسیم و ضخیم اور عظیم ناول عطا کیا ہے۔ انہوں نے لاتعداد کہانیاں بھی لکھیں جو شرف قبولیت سے سرفراز ہوئیں۔ ان کی کہانی ''سزائے عمر قید اور جلا وطنی'' شہرہ آفاق کہانی ہے۔ وہ ایک درویشانہ اور نابغہ ادبی شخصیت کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں حقیقت وہ ہے جس کا وجود نہ ہو اور جو ماوراء ہو۔

گستاف فلابیر۔ (1821-1880)

فرانسیسی ادیب فلابیر نے شہر روئین میں ایک ڈاکٹر کے گھر میں جنم لیا۔ اس نے انسان کے باطن میں اُتر کر بطور معالج اس کی روح کا معائنہ کیا ہے اور اُس کی نفسانی کمزوریوں کا عرفان حاصل کیا ہے۔ ان کی یہی بصیرت جہاں ان کی کہانیوں میں نمایاں ہے وہیں ان کے شہرۂ آفاق ناول ''مادام بواری'' میں بھی جلوہ گر ہے۔

الیکسانڈر پشکن۔ (1799-1837)

روسی کلاسیکی ادب میں جس نے حقیقت نگاری کی داغ بیل ڈالی وہ پشکن ہی ہے۔ اس نے متعدد دلپذیر کہانیاں تخلیق کی ہیں۔ اس کی کہانیوں میں ''آگ لگی بابل کی گلی'' اور ''تابوت ساز'' اُس کی بہترین کہانیاں ہیں۔ افسوس کہ اس کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ محض اڑتیس ویں سال میں ہی بیمار رہ کر چل بسا۔

او۔ہینری۔(1862-1910)

ولیم سڈنی پورٹر ''گرینسبو رو''، امریکہ میں پیدا ہوا۔ وہ جس بینک میں ملازم تھا اُس نے اُس پر غبن کا مقدمہ دائر کر دیا اور جب عدالت میں غبن کے الزام صحیح ثابت ہوا تو بطور مجرم اُسے جیل بھیج دیا گیا۔ وہاں وقت گزاری کے خیال سے اُس نے فرضی نام او۔ہینری کے نام سے کہانیاں لکھنا شروع کر دیا اور بعد رہائی کے بھی اس سلسلے کو قائم رکھا۔ او۔ہینری نے کئی سو کہانیاں تخلیق کی ہیں جنہیں دنیا بھر میں سراہا گیا۔ آج اس کا شمار امریکہ کے ممتاز اور مقبول عام افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ کہانیوں کے اختتام پر اُس کی چونکا دینی والی تکنیک ہر کسی کو پسند آتی ہے۔ اُس کی کہانیاں ''بیس سال بعد'' اور ''انوکھی مریضہ کی انوکھی کہانی'' نمائندہ کہانیوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

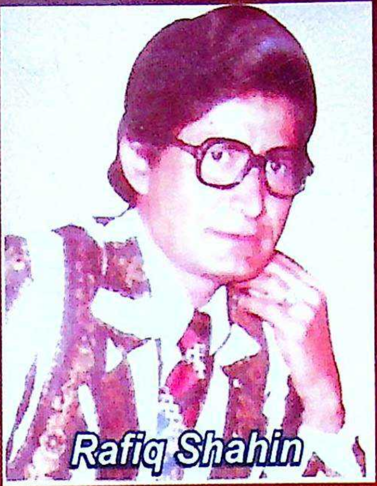
....



رفیق شاہین جس طرح اپنی دیگر نگارشات اور تخلیق کے حوالہ سے ایک خاص پہچان رکھتے ہیں اسی طرح ان کے ترجمہ یہ افسانے بھی ایک خاص شناخت اور انفرادیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ ان افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں کیف و انبساط نرگسیت اور جامعیت کے ساتھ دلکشی، رعنائی، دلفریبیاور جوش موجود ہے۔ اسے رفیق شاہین صاحب کا ایک گراں قدر کارنامہ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح انہوں نے دیگر اصناف ادب میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے اسی طرح ترجمہ نگاری میں بھی وہ اپنا ایک اہم مقار کھتے ہیں اردو افسانوی ادیب ہیں۔ اُن کے قلم سے بہر حال لائق تحسین و قابل ستائش اضافہ ہوا ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر آفاق فاخری

اُردو لیکچرر، اشرفیہ کالج قصبہ ماھل، ضلع اعظم گڑھ



اُردو میں افسانوی ادب کے تراجم کی ایک روایت ملتی ہے۔ جس نے اُردو افسانے کو فنی اور تکنیکی بصیرت سے روشناس کرایا۔ بیسوی صدی میں خاص طور سے ۱۹۳۰ء کے بعد انگریزی۔ فرانسیسی۔ جرمنی اور روسی زبانوں کے افسانوی ادب کا اردو میں ترجمہ کیا جانے لگا۔ عنایت اللہ دہلوی' سجاد ظہیر' مجنوں گورکھپوری' عابد حسین' پروفیسر مجیب' سعادت حسن منٹو جیسے فنکاروں نے دیگر زبانوں سے اردو میں ترجمے کی روایت کو مستحکم کیا اس خوبصورت تسلسل کی ایک کڑی رفیق شاہین کہے جاسکتے ہیں انھوں نے روسی امریکی۔ فرانسیسی و یتنامیز بانوں کے افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا یہ بات بھی سچ ہے کہ ادب انسان اور کائنات کے درمیان رشتوں کا محسوساتی۔ انکشافی اظہار کے ساتھ ساتھ انسانی جبلتوں' خواہشوں اور وجدان کا مظہر ہے۔ دیگر زبانوں میں مذکورہ امور کہاں تک محسوس کیے جاتے ہیں اس بات کا اندازہ صرف ترجمہ کے ذریعہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کے خیالات ونظریات کے تخلیقی نیرنگیوں اور جمالیاتی و اخلاقی اقدار سے متعارف ہونے کا ایک ذریعہ صرف ترجمہ ہی ہے۔ اسی لحاظ سے رفیق شاہین نے مختلف زبانوں کے افسانوں کو اردو میں منتقل کر کے اردو ادب کے قاری کو ایک انمول تحفہ دیا ہے۔

اُن کی یہ کاوش قابل قدر ہی نہیں لائق تحسین بھی ہے۔ رفیق شاہین کی لسانی ادبی قابلیت اس بات سے بھی عیاں ہوجاتی ہے کہ انھوں نے زبان وبیان اور اسلوب کے پیرایے اظہار کو خاص اردو کا لسانی پیکر پہنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اُن کا یہ کارنامہ اردو ادب کا خاص طور سے افسانے کی تاریخی' لسانی اور ادبی طور پر ایک اہم کارنامہ کہا جائے گا۔

پروفیسر حمید اللہ خان

صدر شعبہ اردو

گیان اُپاسک کالج

پربھنی مہاراشٹر

Baironi Mumalik Ke

Shahkar Afsane

by: Rafiq Shahin

Rs. 350/-
$ 15

ISBN : 978-93-84354-12-1

9 789384 354121